

خواجہ ابرار شیراز کے لیے ایک سوویں صدی کا مشترکہ نام

رداء الجمیل

JULY
2012

PDF BOOKS FREE . PIR

ماڈل: مریم
میک اپ: روز بیوٹی پارلر
ڈاننگ: انجم بیگم

مستقل سلسلے

۲۳۵ صالحہ محمود	۲۷ سندیلے	ردائے جنت
۲۳۸ ثریا اقبال	۲۱۸ صدف سعد	ردا کی ڈائری
۲۴۱ شہلا مشائق	۲۲۹ سنگھار	ذرا پھر سے کہنا
۲۲۰ ادارہ	۲۲۵ نورین ملک	خوشبو
	۲۲۲ نورین ملک	اس ماہ میں



گوشہ آگہی صالحہ محمود ۲۶

سلسلے وار ناول

رگ جاں سے جو قریب تھے صالحہ محمود ۳۰
کبھی عشق ہو تو پتہ چلے شازیہ مصطفیٰ عمران ۹۸
اعتبار عشق سباس گل ۱۷۴
سائنس، سڑک اور سکوت نائلہ طارق ۱۵۳

ناولٹ

مات روشنی فاطمہ ۷۸
میری تمنا میرا مقدر عائشہ ذوالفقار ۱۳۲

مکمل ناول

اس دل میں بسے ہو تم انعم خان ۱۹۲
تیری خوشبو نہیں ملتی عابدہ سبین ۵۰
پیار کی گلابی وادیوں ثناء خان صنعاء ۱۰۸

افسانے

وقت گزاری سعدیہ غابد ۹۴
اعتبار محبت ہے وفا کا کشش خان ۱۳۶
محبت کے رنگ فوزیہ خان ۱۶۶
دل کی اک اک دھڑکن نظیر فاطمہ ۱۸۲
کٹھن ہیں راستے عبیرہ عزیز ۲۰۱
سوچا نہ تھا عائشہ الیاس ۲۱۰

جولائی 2012ء

جلد نمبر 17 شمارہ نمبر 7

قیمت 50 روپے

زرد گلاب بذرِ یکر جگستری

600 روپے



34535726

پبلشر وائیٹر صالحہ محمود نے سٹی پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔
مقام اشاعت: ۱۲۹/ڈی بلاک 2- پی-ای-سی-ایچ-سوسائٹی، کراچی

انتباہ:-

ماہ نامہ ”ردا“ ڈائجسٹ میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ٹی وی چینل یا ڈرامہ، ڈرامائی ٹیلی ویژن اور سنیٹ ویل وار کسی بھی ناول کی اشاعت پر ادارہ چوری کی ایف آئی آر درج کر دے گا اس لئے پبلشر سے اجازت لینا ضروری ہے ادارہ ”ردا“ پبلیکیشن۔



زاری کی اور سجدے میں دیر تک روتے رہے یہاں تک کہ حضرت بلالؓ نے نماز فجر کی اطلاع دی۔ میں نے پوچھا، جب اللہ نے آپؐ کے اگلے پچھلے تمام گناہ معاف کر دیئے تو پھر اس اشک باری کا کیا معنی؟ آپؐ نے فرمایا، کیا میں اپنے رب کا شکر گزار بندہ نہ بنوں؟

دین میں آسانی

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا، دین آسان ہے اور کوئی دین کو سخت نہ بنائے گا مگر دین اس پر غالب آ جائے گا، لہذا ٹھیک رہو خوش خبریاں دو اور صبح و شام اندھیری رات کی نمازوں سے مددلو۔ (صحیح بخاری)

نیکی کی دعوت دینے والا

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا، جو ہدایت کی طرف بلائے اسے تمام عمل کرنے والوں کی طرح ثواب ملے گا اور اس کے اپنے ثواب سے کم نہ ہوگا اور جو گم راہی کی طرف بلائے گا تو اس پر تمام پیروی کرنے والے گمراہوں کے برابر گناہ ہوگا اور یہ ان کے گناہوں سے کچھ کم نہ کرے گا۔ (صحیح مسلم)

سوت کے بعد

حضرت انس بن مالکؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا، "میت کے ساتھ تین چیزیں جاتی ہیں۔ دو چیزیں واپس آ جاتی ہیں اور ایک ساتھ رہ جاتی ہے، گمراہ لے مال اور مل ساتھ جاتے ہیں، پھر گمراہ لے مال واپس آ جاتے ہیں اور مل ساتھ رہ جاتا ہے۔" (صحیح مسلم)

نماز کا اہتمام

حضرت عبادہ بن صامتؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا، "پانچ نمازیں اللہ تعالیٰ نے فرض کی ہیں، جو ان کا وضو اچھی طرح کرے اور انہیں ٹھیک وقت پر ادا کرے اور رکوع و خشوع پورا کرے اس کے لئے اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ اسے بخش دے اور جو ایسا نہ کرے تو اس کے لئے اللہ کا وعدہ نہیں، اگر وہ چاہے بخش دے اور اگر چاہے تو اسے عذاب دے۔ (مسند احمد، ابوداؤد)

قرآن کی پیروی

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا، جس نے قرآن کی تعلیم حاصل کی، پھر اس کی اتباع کی، اللہ تعالیٰ اسے دنیا میں گمراہی سے بچائے گا اور قیامت کے دن سخت عذاب سے محفوظ رکھے گا، ایک روایت میں ہے کہ جو قرآن کی پیروی کرے گا، وہ دنیا میں گمراہ اور آخرت میں بد بخت نہ ہوگا، پھر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی کہ جو میری ہدایت کی اتباع کرے وہ نہ گمراہ ہو اور نہ بد نصیب۔

اللہ کی شکر گزاری

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ایک رات حضور اکرم ﷺ نے مجھ سے عبادت کی اجازت طلب کی اور نماز میں مشغول ہو گئے، آپ قیام کی حالت میں اتار دئے کہ آنسو سینہ مبارک تک جا پہنچے پھر رکوع میں گریہ

چلو کوئی اور بات کرتے ہیں، ہم اپنا احوال تم سب کو سناتے ہیں زندگی کی وہی ساعتیں قرب و جوار میں پھیل رہی ہیں وہی شامیں وہی پرانی بات کہ چلچلاتی ہوئی دھوپ میں ہوا کے دوش پر رکھے ہوئے چراغ دل کی منڈیوں پر رکھے ہوئے دیے آس اور امید سے پُر ہر لمحہ دید میں اترنے میں بے قرار ہوا جیسے لیکن قلب کا سکون میسر نہ ہو جسے وہ روح کے خدو خال کیا جانے، محبتوں کے رنگوں میں جب انسان پور پور ڈوب جائے تو فنا زیست ہوتی ہے دے بے قدموں چلتی ہوئی راہوں کی چاہیں جب آواز دیتی ہیں تو تھر کے بنجر صحرا مہکنے لگتے ہیں زندگی کی صبح نوید پھر دے پاؤں اتر آتی ہے ہمارے روز و شب میں وہی آباد گھر وندے بنتے اور مٹتے ہیں بس یوں جان لیجیے کہ یہی زندگی ہے ایک لمحہ ٹھہر جانے کا نام بے قرار چمکتی ہوئی لہروں کا تصادم آنکھوں کے جزیرے ہیں جن میں آباد سبھی لوگ آباد ہوئے ہیں آہستہ آہستہ اترنے والی شام صبح کی دستک دے رہی ہے جولائی کا پرچہ جون میں آپ کے ہاتھوں میں آئے گا لیکن یہ جولائی تک آپ کے ساتھ ساتھ ہوگا میں نے کہا ناں دے بے قدموں کی آہٹیں سنائی دے رہی ہیں کہ چلو آؤ پھر کسی کی آمد منتظر ہے بات سمجھ میں تو آگئی ہوگی کہ ماہ رمضان آنے والا ہے خوشیوں بھرا یہ پیغام امت مسلمہ کے لیے ایک تحفہ خداوندی ہے جو اللہ نے اپنے نیک بندوں کو بخش دیا ہے تو یہ رم جہم کرتی ہوئی پھوار جولائی کے آخر میں اترے گی وہیں کہیں آپ کے ہاتھوں میں آپ کا ردا بھی آپ کے ساتھ ساتھ ہوگا۔

اگست کا شمار بہت خاص عید نمبر ہوگا آپ کی محبتوں، چاہتوں کے سارے رنگ عید نمبر میں شامل ہوں گے اور اس بار بھی بالکل منفرد "ردا ڈائجسٹ" آپ کو ملے گا۔ لہذا قارئین سندیسہ لکھنا مت بھولنے گا ہمیں شدت سے آپ کا انتظار ہے نئے لکھنے والے رابطہ رکھیں ردا آپ سب کا ہے۔

(آپی)

قابل رشک لوگ

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا، تین قسم کے لوگ قیامت کے دن مشک کے ٹیلوں پر ہوں گے، ان پر اگلے پچھلے سب لوگ رشک کریں گے۔ ایک وہ شخص جو دن رات کی پانچ نمازوں کے لئے اذان دیا کرتا تھا۔ دوسرا وہ شخص جس نے لوگوں کی امامت کی اور وہ اس سے راضی رہے۔ تیسرا وہ غلام جو اللہ تعالیٰ کا بھی حق ادا کرے اور اپنے مالک کا بھی حق ادا کرے۔ (جامع ترمذی)

حلال کمائی

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا، لوگوں پر ایک زمانہ ایسا بھی آنے والا ہے جب کوئی شخص بالکل اس امر کا خیال نہیں کرے گا کہ یہ چیز اس کو حلال طریقہ پر ملی ہے یا حرام پر۔ (بخاری)

بڑوسی کا حق

حضور اکرم ﷺ سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا، ”اللہ کی قسم وہ شخص ایمان والا نہیں ہے خدا کی قسم وہ شخص مومن نہیں ہے، آپؐ سے سوال کیا گیا کہ یا رسول اللہ کون؟ آپؐ نے فرمایا، وہ شخص جس کی شرارتوں سے اس کے پڑوسی امن میں نہ ہوں۔

(بخاری)

رشتے داروں سے برتاؤ

”جو شخص چاہے کہ اس کی روزی میں کشادگی اور عمر میں زیادتی ہو تو وہ رشتے داروں کے ساتھ عمدہ سلوک کرے۔ (بخاری)

ناپ تول میں کمی کرنا

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ”بڑی تباہی ہے ناپ تول میں کمی کرنے والوں کے لئے کہ جب لوگوں سے (اپنا حق) ناپ کر لیں تو پورالے لیں اور جب لوگوں کو ناپ کر پاتول کر دیں تو کم کر دیں۔ کیا ان لوگوں کو اس کا یقین نہیں ہے کہ وہ ایک بڑے سخت دن میں زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے جس دن تمام لوگ رب العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے (یعنی اس دن سے ڈرنا چاہئے اور ناپ تول میں کمی سے توبہ کرنی چاہئے)۔ (مطففین)

عیب تلاش کرنا

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا ”اگر تم لوگوں کے عیوب تلاش کرو گے تو ان کو بگاڑ دو گے۔“

(ابوداؤد)

ف: مطلب یہ ہے کہ لوگوں میں عیوب کو تلاش کرنے سے ان میں نفرت، بغض اور بہت سی برائیاں پیدا ہوں گی اور ممکن ہے کہ لوگوں کے عیوب تلاش کرنے سے ان میں پورا ایمان پھیلانے سے وہ لوگ جنت میں گناہوں پر جرات کرنے لگیں۔ یہ ساری باتیں ان تین مزید بگاڑ کا سبب ہوں گی۔ (بذل المجہود)

مسلمانوں کو ستانا

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ ”مسلمانوں کو ستایا نہ کرو، ان کو عار نہ دلایا کرو اور ان کی لغزشوں کو نہ تلاش کیا کرو۔ (ابن حبان)

☆☆☆☆☆

رنگ بھیاں سے جھوٹے رنگ

گھر میں گہرا سناٹا تھا۔ ٹھیکل بھی گھر سے کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ ارسلان نے شادی کی تقریب کئے لئے چھٹی لے رکھی تھی۔ وہ بہت اداس اداس سا گھر میں پھر رہا تھا۔ بڑی گہری خاموشی تھی۔ نا جانے کیوں گھر سائیں سائیں کر رہا تھا۔ ایشل جاب پر گئی ہوئی تھی۔ کلثوم داش روم سے منہ پونچھتی ہوئیں ٹی وی لاؤنج میں اماں کے سامنے چائے کا کپ لے کر بیٹھ گئی تھیں۔

”سچ اماں! ہم نے شکرانے کے نفل پڑھے خیر سے رومی اپنے گھر کی ہوئی اللہ نے ہمیں بچالیا۔ ارسلان کی دیوانگی بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ اماں رخصتی کے وقت میں نے نظر ڈالی ارسلان کہیں دور دور تک نظر نہیں آ رہا تھا۔ کوئی اونچ نیچ ہو جاتی تو میں عادل بھائی کو کیا منہ دکھاتی۔ اب میں سکون سے سو سکوں گی۔ میرے بھی کچھ ارمان اور کچھ خواب ہیں۔ زندگی ایک چھوٹے سے ٹوٹے ہوئے مکان میں گزر گئی۔ بارش آتی تو چھت سے پانی ٹپکنے لگتا۔ یہ کوئی زندگی ہے اماں۔ سامنے والی بتا رہی تھیں کہ زویا کے والد بڑے بڑے کنسٹرکشن کے ٹھیکے لے رہے ہیں آج کل ان کا ٹھیکہ پورٹ قاسم کی طرف چل رہا ہے۔ کہہ رہی تھیں ارسلان کے لئے زویا کو لے آؤ ایک ہی جھٹکے میں بلڈنگ بن جائے گی۔ میں نے تو صاف کہہ دیا کہ فیصلے تو ہمارے گھر میں بزرگ کرتے ہیں کیا خیال ہے اماں؟“

”دیکھو دلہن! تمہاری مرضی ہے تمہارا بیٹا ہے جہاں دل چاہے کرو۔ اگر میری مرضی تم معلوم کرنا چاہتی ہو تو میں خاندان کو ہی ترجیح دیتی ہوں۔ اگر ہم خاندان کی بچیوں کو نہیں پوچھیں گے تو کون پوچھنے آئے گا۔“

”رہنے دیں اماں! کبھی آپ نے بنا سنوار کر ولید ہاؤس ایشل کو نہیں بھیجا رومی ہی نظر آئی تھی حالانکہ رومی ایشل سے چھوٹی ہے اماں۔“ انہوں نے لہجے کو کھینچ کر بولا تھا۔

”جب آئے گی نابڑے گھر کی بیٹی تو تمہاری ہی قدر نہیں کرے گی غریب گھر کی بیٹیاں قدر کرتی ہیں عزت کرتی ہیں بڑوں کا ادب جانتی ہیں۔“

”چھوڑیں اماں! آپ کی سوچ بڑی دقیانوسی ہے۔“

”تو پھر مشورہ مجھ سے کیوں کرتی ہو جو تمہارا دل چاہے وہ کر دو۔“ اماں کو بھی غصہ آ گیا۔

”میں نے بھی دنیا دیکھی ہے۔“ وہ خفا خفا سے لہجے میں بول رہی تھیں۔

”اماں! ہم نے بھی دنیا دیکھی ہے سب اپنا بھلا چاہتے ہیں آج کل تو طریقہ ہی ایسا بدل گیا ہے اب ایشل کو ہی دیکھ لیں کون آ گیا بیابانے کے لئے۔“

”ہاں تو تم اپنے سے اونچے خواب دیکھ رہی ہو غریبوں میں تو تمہیں رشتے نظر نہیں آتے۔ کسی کا اسٹینس نہیں ہے تو

Express
your thoughts
beautifully

Tuned near 99

کسی کے خاندان میں نقص ہے شادی کرتے وقت پہلے صرف دین دیکھتے ہیں اور تم سب سے پہلے دولت دیکھ رہی ہو۔
اماں کا لہجہ اکھڑا اکھڑا تھا۔

”بس اماں! آپ بہتان مت لگائیں مجھ پر ہر انسان کا نصیب اللہ نے لکھا ہے۔ نہ ایشل میں کوئی کمی ہے اور نہ ہی ارسلان میں۔ میں نے ان کو پالا ہے میں تو اس سلسلے میں شکیل کی بھی نہیں سنوں گی۔“ وہ غصے سے بولیں۔

”پہلے کون ساستی ہو تم۔“ اماں نے لے لیے تھے تو وہ تملاکر کپٹچ کر بولی تھیں۔
”اماں! آپ حد کر رہی ہیں، اگر میں اتنی بری ہوں تو آپ عادل کے گھر چلی جائیں۔ سعیدہ سے بھی تو آپ کی رشتے داری ہے تبھی تو سعیدہ بھابی کی بیٹی اتنی پیاری تھی کہ اٹھا کر ولید ہاؤس بھیج دی، مہارانی بن کر راج کرے گی۔“

”اس کا نصیب تھا۔“ اماں بولی تھیں۔

”نصیب نہیں اماں! آپ کی چال! آپ کی چالاکی! ہر نی جیسی شکل پر وہ لوگ مرے اور یہ آپ نے اور خالہ نے مل کر ڈرامہ رچایا ہے اور بڑی معصوم بن بن کر ولید ہاؤس میں رہنے گئیں وہ رانیوں کی طرح شرارہ سنبھالے جا رہی تھی میرے بیٹے کے تو دل پر بجلی گری ہے بجلی۔ وہ تو یہی سمجھ رہا ہے کہ ماں نے زیادتی کر دی اس کے ساتھ۔ جب اس کی قسمت بھی جاگے گی ناں تب پوچھوں گی ارسلان سے اور شکیل سے۔ مجھ سے ٹھیک سے مخاطب نہیں ہوتا ہے ارسلان۔ نظریں نہیں ملاتا ہے بے غیرت انسان، بہن بیٹھی ہے اور شادی کے خواب دیکھ رہا ہے۔“ وہ کپ اٹھا کر بولی تھیں۔

”اب کیا کروں کلثوم! اللہ تمہیں ہدایت دے۔“ ان کے نکلتے ہی اماں نے انہیں ہدایت کی دعا دی تھی۔ تبھی ارسلان اندر آیا تھا اماں کی باتوں سے بے خبر۔

”دادی! ابو سے آپ نے کچھ کہا ہے؟“

”ہاں بیٹے رسم ہے رومی کو لانا پڑے گا۔“ اماں نے ارسلان کو غور سے دیکھا تھا۔

”کیوں دادی! وہ یہاں آئے گی تو ہم لوگ شرمندہ ہو جائیں گے۔“ اس نے اپنی نظریں جھکا لیں۔

”اس میں شرمندگی کی کیا بات ہے نہ تو رسم ہے۔ بیٹی ہمارے گھر سے رخصت ہوئی ہے اسے اسی گھر میں آنا پڑے گا۔“ دادی حتمی انداز میں بولیں تو وہ بولا تھا۔

”کیا یہ ضروری ہے؟“

”ہاں ضروری ہے۔ لے کر آتے ہیں بیٹی کو یوں نہیں چھوڑ دیتے۔“

”لیکن دادی! میں تو لینے نہیں جاؤں گا۔ آپ چھوٹی دادی کو فون کر دیں وہ ڈرائیور کے ساتھ آ جائے گی۔“

”خیر ایسی کوئی بات نہیں ہے تم اتنا کیوں گھبرارہ ہو رومی کے یہاں آنے سے؟“

”دادی! کچھ نہیں ہماری غربت کا مذاق اڑے گا کہ ہم لوگ کیسے ہیں۔“

”نہ تو رومی ایسی ہے اور نہ ہی ولید اور اشمل سے میرا خونی رشتہ ہے اور میں اپنے خون کو پہچانتی ہوں۔ چلو ٹھیک ہے میں تمہاری چھوٹی دادی سے بات کر لوں گی۔“ ارسلان کو لگا اس کی جان چھوٹ گئی۔ وہ دادی کے پاس لیٹ گیا۔

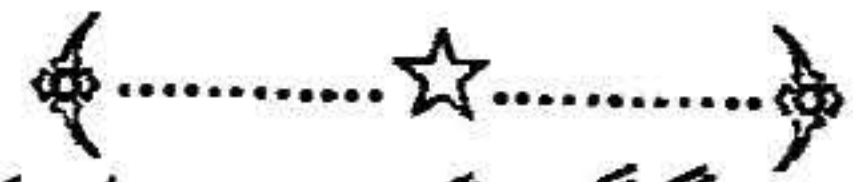
”تم نے بہت خوش اسلوبی سے سارے کام نمٹائے، شکیل نے بھی بہت کیا، ہمیں عادل کی کمی محسوس نہیں ہوئی۔“

”دادی! امی عادل چچا کی مجبوری نہیں سمجھتیں۔ وہاں کے حالات ہی ایسے نہیں تھے کہ وہ یہاں آ جاتے۔ وہ لوگ نہیں جانتے تھے کہ رومی کا سراغ بھی ملے کہ وہ کہاں ہے۔ گاؤں گوٹھوں کے زمیندار بہت خطرناک ہوتے ہیں دادی! بس جو لڑکی پسند آ جائے وہ ان کی ملکیت ہے۔“ وہ پرتاسف لہجے میں بولا۔

”ہر لمحہ عادل مجھ سے رابطے میں رہا ہے بہت خوش ہیں وہ لوگ۔“ دادی روہانسی ہو گئیں تو ارسلان نے دادی کو بانہوں میں لے کر ڈھیروں پیار کیا تھا۔

”دادی! بس آپ امی کی باتوں کا برا نہ مانا کریں۔“

”ارے چھوڑو تم، کلثوم دل کی بری نہیں ہے بس جو دل میں آتا ہے بڑبڑ کر کے چلی جاتی ہے۔ ظاہر ہے اس کی بھی مجبوری ہے حالات ایسے ہو گئے ہیں کوئی کسی کا نہیں رہا۔“ وہ راحت رساں لہجے میں بول رہی تھیں۔ وہ آنکھیں موندے دادی کے تکیے پر سر رکھے رکھے سو گیا تھا۔



زندگی کے سارے ماہ و سال آہستہ آہستہ سہی مگر گزر گئے۔ محبت دل کے صحرا میں آباد ہوتی ہے تو پھول کھلتے ہیں۔ صحرا میں جانے والے آباد ہو جائیں تو محبتیں انہیں ڈھونڈ لیتی ہیں۔ مٹی اور دھول کے اس سفر میں جہاں سب کچھ ہو گیا تھا، خاموشی تھی، زبان نہیں آنکھیں بولتی تھیں، دل دھڑکتے تھے، لمحہ بہ لمحہ زیست کی خاموش گزرگاہوں پر جہاں خس و خاشاک اڑھتی ہے اور جانے والے ابدی نیند سوتے ہیں۔ بڑی تپش تھی دھوپ تھی اس دن سہ پہر کا وقت تھا ماہم نے اماں سے کہا تھا۔

”چلتے ہیں شانزہ سے ملنے۔“ آج اماں کو اس قدر بے چینی ہوئی تھی۔ اماں اور ماہم دونوں چلی تو گئی تھیں۔ تپتی ہوئی دھوپ اور دیرانے میں اپنوں کو ڈھونڈنے کا دشوار راستہ ملے کرنا بھی جانکنی کا عذاب ہے۔ سانس لینا بھی اتنا سہل نہیں ہوتا جب جانے والے مرقدے دیران پر پہنچ جائیں۔

”سورہی ہو بیٹا سوؤ۔“ اماں ٹھہرے ہوئے لہجے میں شانزہ کی قبر پر تھپ کر بولی تھیں۔

صحرا بیابان، تپش سے تپتی ہوئی زمین، محو خواب انسان، چرند پرند بھی بہت خاموش تھے، عجیب عالم تھا تنہائی کا۔ اکا دکا انسان بے قرار، روح کی طرح دھوپ میں بھٹک رہے تھے۔ وہاں صحرا کی تپش اور آگ تھی۔

”یہاں تم کس لئے بار بار آتی ہو یہاں اب کچھ نہیں ہے مت آیا کرو۔“ اماں درد کے میٹھے لہجے میں ماہم کو دیکھتے ہوئے اپنے اطراف میں پھیلی ہوئی قبروں پر نظر ڈالتے ہوئے بولی تھیں۔

چلتے ہوئے سورج کی تپش ایک بالٹی پانی ایک قطرہ آب کی طرح ہے۔ ماہم نے مڑ کر دیکھا۔

”اے راہ سے گزرنے والو فاتحہ مرقد دیران پر بھی پڑھتے جائیں۔“ وہ اماں کا ہاتھ تھامے آگے بڑھ رہی تھی مگر شوخ چنچل سی شانزہ اس دھوپ اور تپش میں ہاتھ تھامے دور بہت دور۔

”ماہم! اگر میں مر جاؤں تو میری قبر پر یہ لکھوا دینا۔“ پرانی قبر کا ٹوٹا ہوا کتبہ جس پر یہ درج تھا۔

”دیکھو دیکھو جھانک کر دیکھو اس قبر کے اندر دیکھو۔۔۔۔۔۔ مٹی گر گئی ہے انسان کا ڈھانچہ نظر آ رہا ہے۔“

”اللہ کا واسطہ ہے شانزہ! مجھے ڈر لگ رہا ہے یہاں سے جلدی بھاگو۔“ ماہم کی رفتار تیز ہوئی تھی۔

”بزدل کہیں کی۔“ وہ قبروں کے درمیان سے دوڑتی ہوئی گزر رہی تھی۔

”ٹھہر دو ماہم ٹھہرو۔“ اسے یوں لگ رہا تھا کہ ابھی وہی آواز بازگشت کر رہی ہے۔ اس نے مڑ کر اماں کو دیکھا تو اماں بول پڑیں۔

”چلو بیٹا چلو..... یہاں اب کچھ نہیں، یہاں مت آیا کرو۔“
”جی اماں!“

سر پر تپتے ہوئے سورج نے اپنی تپش اس کے چہرے نہیں اس کی روح میں اتار دی تھی۔ ضبط امتحان کا ایک لمحہ اسے چھو کر گزر گیا تھا۔ ذہن کے اندر مندر کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ گر بے کا گھنٹنا بھی ٹوٹ گیا تھا مگر اسے کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ بس وہ اماں کا ہاتھ تھامے رکھے کوروک رہی تھی۔

☆.....

چھوٹی دادی نے ولید حیدر کو بتایا تھا۔

”ارسلان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے تم اہمل کے ساتھ رومی کو گھر بھیج دو۔“

”کیوں امی! کیا ضروری ہے کہ رومی کو وہاں بھیجا جائے۔ سچ تو یہ ہے کہ میں ایک لمحے کے لیے بھی رومی کو خود سے دور نہیں کر سکتا۔“ وہ بے توجہ دل میں جل کر بولی تھیں۔

”اللہ خیر کرے..... بہو سے اتنی محبت۔ ہمیں تو رومی رشک آ رہا ہے ولید۔“ یہ کہتے ہوئے شونی سے ان کی آنکھیں اور ہونٹ مسکرا رہے تھے۔ رومی کو بھی اطلاع ہو گئی تھی کہ اسے تھوڑی دیر میں اہمل کے ساتھ تایا کے گھر جانا ہے۔

”کوئی بات نہیں بیٹا تھوڑی دیر کی بات ہے تم باہر سے ڈراپ کر کے آ جانا۔ تمہارے پاپ کی خواہش ہے، میں سب ہینڈل کر لوں گی۔“ انہوں نے ایک نظر رومی پر ڈالی تو وہ نارمل سا سوٹ اینگر میں لئے کھڑی تھی۔

”اب تم یہ پہنو گی، بھی ہمارا اسٹینس ہمارا اسمبل ہے اور غریب لوگ تو یہی زیادہ دیکھتے ہیں دکھاؤ مجھے۔“ انہوں نے الماری کھول کر سوٹ نکال کر رومی کے ہاتھ میں تھما دیا تھا۔

”یہ لو اور یہ اس کے ساتھ جیولری ہے، پہنو ورنہ ولید پوچھ گچھ شروع کر دیں گے اور تم ہمارے گھر کی بہو ہو سبھیں۔“ وہ رومی کو بہت غور سے دیکھتے ہوئے بولی تھیں۔

”تم بہت چپ چپ ہو کیا بات ہے، کیا تایا کے گھر جانے کا دل نہیں چاہ رہا۔“ انہوں نے ایک نظر اہمل کی خواہگاہ پر ڈال کر پوچھا تھا۔ رومی نے ایک نظر اہمل پر ڈالی اور خاموشی سے ڈریل اٹھا کر ڈرینگ روم کے اندر چلی گئی۔

”جاد اہمل! اس کو چھوڑ کر آؤ، میں نہیں چاہتی کہ شروع دن سے تمہارا پاپ ہائے کرنے لگے اور تمہاری دادی بھی کیا کچھ کم ہیں وہ واویلا مچائیں گی اور سارا پلان دھرا کا دھرا رہ جائے گا، اٹھو اہمل۔“ اہمل کسمایا تھا اور اس نے ایک نظر ڈرینگ روم کی طرف ڈالی تھی جہاں سے ابھی تک رومی نکل کر نہیں آئی تھی۔ اہمل، ماں کے ساتھ نکل کر روم سے باہر آیا تھا۔

”مام! اس ازناٹ فیر کہ ہم رومی کے ساتھ کچھ ایسا کریں۔“ تو وہ پلٹ کر بولی تھیں۔

”اوہو تو ہو گئے ایک دن میں حسن کے دیوانے اب تو بھول جاؤ تم ارج کو، میں تو کچھ اور پلان بنا رہی تھی تمہارا۔“

”مام! میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ مجھے ہینڈل کرنے دیں۔ آپ بیچ میں کیوں انوالو ہو رہی ہیں۔ جب آپ اس وقت بول رہی تھیں اس سے تو اس نے ایک نظر مجھ پر ڈالی تھی وہ حقارت کی نظر تھی۔ میں گلٹی کا شس نہ ہو جاؤں۔ ابھی تک تو میں بہت اسٹرونگ ہوں اس کے سامنے اور میں نے اسے بہت کمزور کر دیا ہے لیکن مام پلیز میرے سامنے اسے کچھ مت کہیے۔“ وہ بہت متذبذب سا ہو کر بولا۔

”مرد کی ذات ہوتی ہی ایسی ہے جہاں عورت کو قیمتی لباس میں دیکھا اس کا حسن نکھر کر آیا بس ہو گئے دیوانے۔ ہونہ

آخر تم ولید حیدر کے بیٹے۔“ وہ تمللا کر ماں کی جانب دیکھنے لگا تھا۔

”اف مائی گاڈ! میرا ہی بیٹا۔“ وہ بڑے تعجب سے ہاتھ ملتی ہوئی گزر گئی تھیں۔ اہمل آہستہ سے پلٹ کر اندر آیا تھا۔

اہمل کے سامنے چھم سے رومی کا چہرہ نظر آیا تھا۔ گولڈن بڑے سے اور گولڈن کے دوپٹے اور گولڈن کرتے پر گرین کام کی بوٹیاں تھیں اور بھرے ہوئے گرین کتان کا اڑا پاجامہ، گولڈن اور گرین سچے موتیوں کا جڑاؤ گلوبند گردن پر اور بڑے بڑے گرین جھکے کانوں پر اتنے حسین لگ رہے تھے کہ اہمل کی نگاہوں کی زد میں آیا کہ ضبط کے سارے بندھن پار گیا ہو۔ ہر طرف کرے میں پھولوں کی بہتات تھی وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی تھی۔

”چلیں۔“ رومی کے لہجے میں ایک طنز اور استہزا تھا۔ وہ ایکدم سے سنجیدہ ہو گیا اور گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے باہر کی جانب مڑا تھا۔ وہ بڑی اضطرابی کیفیت میں چلتی ہوئی اہمل کے ساتھ ساتھ لہجے سے کوریڈور میں چلتی ہوئی باہر آئی تھی۔ صبا نے بھی ایک نظر پلٹ کر دیکھا تھا۔

”ماشاء اللہ۔“ ولید نے یہ کہتے ہوئے اپنا چشمہ اتار لیا تھا، ان کے لب مسکرا اٹھے تھے۔

”بہت خوبصورت کپل ہے صبا،“ اہمل کے کندھے پر انہوں نے ہاتھ رکھ دیا تھا۔

”دل تو نہیں چاہ رہا رومی! کہ تمہیں ایک بل کے لئے بھی اوجھل کروں لیکن رسم و رواج میں بھی مزہ ہے۔ جو بات انہوں میں ہے وہ کسی غیر میں نہیں۔ میرا یقین کرو کہ مجھے کتنی خوشی ہے کہ اس گھر میں کوئی غیر نہیں، سعیدہ کی بیٹی آئی ہے۔“ تو صبا نے بہت گہری نظروں سے ولید کو دیکھا اور بولیں۔

”ظاہر ہے سعیدہ کے لئے دل میں ایک مقام ہے۔“ انہوں نے چٹکی کاٹی تھی ولید کے۔

”شٹ اپ۔“ رومی سر جھکائے کھڑی تھی اور اہمل بھی کسی اور دنیا میں ڈوبا کھڑا تھا۔

”چلو جاؤ بیٹا! اللہ حافظ۔ بہت سنبھال کر لے جانا۔ بہت قیمتی چیز لے کر جا رہے ہو اپنے گھر سے۔“

”جی پاپ۔“ اس کے سخت لہجے کی بازگشت رومی کے ارد گرد گھوم رہی تھی۔ وہ بے خودی آگے بڑھتی چلی گئی۔ کھوئے کھوئے انداز میں وہ چلتی ہوئی اہمل کے ساتھ گاڑی تک آئی تھی۔

اسے ساری توانائیاں اپنے اندر بٹھتے جواز بھانے کو روکنے کے لئے صرف کرنا پڑ رہی تھیں۔ گاڑی اشارت کرتے ہوئے اہمل نے ایک نظر براؤن آنکھوں کی طرف دیکھا جس میں گولڈن عکس میں سپیوں کا رنگ بھرا ہوا تھا، پنک ہونٹوں کے گوشوں سے ہلکی ہلکی نمی کا احساس اس کے وجود سے بھینی بھینی پھولوں کی مہک۔ اس نے دوپٹے کا آٹچل سمیٹا تو اس کی کھٹکتی ہوئی چوڑیوں سے مہندی بھرے ہاتھوں پر نظر ٹھہر گئی تھی۔ اسے کبھی مہندی کا رنگ اچھا نہیں لگتا تھا لیکن وہ مہندی سے بھری کلائیوں کو دیکھتے ہوئے چونک گیا۔ پھر گاڑی کی اسپڈ تیز ہوئی تو رومی نے اپنا رخ اپنے چہرے کا حصار بائیں جانب موڑ لیا تھا۔ اہمل کی وقفے وقفے سے اس پر نظر پڑ رہی تھی۔ وہ دوسری طرف پریشان بیٹھی دیکھ رہی تھی۔ بہت مشکوک سی اس کے سامنے گردن جھکائے وہ بے بسی کی تصویر بن گئی۔

گاڑی ایک جھکے سے رُکی تو اہمل نے اس کی جانب دیکھا تھا۔

”جائے تشریف لے جائے۔“ اہمل نے دروازہ کھول دیا تھا۔ وہ اس کی جانب مڑ کر بولی۔

”بیل آپ بجائیں گے آنے والے سے آپ سلام دعا کریں اور آپ بہت پر خلوص انداز میں خدا حافظ کہہ کر چلے جائیں۔“ تو اہمل نے اپنا چہرہ دوسری جانب پھیر لیا تھا اور پھر پلٹ کر بولا۔

”اور اگر ایسا نہ کروں تو.....“

”تو شاید میرا تعاون بھی آپ کے ساتھ نہیں ہوگا۔“ اس نے بھی اپنا رخ دوسری جانب پھیر لیا تھا۔
”تم کیا سمجھتی ہو خود کو؟“ اس نے غصے سے اس کا چہرہ اپنے سامنے کر لیا تھا۔ اس کے ہونٹوں سے بے ساختہ ہلکی سی سسکی نکلی تھی وہ سہم گئی رومی کو ایک جھٹکا لگا تھا۔

”بی بیو یور سیلف۔“ وہ اس کے اس انداز پر سلگ گئی تھی۔

”اوائی سی..... تو تمہیں احتجاج بھی کرنا آتا ہے میں تو سمجھا تھا کہ تم ہر قلم سہہ کر بھی مجھے حاصل کرنا چاہو گی۔“ اس کے ہونٹوں پر طنز اتر آیا۔

”آپ کو خوش فہمی کچھ زیادہ ہے۔“ تو اشمیل نے ایک گہرا سانس لے کر اس کے وجود پر ایک نظر ڈالی۔ اس کے کمرنگ بال شفاف ماتھے پر اتر آئے تھے۔ اس نے بہت گہری نظروں سے رومی کی آنکھوں میں جھانکا اور بمشکل ضبط کر کے بولا تھا تو وہ جلدی سے دوپٹہ سنبھالتی ہوئی کار سے باہر آئی تھی۔ اشمیل پلٹ کر اس کی جانب آیا۔ اس کے سر پر ایک نظر ڈالی تو اسے یوں لگا کہ ایک نور کے بالے میں رومی پر یوں کی شہزادی جس کا برسوں اس نے پیچھا کیا تھا خوابوں میں وہ سامنے کھڑی ہے۔ اشمیل کی گرے آنکھیں ڈپل پرنگ گئی تھیں جو آج نظر نہیں آئے تھے۔

”آپ اس طرح سے مجھے کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں کر سکتے مسٹر اشمیل ولید۔“

”اومانی گاڈ..... پھر یہ لڑکی دل کی رسائی تک پہنچ گئی۔“ اس نے ضبط کر کے رخ پھیر لیا۔

”مجھے کوئی خوش فہمی نہیں ہے۔“ وہ اشمیل کو پھر ہرٹ کر گئی تھی۔

اس نے بھی گہری سانس لے کر رخ پھیر کر رومی کی طرف پلٹ کر دیکھا تھا۔ طوفان کی سرد ہوائیں دونوں کے دلوں کو چھیڑ رہی تھیں۔

”رومی۔“ وہ چونک گئی۔

”چلو ہم مان بھی لیتے ہیں تمہارے اندر کچھ سچائیاں موجود ہیں مگر میں حقیقت سے دامن نہیں بچا سکتا۔“ اس کا لہجہ سنجیدہ سا تھا۔

”ہمارے چاہنے کے باوجود بھی کبھی کبھی دامن الجھ جاتے ہیں۔ بے بسی اسی کا نام ہے کہ جب ارادے ٹوٹ جاتے ہیں۔“ وہ گہری جوت کر گئی تھی اور اشمیل کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ تو اس نے بڑھ کر نیل پر ہاتھ رکھ دیا۔ اندر سے ارسلان ہی نکلا تھا۔ تلکے سے شلواری قمیص میں سرخ سرخ آنکھیں نمایاں ہو رہی تھیں۔ اس نے اشمیل پر ایک نظر ڈالی اور دروازے کے پٹ کھول دیئے تھے۔

”نو ٹھینکس میں ذرا جلدی میں ہوں میں رومی کو ڈراپ کرنے آیا تھا۔“ اس نے بہت گہری نظروں سے رومی کے سپاٹ چہرے کی طرف دیکھا تو وہ ارسلان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

اشمیل کی نظریں پلٹ کر ارسلان کی طرف گئیں تو وہ گھبرا کر بولا تھا۔

”آئیں آئیں آپ اندر تو آئیے۔“

”پھر کبھی۔“ وہ ایک نظر رومی پر ڈالتا ہوا پلٹ گیا تھا۔

”اس قدر اداس چہرہ ہے اس شخص کا اور رومی اس گھر سے گئی ہے۔“ وہ گاڑی کو ریورس کرتے ہوئے سوچ رہا تھا۔

”محبت کسی اور کی اور شادی اس نے مجھ سے کی۔“ مام ٹھیک کہتی ہیں غریب دولت مند لوگوں سے بہت جلد قریب آ جاتے ہیں۔ اگر یہ سچ ہے تو آج رومی کو میرے دل کی خبر کیسے ہو گئی کہ باوجود تلخ احساس کے میرے دل میں وہ اتری ہوئی

ہے کیا حسن یا اس کی محبت۔“ وہ گہری سوچ میں پڑ گیا۔

”کیا سچ ہے کیا غلط یہ سب کیسے ہو گیا کیا میری کسی کمزوری سے رومی نے یہ اندازہ کر لیا کہ میں اسے پسند کرتا ہوں میں نے کبھی اس نظر سے اسے نہیں دیکھا۔ آج وہ بے حد خوبصورت لگ رہی تھی لیکن میں اس سے کچھ نہ کہہ سکا کہ کہیں اسے پھر کوئی مشکل نہ ہو جائے لیکن وہ کیسے جان گئی کہ میں اس کی تعریف نہیں کر رہا ہوں مگر وہ مجھے اچھی لگ رہی ہے میری آنکھوں سے تو جیسے چنگاریاں نکل رہی ہیں۔ دل بھی دکھ سے ڈوب رہا ہے کہ ایک ایسی لڑکی جو ہنستی مسکراتی صرف ولید باؤس میں میری دوست بن کر لی اور وہ پھر میری جیون ساتھی بن گئی۔ میں تو مجبور تھا اس نے احتجاج کیوں نہ کیا۔“ کار کی رفتار اس نے اور بڑھا دی تھی۔

ارسلان نے جلدی سے رومی کو اندر آنے کا راستہ دیا تھا۔ پہلے ہارن اور گھنٹی کی آواز نے کلثوم کو بیدار کر دیا تھا کہ یہ رومی ہے۔ وہ جلدی سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

”اب آئی ہے اپنی دولت کا رعب مارنے اتر رہی ہو گی اشمیل کی امارت پر۔“ ارسلان دادی کو بتا کر جلدی سے جانے لگا تو سامنے رومی سے ٹکرا گیا تھا۔

”ارسلان! اس میں میرا کیا قصور ہے۔“ تو ارسلان کے وہیں قدم تھم سے گئے تھے۔ رومی نے بجھے بجھے چہرے اور سرخ آنکھوں کو بہت غور سے دیکھا تھا۔

”میں نے تم سے کوئی شکوہ تو نہیں کیا شکوہ مجھے ضرور اپنی زندگی سے ہے۔“

”نہیں ارسلان! فیصلے اوپر ہو گئے تھے یہ دکھ اور ملال سب کچھ ہمارے نصیب کے حصے ہیں ان کو اپنے اوپر طاری مت کرو۔ اس گھر کی ذمہ داری تم پر ہے۔“ بہت تیزی سے وہ دادی کے کمرے کی طرف بڑھی تو ارسلان نے ایک نظر اس پر ڈالی اور گزر گیا تھا۔

دادی نے بڑی خوشی سے اس کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔ تایا ابانے سر پر ہاتھ رکھا تو آنکھیں جھم جھم برسنے لگیں۔

”ارے ارے.....“ تایا ابانے دکھ سے بھگی ہوئی آنکھوں کو تڑپ کر دیکھا تھا۔ کلثوم سے پھر رہا نہیں گیا تو وہ کمرے سے اٹھ کر باہر آ گئی تھیں۔

”اچھا رومی آئی ہے۔“ وہ انجان بن کر بولیں۔

”ہم نے کہا چلو ہم بھی ولید باؤس کا رکھ رکھاؤ تو دیکھیں دولت مند لوگوں کا انتخاب ہے۔“ تو رومی نے آنسو پونچھ کر کلثوم کی جانب دیکھا تھا۔

”لگ تو بہت اچھی رہی ہو رومی! لیکن امیر لوگ غریبوں کی قدر نہیں کرتے حسن و ذہانت کو یہ لوگ خرید لیتے ہیں بالکل تمہارے حماد فاروقی جنہیں دولت نے خرید لیا۔ تمہیں ٹھکرا دیا گیا جیسے تمہارے حسن کو دیکھ کر اشمیل دیوانہ ہو گیا لیکن ایسے رشتوں کی قدر نہیں ہوتی۔“ وہ طنزیہ بولیں۔

”آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں مائی اماں۔“ اس کے ہونٹوں سے سسکی نکلی تھی اس نے آرزوہ نظروں سے انہیں دیکھا تھا۔

”ہم نے بھی ایسا ہی ڈریس کسی بوتیک پر دیکھا ہے اگلے ماہ ارسلان کی دلہن کے لئے لے کر رکھوں گی۔ سوچتی ہوں بری کے جوڑے ابھی سے جمع کر لوں ورنہ وقت پر بڑی مشکل ہوتی ہے۔“ بھابی بتا رہی تھیں کئی بار زویا کی ای پوچھ چکی ہیں کہ ایشل کا رشتہ کب ہو رہا ہے۔ وہ بڑی گہری نظروں سے رومی کا جائزہ لے رہی تھیں۔



وقت کی رفتار ہر شخص کو بدل دیتی ہے دکھوں کا ایک باب جو رقم تو ہوا تھا مگر وقت نے اس پر مرہم سارکھ دیا۔ ماحول میں ایک نئی تبدیلی آگئی۔ اچانک حماد نے انکشاف کیا تھا کہ ان کا امیگریشن آگیا ہے۔ وہ بے حد ذہین اور انجینئرنگ انسان تھے۔ کبھی ہاتھ سے لکھی ہوئی اپیلی کیشن کو امریکن ایمپلیس میں ڈال آئے تھے۔

”دیکھتے ہیں سنا ہے امریکا انٹیلی جنٹ لوگوں کو پک کر لیتا ہے چلو آ زما لیتے ہیں۔“ اس آزمائش کا سفر ختم ہوا جب وہ کسی دوسرے کے کام سے ایمپلیس گئے تو پتہ چلا کہ صرف ایک ہفتے میں گرین کارڈ کا ویزا ختم ہو جائے گا۔

اماں اداس تھیں۔ ماہم صرف اس لئے اداس تھی کہ اس کی ماں اداس ہے۔

”تم اس قدر سو گوار چہرہ بنائے کیوں گھوم رہی ہو؟“ ثروت باجی نے پوچھا تھا۔

”پتہ نہیں ان کو کیا ہوا ہے اماں کے ساتھ یہ بھی رو رہی ہیں بیٹھے۔“ حماد نے غصے کی ایک نظر ڈالی تھی۔

”جی نہیں میں آپ کے لئے نہیں رو رہی۔“ ماہم نے ایک نظر اپنی ماں کے چہرے پر ڈالی اور چھپاگ سے ماں کے سامنے سے ہٹ گئی تھی۔ حماد ماہم کی بات کا مطلب سمجھ گئے تھے۔ انہوں نے اماں کی طرف ایک گہری نظر ڈالی اور بولے۔

”پھاڑ دیتا ہوں پاسپورٹ نہیں جاؤں گا۔“ بس اسی لمحے اماں نے اپنے آنسو پونچھ لیے تھے۔

عصمت کی ہنستی ہوئی آنکھیں ماہم کی روح پر انگارے برسا رہی تھیں۔ کہانی ختم ہونا چاہتی تھی کہ حماد عازم سفر ہو گئے۔ عصمت اپنا سامان باندھ کر بغیر بتائے ہوئے اپنے گھر چلی گئی تھیں۔ پھر ایک دو ہفتے کے بعد ہی اچانک ٹرک اور مزدور لے کر آئی تھیں۔ ایک ایک سامان اٹھوا کر انہوں نے گاڑی میں رکھوایا تھا۔

حماد کی الماری میں سے سارے کپڑے جوتے پھٹی پرانی چیزیں گھڑیوں میں بندھوا کر بھجوا دی تھیں۔ ایک ایسا بھی نشان اس کمرے میں نہیں تھا کہ لگے حماد اس کمرے میں رہتے تھے۔

پھر بڑی ہنستی ہوئی عصمت اندر آئی تھیں۔

”اچھا میں جا رہی ہوں دو ماہ میں ہمارے بھی پیپر آ جائیں گے ہم چلے جائیں گے اللہ حافظ۔“ اپنا بیگ لٹکائے بیٹھ بیٹھ وہ باہر نکل گئی تھیں۔ محلے والوں کو بھی خبر ہو گئی تھی کہ عصمت اپنا سامان لے کر چلی گئیں۔

اماں بے قرار سی پلٹ کر حماد کے کمرے میں آئی تھیں۔ کمرہ خالی پڑا تھا۔ اماں نے گھبرا کر دیوار میں لگی ہوئی الماری کو کھولا تھا۔ ایک ایک پرانی چیز بھی وہاں سے غائب تھی۔ اماں وہیں زمین پر گر کر بیٹھ گئی تھیں۔ آنسو تھے کہ بہہ رہے تھے حالانکہ پرانے کپڑے اور سلپر لے جانے کی اسے کیا ضرورت تھی بس اسے ایک تکلیف تھی کہ حماد کا یہاں سے نام و نشان مٹا دیں۔

ماہم نے سنا تھا کہ اماں بہت بے قرار ہو کر روئی تھیں۔ پڑوس سے باجی سعیدہ بھاگ کر آ گئی تھیں۔ اماں الماریوں میں ہاتھ پھیر پھیر کر رو رہی تھیں۔ کوئی ایک نشان بھی نہیں تھا۔ پھر خود ہی وہ آ کر بتا گئی تھیں۔

”ہم نے سارے کپڑے حماد کے دھوبی کو دے دیئے۔ میں کیا کرتی پرانے کپڑوں کا۔“ انہوں نے مسکرا کر اماں کی جانب دیکھا تھا۔

صرف اور صرف وہ اماں کو تکلیف دینا چاہتی تھیں۔ ان کی محبت اور خاموشی کو وہ چالاکی کا نام دیتی تھیں وہ اس محبت کا مذاق اڑاتی تھیں جو اماں کے دل میں تھی۔

ماہم ایک بار ان سے ملنے کاظمی کے گھر گئی تھی تو اس نے آ کر بتایا تھا۔

”بس یہی بات تو کٹھن ہے وہن! کہ وہ ایشل کو کیوں پوچھتی ہیں کیا مطلب ہے ان کا۔ وہ ایشل کی ذمہ داری سے بھاگ رہے ہیں وہ اپنی بیٹی کے لئے اکلوتا رشتہ ڈھونڈ رہے ہیں۔“

”ارے نہیں اماں! وہ کھاتے پیتے گھرانے کے لوگ ہیں۔ وہ سوچ رہے ہوں گے کہ ہمارے حالات ایسے نہیں ہیں کہ ہم لڑکے اور لڑکی کی الگ الگ شادی کریں۔ سوچتے ہوں گے کہ ایشل کی کہیں بات ہو جائے تو پھر وہ زویا کی بات نکالیں گے کئی بار میری بھابی بات نکال چکی ہیں۔“

”چلو ٹھیک ہے تمہاری مرضی اور رومی بیٹے!“ دادی نے تکیہ ہٹا کر جگہ بنائی تھی۔

”تم کتنی نصیبوں والی ہو کہ تمہیں میری بہن کا گھر ملا اور تم اُسے ملیں۔“ دادی محبت سے بولیں۔

”ظاہر ہے اماں! سعیدہ کی بیٹی کا انتخاب تو ہونا ہی تھا۔ محبت ایک بار ہو جائے نا اور کہتے ہیں ناکہ لڑکی خود چھوڑ کر چلی جائے تو لڑکا تمام عمر اسی لڑکی کے حصار میں رہتا ہے۔“ رومی یہ سن کر اندر سے مری گئی تھی۔

”تم بھی گڑے مروے اکھاڑ رہی ہو اس وقت۔ رشتے نا طے تو ہوتے رہتے ہیں۔ ہر وقت سعیدہ کا تم نام لیتی ہو بس کلثوم۔“ دادی برامان گئی تھیں اور رومی کا بھی دل تابی کے جملے سے دکھ سا گیا تھا۔

”ایسا کیا تھا امی اور ولید ماموں کے درمیان کے لوگ ابھی تک نہیں بھولے؟ کیا اتنی شدید محبت تھی دونوں کے درمیان تو پھر فاصلہ کیسے آ گیا دونوں کے درمیان۔“ اس کا ذہن سوچتے ہوئے تھک رہا تھا۔ دادی اس کے سنہرے اور کلرنگ بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھیں۔ وہ ان کے وجود سے لپٹی ہوئی اپنی بے بسی پر آنسو بہا رہی تھی۔

”کتنی نفرت تھی ایشل کی آنکھوں میں پہلی رات۔ میں اس کی نظروں میں گر گئی۔ مجھے تو اس کی باڈی لینگوئج سے پتہ چلتا تھا کہ وہ مجھے بہت چاہتا ہے میری اور اس کی عادات میں کتنی ہم آہنگی تھی لیکن ارج کی محبت نے ہماری کیمسٹری کو غلط فہمی میں بدل ڈالا۔ میں اپنی نظروں میں گر چکی ہوں کہاں جاؤں گی یہ سنہرے گولڈن گہنے پہن کر؟ کیسے مٹ گئے میرے خواب میں تو کسی سراب کے پیچھے بھی نہیں بھاگی ایسا کیا گناہ ہے میرا کسی دل میں میرے لئے جگہ نہیں۔“ مہندی بھرے ہاتھوں سے وہ چہرے کو رگڑ رگڑ کر پونچھ رہی تھی۔

”امی یاد آ رہی ہیں؟“ دادی نے اس کے بالوں کو کان کے پیچھے سمیٹا تھا۔ سراس نے ہلایا تھا۔ روتے روتے اس کی ناک لال ہو گئی تھی۔ وہ اٹھ کر آئینے میں اپنے آنسوؤں سے بھیگا ہوا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

”ایشل! تم نے سب کچھ میرا چر لیا۔ میں کیسے ایک پل میں خاک ہو گئی۔ میرے ہونٹوں کی ہنسی تم نے چھین لی۔ تم نے میری ہر محبت کو مجھ سے چھین لیا۔ میں ایک بار بھی تمہارے ساتھ ایک قدم بھی نہ چل سکوں گی۔ ایسا کیسے مجھے دھوکا ہو گیا کہ تم میرے ہو؟“ اس نے آنسوؤں سے نبجے نبجے چہرے کو دیکھا جس میں گرین گولڈن جھکے پھوٹ کر نکل رہے تھے۔

کلرنگ بالوں کی چھوٹی چھوٹی لٹیں بکھر گئی تھیں۔ آئینے میں اپنا عکس اسے اجنبی لگ رہا تھا۔

ایشل نے آ کر سرگوشی کی ہو جیسے چپکے سے آ کر کہہ دیا ہو۔

”سب کچھ تمہارا ہے صرف میرے علاوہ۔“ وہ سسک پڑی۔

”کیا کہوں کس سے کہوں؟ یہ سب کیا ہو گیا۔ سچ کہتی ہیں تائی اماں کہ امیر غریبوں سے محبت نہیں کرتے تجارت کرتے ہیں۔ شاید میں بھی کسی تاجر کی جھولی میں قید کر دی گئی ہوں۔“ وہ دکھ اور بے بسی سے رو پڑی۔

”اماں! بھائی کی الماری یا تھر روم میں رکھی تھی کہ وہاں رکھنے کی جگہ نہیں تھی مگر ایک ضد تھی کہ اس گھر کو اجاڑ کر جاؤں گی اور قدرت بھی ان پر کتنی مہربان تھی کہ ان کے جگر گوشے کو کوئی یوں اڑا کر لے گیا۔“

کون کسی کے لئے رکتا ہے مرنے والوں کا بھی صبر آ جاتا ہے۔ اماں نے پھر ایک محبت کا جواز ڈھونڈ لیا تھا۔

”چلو اچھا ہوا وہ یہاں ہر وقت لڑتی جھگڑتی رہتی تھی کم از کم میرا بھائی تو سکون سے رہے گا۔“ ماہم نے ایک گہرا سانس لیا تھا۔

”تمہیں تو کسی حال میں چین نہیں ہے۔ تمہاری بہت بری عادت ہے ہر ایک کے لئے غلط سوچتی ہو مت سوچو بیٹا! ہم نے کبھی کسی کے لئے برا نہیں سوچا۔“ اماں راحت رساں لہجے میں بولیں دکھ انہیں بھی تھا مگر وہ کہہ کر ماہم کو دکھی نہیں کرنا چاہتی تھیں۔

”اماں! عادت والے کی عادت نہیں بدلتی۔ مجھے تو یوں لگ رہا ہے کہ وہ جاتے وقت کہہ گئی تھیں کہ دیکھو میں جیت گئی! اب تمہاری ماں حماد کے لئے روتی رہے گی وہ اپنی فتح پر آخری بار ہنس ہنس کر سب سے مل کر گئی تھیں۔“ اماں کی یادوں میں پتہ نہیں کب تک ان کی یاد آتی وہ اکثر حماد کا ہی ذکر کرتیں۔

”خط نہیں آیا بہت دن ہو گئے ماہم! تم ایک خط لکھ دو۔“ وہ آس سے کہتیں۔

”ہاں اماں! میں لکھ دوں گی ایک خط۔“ اماں گھنٹوں بیٹھ کر ماہم سے خط لکھواتیں۔

”اب تم اسے دوبارہ اتار دینا کر کے۔“ ماہم نے دونوں کاغذ اماں کے سامنے پھیلا دیئے تھے۔

”یہ دیکھیں کہیں پر داغ دھبہ نظر آ رہا ہے؟“

”واقعی..... کل لفافہ ڈاک خانے سے منگوادوں گی تم اس پر ٹکٹ لگا دینا۔“

”یہ رہا لفافہ یہ رہے ٹکٹ۔“ ماہم کے فولڈر میں ہر چیز موجود تھی۔

اماں نے بڑی نفیست سے خود اپنے ہاتھوں سے خط کو رکھا تھا۔ یوں جیسے اپنا دل رکھ رہی ہوں۔ اماں کے جتنے خطوط حماد کو جاتے وہ ماہم ہی لکھتی کچھ لفظوں کا ہیر پھیر وہ خود کر دیتی تھی۔

بس ایک محبتوں کا سفر تھا جو اماں اور حماد کے درمیان جاری رہا۔ گھر میں ایک گہرا سناٹا تھا۔ ایک ایک کر کے سب لوگ اپنی اپنی منزلوں کو چلے گئے تھے۔ انعم اور اماں اکیلی تھیں اور زویہ بھابی اپنی فیملی کے ساتھ۔

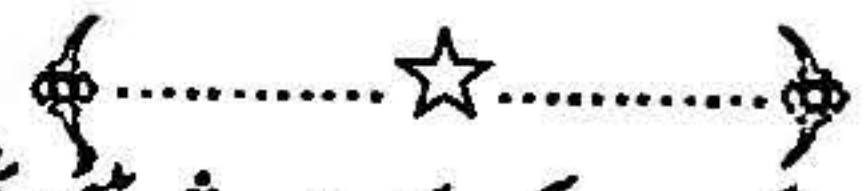
انعم صبح اٹھ کر جاب پر چلی جاتی اور اماں سارا دن گھر پر اکیلی بیٹھی ہوتیں۔ اماں سارا دن ماہم کا انتظار کرتیں۔ ذرا سی دیر ہو جائے ویک اینڈ پر تو اماں گیٹ پر نکل آتی تھیں۔

”ارے اماں! آپ اتنی دھوپ میں کھڑی ہیں۔“

”تمہارا انتظار کر رہی تھی کہ ماہم وکٹوریانے کیوں دیر کر دی۔“ اماں بڑا سا گیٹ تھا مے کھڑی ہوتی تھیں۔

اتنا گہرا سناٹا تھا جب ماہم بھری دوپہر میں اماں کے گھر آئی تھی یوں لگتا تھا کہ چرند پرند بھی سو گئے۔

اماں نے حماد اور عماد کی بچپن کی تصویریں اپنے بیڈ کے سر ہانے رکھی ہوئی تھیں۔ وہ قافلے محبتوں کے وہ رت جگے ساری بہنوں کے ختم ہو گئے تھے۔ سب تتلیاں اڑ گئی تھیں کنج گلاب سے۔ صحن میں لگے ہوئے پودے سب خالی خالی تھے۔ اماں موتیا کے پھول گجرے بنا کر باجی سعیدہ کے گھر بھیج دیتی تھیں ویک اینڈ پر ماہم کو دے دیتی تھیں جو ماہم کا مقدر تھے۔ وہ ان گجروں کو بار بار چومتی تھی کہ میری ماں نے اپنے ہاتھوں سے کوندے ہیں۔ احساس کو لفظوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اماں کے ہاتھوں کا لمس، اماں کی انگلیوں کے پوروں میں لگی ہوئی مہندی کی خوشبو پھولوں کی ڈنڈیوں میں محسوس ہوتی۔ پورے ہفتے ماہم ان پھولوں کو اپنے سر ال میں بیچ بیچ کر رکھتی۔



”رومی! تم شام کو آ رہی ہونا۔“ وہ اپنا بیگ تیار کر کے خاموش بیٹھی تھی۔ ابھی ابھی ارسلان اسے غور سے دیکھتے ہوئے گزر گیا تھا۔

اشمل نے مسج کیا تھا کہ وہ تھوڑی دیر میں لینے آ رہا ہے۔ وہ بیگ اٹھا کر تیار کھڑی تھی۔ پھر وہ نظریں جھکا کر بوجھل قدموں سے چلتی ہوئی باہر آئی تھی۔ اشمل کا پھر مسج آیا کہ باہر آ جاؤ۔

جب وہ باہر نکلی تو اشمل گاڑی سے ٹیک لگائے دروازہ کھولے کھڑا تھا۔ اشمل نے بڑی گہری نظروں سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا اس کی نظریں خود بھی جھکی ہوئی تھیں۔

وہ چلتی ہوئی آئی تو وہ جلدی سے گاڑی میں بیٹھ گیا تھا۔ جونہی وہ بیٹھی اشمل مڑ کر اس کی جانب بولا تھا۔

”میں سیدھے تمہیں بیوٹی پارلر ڈراپ کرنے جا رہا ہوں، ماہم بھی وہیں ہیں تمہارا اپائنمنٹ ہے۔ دادی نے کہا ہے کہ میں تمہیں بتا دوں۔“ اس نے نظر اٹھا کر اشمل کی جانب دیکھا تھا۔

”آپ ڈرائیور کو بھیج دیتے ہیں آ جاتی۔“

”نہیں جناب! میں آپ کا شوہر ہوں۔ پاپ کا حکم تھا کہ میں آپ کو لینے آؤں۔“ وہ دانستہ پیتا ہوا بابا ہر دیکھ رہا تھا۔

”میری اپنی زندگی ہے لیکن میں جی کسی اور کی مرضی سے رہا ہوں۔“ اس نے بڑی گہری نظروں سے اشمل کے چہرے کا جائزہ لیا تھا۔

”یہ سزا آپ خود کاٹ رہے ہیں۔“ وہ تلخی سے بولی۔

”آپ کی محبتوں کا بہت زیادہ تعاون تھا شاید اس لیے۔“ وہ طنز کر گیا۔

”میں نے کبھی کسی سے تعاون نہیں کیا اور نہ ہی میں محبت کا دعویٰ کرتی ہوں۔“ وہ بہت نرم لہجے میں بول رہی تھی۔

”محبت شور مچا کر نہیں کی جاتی، محبت کا احساس جگایا جاتا ہے۔“ وہ بے رخی دکھا رہا تھا۔

”میں نے کبھی ایسا نہیں کیا۔“ وہ دود بولی۔

”پھر میں کیسے تمہارے اتنے قریب آ گیا نا چاہتے ہوئے بھی اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں ارج سے محبت کرتا ہوں۔“

”محبت کسی سے بھی کی جاسکتی ہے۔“ وہ مسکرائی۔

”لیکن میں نے کبھی تم سے محبت نہیں کی۔“ وہ رخ پھیر گیا۔

”اشمل ولید! آپ خواخوہ میری تذلیل کیے جا رہے ہیں۔ میں بے سہارا ضرور ہوں لیکن بدنیت نہیں۔ میں شروع سے جانتی تھی کہ آپ کی زندگی میں ارج شامل ہے نہ میں نے کل اور نہ ہی آج ایسا سوچا تھا۔“ وہ پھر گئی۔

”پھر یہ سب اچانک کیسے ہو گیا۔“ ماہم اور پاپ کے ذہن میں کیسے آ گیا؟ وہ سوالیہ ہوا۔

”کسی بھی خوبصورت چیز کو خریدنے کے لئے وقت کا تعین کرتے ہیں، بس قیمت لگانے کی دیر ہوتی ہے اشمل ولید صاحب۔“ وہ طنز اور دکھ سے بولی کہ اسے خود اپنی حیثیت کا اندازہ اب ہونے لگا تھا کہ کیسے اسے اپنے مفاد کے لئے استعمال کیا تھا صبا بیگم نے۔

”گویا آپ نے اپنے حسن کی قیمت لی ہے۔“ اس نے مڑ کر بہت غور سے دیکھا تھا واقعی وہ بہت خوبصورت لگ رہی تھی، اشمل ولید نے گھبرا کر اپنا چہرہ پھیر لیا تھا۔

”آئینہ سچ بولتا ہے یہ میں نہیں کہتی یہ آپ سب کی سوچ ہے۔ آپ جس سوسائٹی میں رہتے ہیں وہاں تو یہ خرید اور

فروخت ہوتی رہتی ہے۔ وہ دکھ سے بولی۔

”میری زندگی میں تو حسن کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ ارج تو ایک معمولی صورت شکل کی لڑکی ہے اسارٹ اور گریس فل ہمارے انڈرا سٹینڈنگ ہے کئی مہینے تو اس بات پر ہم ڈسکس کرتے رہے کہ ہمیں ایک دوسرے کو قبول کرنا بھی چاہیے یا نہیں۔“ اشمیل الجھ کر بول رہا تھا کہ وہ اپنی فیملنگ خود سمجھنے سے قاصر تھا۔

”لیکن میں جس سوسائٹی میں رہتی ہوں وہاں والدین پر پوزل دیتے ہیں مائیں قبول کرتی ہیں۔ ہماری سوچ کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ ہم صرف آنکھ بند کر کے یوں سمجھ لیں کہ انگوٹھا چھاپ ہیں ہماری تقدیر کے فیصلے ہمارے بزرگ کرتے ہیں۔“ اس کے لہجے میں ایک فخر اور مان تھا اپنے بڑوں کے لئے۔

”اچھا میں نے آپ کو باہوش دحواس سب کی رضا مندی سے قبول کیا ہے اور اگر یہ چوائس آپ کو دی جاتی تو پھر؟“

گرے آنکھیں پوری کی پوری کھل گئی تھیں چہرے پر سختی اور تھوڑا تھوڑا غصہ بھی جھلک رہا تھا۔

”ظاہر ہے میں بھی اپنے لئے بیسٹ اپر چیونٹی کو اویل کرتی۔ ہر شخص یہی کرتا ہے اشمیل! اگر میں ایسی نہ ہوتی تو شاید ولید حیدر اور ممائی بھی مجھے ایکسپٹ نہیں کرتے یہ ایک حقیقت ہے۔“ اس نے بہت آہستہ سے اپنا رخ اشمیل کی طرف کیا تو اشمیل اسی کی جانب دیکھ رہا تھا۔

”یعنی آپ اتنی خوبصورت ہیں کہ کوئی شخص بھی آپ کو دیکھ کر آپ کی قیمت لگا سکتا ہے۔“ وہ استہزائیہ لہجے میں بولا۔

”یہ قیمت لگنے پر ڈیپنڈ کرتا ہے۔“ وہ سر جھکا کر بولی۔

”اور اگر میں تمہاری قیمت پوری کی پوری چکا دوں تو..... تو کیا تم باہوش دحواس اپنی مرضی سے ارج اور ہماری زندگی سے نکل جانے کا سوچ سکتی ہو؟“

”یہ سوال بہت مشکل ہے۔ میں جس معاشرے میں رہتی ہوں میں جس خاندان سے لی لوگ کرتی ہوں وہاں لڑکی کو یہ اختیار نہیں دیا گیا۔ اس کی سوچ اس کے اختیارات لے لئے جاتے ہیں اور یہ اس کی گھٹی کی تاثیر ہوتی ہے کہ ہماری زندگی کے فیصلے ہمارے بزرگ کریں گے اور ہم بے اختیار ان کے فیصلوں پر سر جھکا دیں گے۔“ وہ متاسف سی بولی۔

”میں اس بات کو جانتا ہوں۔ میں نے ارج سے کہا تھا کہ یہ کھیل بہت مشکل ہے۔“

”جب آپ جانتے تھے تو اس کھیل میں گیارہواں کھلاڑی مجھے کیوں بنایا۔ آپ انتظار کیجئے ٹیم کے آؤٹ ہونے تک۔“ وہ بہت غصے سے بولی تھی۔ اشمیل نے دیکھا ہی نہیں وہ باہر دیکھ رہا تھا۔ گاڑی تھی کہ سگنل تو ڈر چلی جا رہی تھی۔

”پلیز اشمیل! کنٹرول پور سیلف۔“ لیکن وہ بہت ریش ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ دونوں کے درمیان بہت گہری خاموشی تھی۔ پھر وہ ایک جگہ گاڑی روک کر ساری خاموشیوں کو توڑ کر بولا تھا۔

”ارج بہت اپ سیٹ ہے تم نے ٹھیک ہی کہا ہے حسن کی قیمت لگانے میں میرے پرنس نے بہت جلد بازی سے کام لیا ہے۔ ان 24 گھنٹوں میں سمجھ گیا ہوں کہ بہت بڑی غلطی ہوئی ہے۔ میں ارج کو کسی قیمت پر نہیں کھوسکتا ہوں۔ وہ مجھ سے بہت اونچے ہے۔“ وہ آسمان کی گہری دستوں میں جھانکنے لگا تھا۔ وہ بھی کسی پاتال سے نکل کر باہر آئی تھی۔

”آئی نو دیٹ..... ارج ان لڑکیوں میں سے ہے جو کسی بھی لڑکی کو اپنے سپینڈ کے ساتھ انوالو کر کے اس کا تماشا دیکھنا چاہتی ہے۔ فرسٹ ٹائم تم جس طرح سے ارج کو ہمارے درمیان لے کر آئے ہو یہی اس کی ایک دلیل ہے۔ نہ کل

وہ تمہاری زندگی میں شامل تھی مسٹر اشمیل ولید! نہ کبھی ہوگی۔ ارے ایک لڑکی کو کسی کی زندگی میں شامل کرنا تو بہت دور کی بات ہے میں ایک لمحہ بھی کسی کو شیر نہیں کر سکتی۔“

”واٹ ڈو یو مین تم ایک لمحہ بھی شیر نہیں کر سکتیں؟ کیا تم ارج اور ہمارے بیچ رہنا چاہو گی؟“

”آخری لمحے تک ایک انسان کو تو جانا ہوگا دیٹ آفیکٹ مسٹر اشمیل ولید!“ تو اس نے پلٹ کر دیکھا کہ یہ کل والی رومی نہیں تھی۔

”لیکن اگر ایسا میں خود چاہوں کہ تم ہماری زندگی میں اس وقت تک شامل رہو جب تک ہمیں ضرورت ہے۔“

”یہ کمیڈ میرج نہیں ہے یہ امریکا بھی نہیں ہے اشمیل کہ جب چاہے ارج کسی سے شادی کر لے امیگریشن کے بعد ڈائیورس ہو جائے۔“ وہ طنزیہ بولی۔

”تم ساری باتیں ارج اور ہمارے بیچ کی جانتی ہو اس لئے مجھ سے کچھ بے وقوفیاں ہوئی ہیں کہ میں خود تمہارے بہت قریب آ گیا اور اس بے وقوفی میں میں نے تمام باتیں تم سے شیر کر لیں۔“ وہ دھیمے لہجے میں بولا۔

”کبھی کوئی کسی سے شیر نہیں کرتا اشمیل ولید! تم مجھ پر ٹرسٹ کرتے تھے کرتے ہو کرتے ہو گے۔ تم نے اتنی جلد بازی میں سب کچھ کہہ ڈالا جس کو کہنے کے لئے برسوں درکار تھے۔ تم نے ہر بات مجھ سے شیر کی ناچاہتے ہوئے بھی آخر کیوں؟“

”آئی ڈونٹ نو.....“ وہ بڑی معصومیت سے بولا تھا۔

”چلو آؤ..... مام کی کال آئی ہوئی ہے تمہیں جلدی پارلر پہنچنا ہے۔“

زندگی آگے بڑھتی چلی گئی۔ نجانے کتنی محبتیں اور زلفاتیں ٹوٹیں نا جانے کتنے چاہنے والے اپنوں سے بچھڑ گئے۔

سمعیہ باجی کا پسندیدہ فرد جس کے لئے انہوں نے گھر میں ایک بساط بچھائی تھی کہ حماد سے نہیں رومی کی شادی صفر سے ہو گی۔ وہ صفر تو بہت پہلے اپنی چچا زاد بہن سے شادی کر کے نا جانے کہاں جا چکا تھا۔

سمعیہ باجی کی زندگی میں بھی ایک ٹھہراؤ سا آ گیا تھا۔ اتنی گہما گہما نہیں تھی۔ اب اماں کے گھر اور ان کے گھر کے درمیان اتنا کم فاصلہ نہیں تھا۔ کبھی کبھار اچانک آ جاتیں۔ وہ رنگ محفل تو نہیں تھی اور نہ ہی یہاں ماہم تھی اور نہ ہی شانزہ اور نہ ہی عصمت کی نئی کوئی کہانی۔ بھولی بچھڑی یادیں بکھری پڑی تھیں۔

ماہم نے کبھی اپنے جہیز کے کپڑے سینے ہوئے مشین کے لکڑی کے بکس میں ریڈین سے لکھا تھا۔

اپنی یادوں کو سمیٹیں گے بچھڑنے والے

پھر کسے معلوم ہے کون کدھر جائے گا

شانزہ نے ماہم کو بتایا تو اماں بہت روئی تھیں۔ آج وہی مشین زوبیہ بھابی گھسیٹ کر لے جا رہی تھیں۔

”بھابی! بھابی! ارے ناں۔“ ماہم جلدی سے آئی تھی۔

”میں نے اس کے بکس پر ایک شعر لکھا تھا۔“ شعر آدھا مٹ چکا تھا۔ ہر سو یادیں بکھری پڑی تھیں۔

”کیا سوچ رہی ہو دکھو ریا! کسی کا خیال آ رہا ہے مجھے تو یوں لگتا ہے کہ تمہیں تو یاد ہی نہیں تم کبھی کسی کی بات بھی نہیں کرتیں۔ تم سب بہت بے وفا ہو اپنے ابا کو بھی بھول گئے شانزہ کو بھی بھول گئے تم سب کوئی بات نہیں کوئی ذکر نہیں یوں جیسے تمہارے درمیان وہ تھی ہی نہیں۔ تم سے تو بہت قریب تھی آخری دنوں میں وہ کیا باتیں کر رہی تھی محن میں بیٹھے۔“ اماں کرید رہی تھیں۔

”اب تو کچھ یاد بھی نہیں اماں!“ ماہم کے ہونٹ مسکرا پڑے تھے۔
 ”چلو یہ بھی خوب رہی، کوئی کسی کو یاد نہیں رکھتا سب بھول جاتے ہیں، یہ ماں ہے جو اپنے بچوں کو نہیں بھول سکتی۔“ اپنی ساڑھی کے آچل سے انہوں نے حماد اور عمار کی بچپن کی تصویروں کو صاف کر کے رکھا تھا۔
 ”اماں! یہ میرے بیٹے کی تصویر کہاں سے آئی؟“ ماہم چونک کر بولی۔
 ”جی نہیں یہ ہمارے بچے ہیں۔“ اماں نے تصویر کو ہاتھ میں اٹھا لیا تھا۔
 ”اماں! میرا بیٹا حماد بھائی سے کتنا ملتا ہے۔“
 ”تمہیں لگتا ہوگا، میرا بیٹا تو بہت خوبصورت ہے۔“ اماں، حماد بھائی کی تصویر پر ہاتھ رکھ کر آبدیدہ ہو گئی تھیں۔
 ”اماں! روتی کیوں ہیں؟“

”نا جانے وہ کیسا ہوگا اور عصمت کیا کرتی ہوگی اس کے ساتھ۔“ ہاں مجھ سے ہو گئی غلطی۔ تم سب کچھ ٹھیک کہتی تھیں بیٹا۔ ہم کیا جانے ان بھیس بھرے انسانوں کو۔“
 ”ظاہر ہے اماں! کوئی نہیں کسی کو جان سکتا۔ میں تو ایسے ہی نکال لگایا کرتی تھی۔ سب لوگ بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں۔“
 ماہم بناوٹی انداز میں ہنسی تھی۔
 ”ارے کیا ٹھیک ہے سب کے سب ایک جیسے ہیں۔ ہمارا بیٹا ان لوگوں میں پھنس گیا ہے ایک دن مار کے چھوڑ دیں گے۔“

”ارے نہیں اماں!“ ماہم تڑپ گئی تھی۔
 ”اماں! میں کتنے دنوں کے بعد آئی ہوں۔ ہر بار مجھے انعم نہیں ملتی۔“ اماں کچھ نہیں بولی تھیں۔ ماہم کے اصرار پر دھیرے سے بولیں۔

”ثروت بیٹے کی طبیعت خراب تھی ناں، اس کا فون آیا تھا، سن کر بھاگی انعم۔ ارے بھی بیمار ہے تو ڈاکٹر کے پاس جاؤ، انعم کو کیوں فون کرتی ہو۔“ ماہم ہنس پڑی تھی۔ اماں کا انداز دکھی دکھی سا تھا۔ وہ خود کو اب تنہا فیل کرتی تھیں۔

عمار بہت کم ان کے کمرے میں آتے تھے۔ زیادہ تر وہ اپنی کتابوں، کیسٹس اور پالتو کتوں کے پاس وقت گزارتے۔ انہیں دین اور دنیا دونوں کی خبر نہیں تھی۔ ہاں حماد صبح جاتے وقت، شام آتے وقت اماں سے ضرورت بات کرتے تھے۔ طبیعت کیسی ہے، دوا لی یا نہیں اور جب اماں کو استھما کا ایک ہوتا تو وہ اماں کے کمرے میں لائٹ جلا کر رات گزارتے تھے۔

ماہم اماں سے ٹیک لگائے دونوں ہاتھوں کے حصار سے اماں کی پیٹھ سے لگی بیٹھی ہوتی تھی۔ حماد کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی ایک ہلکی سی لکیر ابھرتی تھی۔ انہیں ماہم کا اس طرح سے اماں سے محبت کرنا ہمیشہ اچھا لگتا تھا۔ ایسی بات تو نہیں تھی کہ شانزہ انعم اور ثروت ان سے محبت نہیں کرتی تھیں، بس ماہم کا یہ خیال تھا کہ وہ اماں کو سب سے زیادہ چاہتی ہے اور اماں بھی اسے زیادہ اہمیت دیتی ہیں۔

محبتوں اور رفاقتوں کے احساسات دونوں جانب یکساں ہوں تو عشق کی تڑپ میں محبت کے بھیکے ہوئے جنوں میں جو رنگ، جو احساس، جو جذبہ محبت ابھرتا ہے وہ قوس قزح کے رنگوں کی طرح کبھی کبھار نظر آتا ہے لیکن وہ ساری رفاقتیں ایک ایک کر کے آنکھوں سے اوجھل ہو گئی تھیں۔ بس یونہی ایک دن اماں کے سامنے ماہم نے بول دیا تھا۔

تتلیاں سب از گئیں کنج گلاب سے

وہ پتہ نہیں کس خیال میں بول گئی تھی اماں کا شفاف چہرہ آنسوؤں سے بھیگ گیا۔ ماہم شرمندہ سی اٹھ کر واش روم میں گئی تھی۔ آنسو تھے کہ بہے چلے جا رہے تھے۔ وہ ٹھنڈے ٹھنڈے پانی سے کتنی دیر اپنے چہرے کو دھوتی رہی تھی۔ جب وہ پلٹ کر باہر آئی تو رونے کی وجہ سے اماں کو سانس کا ایک ہوا تھا۔ انعم گھر پر نہیں تھی، ابھی تک وہ آفس سے واپس نہیں آئی تھی۔ ماہم نے گھبرا کر زوبیہ بھائی کی طرف دیکھا مگر اماں نے آنکھ کے اشارے سے منع کر دیا۔
 مسہری کے دراز سے ان ہیلر نکال کر وہ سانس لے رہی تھیں۔

”یہ آج میں نے کیا کر دیا، میں پل دوپل کے لئے آئی تھی، اماں کو میں نے رُلا دیا۔ انعم نا جانے کیوں مجھ سے ناراض رہتی ہے، انعم آئے گی تو اماں میری شکایت کریں گی۔ جب وہ ملے گی تو جملے کٹے جملے بولے گی۔ ہمیشہ اماں اور میری محبت کو اس نے محسوس نہیں کیا۔ دکھ اس بات کا ہے کہ وہ پہچان نہیں سکی۔ ویسے پہچانتی تو ہے وہ مجھے تاثر یہ دیتی ہے بے حد سادگی کا کہ میں تمہیں جان نہیں سکی، نہ جانے کون سا درد ہے اس کے دل میں جو اسے مجھ سے دور کرتا ہے، کیا اماں سچ کہتی ہیں کہ ثروت ہے۔ نہیں نہیں، ثروت باجی ایسی نہیں ہو سکتیں، وہ سمعیہ باجی سے زیادہ سب سے محبت کرتی ہیں۔ حماد بھائی بھی انہیں سب بہنوں میں پسند کرتے تھے۔ پچھلے ہفتے کی تو بات ہے۔ سمعیہ باجی کہہ رہی تھیں۔“

”حماد بھائی نے اپنی بائیک ہمارے دیورندیم کے ہاتھ بیچی تو ہے۔ جب وہ حماد بھائی صاحب کا ہیلٹ لگا کر نکلتا ہے تو میرے آنسو نکل پڑتے ہیں۔ حماد بھائی یاد آ جاتے ہیں۔“ ان کی آنکھیں جھم جھم برسنے لگی تھیں۔ دل تو ماہم کا بھی رویا تھا مگر وہ کیا کرے وہ یہ کہہ گئی۔

”اس میں رونے کی کیا بات ہے انہوں نے خرید لیا تو۔“
 پھر اس نے اٹھ کر اماں کی الماری کھول کر یونہی خواخواہ دیکھا تو اماں کا روز وڈ عطر دان ایک کونے میں یونہی رکھا تھا۔
 ماہم کو یاد آیا کہ شادی کے بعد ماہم صرف اور صرف اماں کی انگلیوں کے لمس کو محسوس کرنے کے لئے بولی تھی۔
 ”اماں! میں یہ لے جاؤں؟“ تو اماں بولیں۔

”ہاں لے جاؤ، یہ میرے کس کام کا ہے، خالی بکس ہے، دو چار شیشیاں پڑی ہیں۔“
 ماہم اسے اپنے ساتھ سرال لے گئی تھی۔ جب اس کی نظر اس سنگار دان پر پڑی تو اسے یوں لگا کہ یہ بہت قیمتی چیز ہے۔

”یہ صرف اماں کے ہی کمرے میں اچھی لگتی ہے، اس کو اماں کے ہی کمرے میں ہونا چاہیے۔ میرا کمرہ اس قابل نہیں کہ اس کو میں یہاں رکھوں۔“ سنگار دان کھول کر اس نے شیشے میں اپنی شکل دیکھی۔
 سپر کرٹل کی موٹی موٹی موتیوں کو چھو کر دیکھا اور پھر ایک دن وہ اسے اٹھا کر اماں کے کمرے میں لے آئی تھی۔
 ”اماں! یہ مجھے وہاں اچھا نہیں لگتا۔ یہ اسی کمرے میں خوبصورت لگتا ہے۔“ ابھی اماں نے مڑ کر سنا بھی نہیں تھا کہ انعم پٹ سے بول پڑی۔

”ہاں بھئی یہ اس قابل نہیں ہے کہ اس کو یہ اپنے کمرے میں جا کر رکھیں۔“ ماہم کا دل دھڑ سے ہوا تھا، اس نے چونک کر انعم کو دیکھا۔
 ”کیا واقعی تم محبت کے احساس سے عاری ہو، جو تم مجھے سمجھ نہ سکیں، میری محبت کو پہچان نہ سکیں۔“ لیکن انعم بڑی سنگدل سے منہ موڑ گئی تھی۔

”چلو اچھا جاؤ تم رکھ دو“۔ اماں بڑے غصے سے بولی تھیں۔ ماہم کا اس وقت دل پھٹ گیا تھا۔ دل میں اس نے اہم کو دیکھ کر سوچا تھا۔

”آج کا حساب میں تم سے روڈ محشر لوں گی اس جیلے کا حساب لوں گی جو تم نے اماں کے سامنے بولا ہے“۔ ماہم بے بس سی ہو کر بس سوچ کر رہ گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

شام 7 بجنے والے تھے رومی اور صبا دونوں تیار ہو گئی تھیں۔ صبا نے بہت شوخ مزاجی کی ساڑھی پر بہت خوبصورت ڈامنڈ کا سیٹ پہنا ہوا تھا۔ ان کی سرخ و سفید رنگت پر آتشیں رنگ پھوٹ کر نکل رہا تھا، چلتے چلتے ایک نظر انہوں نے آئینہ پر ڈالی اور رومی کو بہت غور سے دیکھا تھا۔

”سچ رومی! تم اس رنگ میں بہت حسین لگ رہی ہو یہ حسن ہمیشہ بدنصیب ہوتا ہے“۔ وہ استہزائیہ لہجے میں بولیں۔

”کیوں ممانی!“

”پتہ نہیں..... کہنے والے کہتے ہیں“۔ صبا کی نظریں رومی کے سوغوار چہرے پر پڑی تھیں۔

”کیا بات ہے رومی؟ تم بہت چپ اور اداس لگ رہی ہو“۔ وہ نہایت گہری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

”آج آپ بہت خوبصورت لگ رہی ہیں“۔ رومی جلدی سے بات ٹال کر صبا کو الجھا گئی تھی۔ صبا بے وقوفی کی حد تک اپنی حسن پرستی پر ہمیشہ ہی ناز کرتی رہی تھیں سو اس وقت بھی رومی کی داد و تحسین ان کے حسن کو جلا بخش گئی، بے اختیار وہ ہنس پڑیں۔

”تھینکس..... میں کیسی لگ رہی ہوں؟“ انہوں نے آچل تھام کر آئینہ کے سامنے گھوم کر دیکھا تھا۔

”سو بیوٹی فل“۔ رومی بددلی سے ہنس پڑی تھی۔

”اور اب تم دیکھو اب کیسی لگ رہی ہوں؟“ انہوں نے پرس تھام کر پوز بنایا تھا۔

”آج ولید ماموں دیکھنے گا دیکھتے ہی رہ جائیں گے“۔

”ارے چھوڑو تمہارے ولید ماموں یونہی ہیں۔ پارٹی میں سب لوگ ہوں گے ساری دوستیں اور رشتہ دار مجھے دیکھیں گے آج۔ میں چاہتی ہوں کہ میرے علاوہ کوئی دوسرا نظر نہ آئے۔“

”بائی دا ونے رومی! میں اس ڈریس میں زیادہ ایجنڈ تو نہیں لگ رہی؟“ انہیں ہمیشہ اپنی عمر کا کوئی مہلکس رہتا تھا آج بھی رومی کے سامنے وہ خود کو بہتر محسوس کر رہی تھیں۔ انہیں کوئی غرض نہیں تھی کہ رومی کیسی لگ رہی ہے۔ وہ خود بیوٹی پارلر سے بنی سنوری رومی کے ساتھ لگی تھیں۔

ہر آنے جانے والے کو ریسپشن پر رومی مسلسل دیکھ رہی تھی۔ آخری گیٹ آنے تک اس کی نظریں اسی طرف لگی ہوئی تھیں۔

”تایا ابا کیوں نہیں آئے؟ انہوں نے ارسلان سے کہا ہوگا اور ارسلان گاڑی کی خرابی کا کہہ کر بیٹھ گیا ہوگا۔ ایشل نے کہا ہوگا کہ ہمارے پاس تو کوئی اچھا ڈریس ہی نہیں ہے کیا پہن کر جاؤں۔“

”تائی اماں نے کہا ہوگا کہ میں کس لئے چلی جاؤں میری کیا لگتی ہے وہ اور دادی نے سوچا ہوگا چھوڑو ہوٹل تک میں کیسے جاؤں گی ورنہ وہ شاید ولید ماموں کو فون کر دیتیں اور ماموں گاڑی بھیج دیتے۔“

”ہر مہمان کی آمد پر وہ چونک جاتی۔ اسے دھوکا ہوتا کہ شاید کوئی آیا ہے۔ کتنے چہرے تھے جو اس کے قریب آ کر ہنس کر اٹھل سے کہہ رہے تھے۔“

”سو بیوٹی فل کیل“۔

”تھینکس“۔ اٹھل ہر شخص کو کہہ رہا تھا، وہ جہکائے بیٹھا تھا۔

”کیوں نہیں..... تم نے سب کے سامنے ہمیں اپنایا ہے کتاب اور سنت کی روشنی میں یہ ڈھونگ اور نالک نہیں ہے مسٹر اٹھل! تم جو چاہے کہہ لو میں شرعی طور پر تمہاری بیوی ہوں“۔ رومی کو غصے کی تیز لہر نے اپنے وجود میں لپیٹ لیا تھا۔ اس کے رخ روئے نے ہی اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ غصے سے اس کی آنکھوں میں گلابی رنگ اتر آیا تھا۔

”لوڈاؤٹ سو بیوٹی فل..... نہ اٹھل کل تمہارا تھا اور نہ ہی آج تمہارا ہے انڈر اسٹینڈ۔ تم حسن کے جتنے زاویے بدلو“

”نہ اٹھل کل تمہارا تھا اور نہ ہی آج تمہارا ہے انڈر اسٹینڈ۔ تم حسن کے جتنے زاویے بدلو“

”نہ اٹھل کل تمہارا تھا اور نہ ہی آج تمہارا ہے انڈر اسٹینڈ۔ تم حسن کے جتنے زاویے بدلو“

”نہ اٹھل کل تمہارا تھا اور نہ ہی آج تمہارا ہے انڈر اسٹینڈ۔ تم حسن کے جتنے زاویے بدلو“

”کہاں ہوا اٹھل! کیا اتنی حسین بیوی نے حواس گم کر دیئے ہیں“۔ تو اس نے ایک نظر رومی پر ڈالی اور بولا۔

”میں حسن پرست نہیں ہوں، حقیقت پرست ہوں“۔ رومی کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی تھی تو اٹھل نے بہت گہری نظروں سے اسے پلٹ کر دیکھا تھا تو وہ بھی انجان سی بن گئی۔

ولید ہر ایک شخص کو لے کر رومی کے قریب آ رہے تھے اور اٹھل بہت چپ سا خاموش بیٹھا تھا۔ اس ماحول اس زندگی سے وہ بہت دور جانا چاہتا تھا مگر رسم دنیا تھی کہ وہ رومی کے برابر میں بیٹھا رہے پھر وہ تھوڑی دیر میں اٹھ کر وہاں سے چلا گیا تھا۔ رومی نے ایک نظر اٹھا کر اس کی جانب دیکھا تو وہ کسی کے ساتھ دور کھڑا باتیں کر رہا تھا۔ رومی کی نظر سے اس کی نظر وہاں سے لٹکائی تھی۔

”خدا یا! ہمارے حواسوں پر یہ لڑکی ابھی سے کیوں چھا گئی ہے دل کے گوشے میں اس کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے“

ہمدردی ضرور تھی شناسائی تھی لیکن یہ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا لیکن اس کے علاوہ کوئی راستہ بھی تو نہیں تھا“۔ رومی اپنی نظریں جھکا گئی اور وہ بھی پلٹ گیا تھا یوں جیسے ان کے درمیان کوئی شناسائی نہ ہو۔

واپسی دیر سے ہوئی تھی۔ ولید حیدر بے حد خوش تھے۔ تمام اپنے بچھڑے ہوئے عزیز واقارب سے مل کر ماں باپ دونوں کے رشتے داروں سے انہیں انیسیت تھی۔ دادی زبیدہ بڑی خوش اور مطمئن نظر آ رہی تھیں۔

رومی اپنے کمرے میں پلٹ کر آئی تھی۔ ابھی اس نے اپنا ڈریس اور جیولری نہیں اتاری تھی کہ اٹھل نے آہستہ سے دروازہ کھولا تو وہ اسے دیکھ کر ٹھٹھک سا گیا۔

وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے اپنے بالوں کو کھولے ہوئے آہستہ آہستہ نگہا کر رہی تھی اور جونہی وہ چونک کر مڑی اس کی ساری چوڑیاں کھنک اٹھیں۔ اٹھل اسے بہت غور سے دیکھتے ہوئے بولا تھا۔

”تم نے ابھی تک چیخ نہیں کیا“۔

”نو.....“ وہ بولی۔

”تم آج بہت حسین اور خوبصورت لگ رہی ہو سراسر ہے جانے کی تمنا تو ہوگی“۔ بیٹھی ہوئی رومی شاکڈ ہو گئی۔

”جاؤ اتارو ساری جیولری میں رات بھر ڈسٹرب رہتا ہوں ہاں ڈریسنگ روم میں مت چھوڑ کر آجائے گا“۔ بہت بے رحمی سے وہ رومی کو دیکھ کر بولا تھا۔ پھر اس نے پلٹ کر رومی کو دیکھا جہاں کوئی احساسِ ندامت نہ تھا۔ حیرت سے اٹھل نے اس کی جانب دیکھا تو اس کے چہرے پر کوئی بھی احساسات نہیں تھے کہ وہ پڑھ سکتا۔

”میں نے شاید تم سے کچھ کہا ہے“۔ اٹھل گہری سانس لے کر چھت کی جانب دیکھنے لگا۔

”میں نے سن لیا ہے ضروری تو نہیں ہے کہ میں آپ کی کسی بات کا جواب دوں“۔ اٹھل کو اس کے اس طرح کے بی ہویز کی امید نہیں تھی۔ میک اپ اور زیورات سے آراستہ وہ نظریں جھکائے نہ جانے کیا سوچ رہی تھی۔ اب اٹھل پھر اسے ایک بار چونکا گیا۔

”کیا ہو گیا تمہیں“ کیا قیمتی زیورات اور اس لباس میں تم خود کو مسز اٹھل ولید سمجھ رہی ہو“۔ تو رومی کا چہرہ غصے سے تپتا اٹھا تھا۔

”کیوں نہیں..... تم نے سب کے سامنے ہمیں اپنایا ہے کتاب اور سنت کی روشنی میں یہ ڈھونگ اور نالک نہیں ہے مسٹر اٹھل! تم جو چاہے کہہ لو میں شرعی طور پر تمہاری بیوی ہوں“۔ رومی کو غصے کی تیز لہر نے اپنے وجود میں لپیٹ لیا تھا۔ اس کے رخ روئے نے ہی اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ غصے سے اس کی آنکھوں میں گلابی رنگ اتر آیا تھا۔

”لوڈاؤٹ سو بیوٹی فل..... نہ اٹھل کل تمہارا تھا اور نہ ہی آج تمہارا ہے انڈر اسٹینڈ۔ تم حسن کے جتنے زاویے بدلو“

”نہ اٹھل کل تمہارا تھا اور نہ ہی آج تمہارا ہے انڈر اسٹینڈ۔ تم حسن کے جتنے زاویے بدلو“

”نہ اٹھل کل تمہارا تھا اور نہ ہی آج تمہارا ہے انڈر اسٹینڈ۔ تم حسن کے جتنے زاویے بدلو“

”نہ اٹھل کل تمہارا تھا اور نہ ہی آج تمہارا ہے انڈر اسٹینڈ۔ تم حسن کے جتنے زاویے بدلو“

”نہ اٹھل کل تمہارا تھا اور نہ ہی آج تمہارا ہے انڈر اسٹینڈ۔ تم حسن کے جتنے زاویے بدلو“

”نہ اٹھل کل تمہارا تھا اور نہ ہی آج تمہارا ہے انڈر اسٹینڈ۔ تم حسن کے جتنے زاویے بدلو“

”نہ اٹھل کل تمہارا تھا اور نہ ہی آج تمہارا ہے انڈر اسٹینڈ۔ تم حسن کے جتنے زاویے بدلو“

”نہ اٹھل کل تمہارا تھا اور نہ ہی آج تمہارا ہے انڈر اسٹینڈ۔ تم حسن کے جتنے زاویے بدلو“

”نہ اٹھل کل تمہارا تھا اور نہ ہی آج تمہارا ہے انڈر اسٹینڈ۔ تم حسن کے جتنے زاویے بدلو“

”نہ اٹھل کل تمہارا تھا اور نہ ہی آج تمہارا ہے انڈر اسٹینڈ۔ تم حسن کے جتنے زاویے بدلو“

”نہ اٹھل کل تمہارا تھا اور نہ ہی آج تمہارا ہے انڈر اسٹینڈ۔ تم حسن کے جتنے زاویے بدلو“

”نہ اٹھل کل تمہارا تھا اور نہ ہی آج تمہارا ہے انڈر اسٹینڈ۔ تم حسن کے جتنے زاویے بدلو“

”نہ اٹھل کل تمہارا تھا اور نہ ہی آج تمہارا ہے انڈر اسٹینڈ۔ تم حسن کے جتنے زاویے بدلو“

”نہ اٹھل کل تمہارا تھا اور نہ ہی آج تمہارا ہے انڈر اسٹینڈ۔ تم حسن کے جتنے زاویے بدلو“

”نہ اٹھل کل تمہارا تھا اور نہ ہی آج تمہارا ہے انڈر اسٹینڈ۔ تم حسن کے جتنے زاویے بدلو“

گی رومی عادل! میں وہ مرد ہی نہیں کہ کمیڈ کسی اور سے ہو جاؤں اور چاہوں کسی اور کو۔“ اشمیل اس وقت بہت کنفیوژ تھا۔ اس نے کئی بار گھبرا کر اس کی جانب دیکھا تھا۔

”میں نے آپ سے کوئی دعویٰ تو نہیں کیا اپنے حسن کا اور نہ ہی محبت کا پھر آپ اتنے خوفزدہ کیوں ہیں؟“ وہ طنز سے مسکرا پڑی۔

”تم میری خوابگاہ میں موجود ہو۔ کیا کوئی مرد اتنا کمزور ہو سکتا ہے۔“

”محبت اتنی کمزور نہیں ہوتی مسٹر اشمیل! جس دن تم کمزور پڑ گئے اٹ مینس کے تمہارے اور ارج کے درمیان محبت تھی ہی نہیں۔“ وہ رخ پھیر گئی۔

”اوہ آئی سی..... تو یہ آپ کے حسن کا امتحان ہے۔“

”امتحان حسن کبھی نہیں بنا عورت ہمیشہ امتحان رہی ہے۔“ اس نے اس کی جانب اپنا رخ پھیر لیا تھا۔

”تمہارے اس تلخ رویے کا ہمیں احساس نہیں ہوا تم اتنی خاموش اور دبی دبی شخصیت کی مالک تھیں جو صرف پرندوں اور بلیوں کی باتیں کرتی تھی۔ اتنی نازک سی لڑکی جو صرف پودوں کی ٹہنیوں سے پھول چنتی ہو اتنی بے باک کیسے ہو گئی؟ تمہارے دوسرے دوپٹے بھی نہیں اترتا تھا یعنی معصومیت کا وہ بھیس جو تم نے اوڑھ کر رکھا تھا آخرا ایک دن اتر گیا۔“

”اگر آپ کہتے ہیں تو میں ابھی آپ کی خوابگاہ سے باہر نکل کر جا سکتی ہوں۔“

”یقیناً تم ہماری کمزوری کو جان چکی ہو۔“

”ناصر ف میں جان چکی ہوں اشمیل! بلکہ مجھے حیرت ہے کہ ایک دوست نے مجھے دھوکا دیا ہے۔ اپنے نام کے ساتھ تم نے میرا نام جوڑ کر جو ٹھپہ لگایا ہے شاید تم بھول گئے کہ یہ مشرق کی بیٹی ہے مغرب کی نہیں۔“

”سٹ اپ رومی! تم مجھے زیادہ فلسفہ پڑھانے کی کوشش مت کرو۔ تم اپنی لمٹ میں رہو۔ میں اپنے جذبات اور احساسات تم سے چھپا بھی سکتا تھا مگر میں برداشت نہ کر سکا اور نہ شاید تمہارے ساتھ زندگی وہ سلوک کرتی کہ تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔“ تو رومی کو اس کے حال پر بہت تیز ہنسی آئی تھی۔

”مسٹر اشمیل! جس دن آپ دادی کے روم سے مجھے شاپنگ کروانے لے کر گئے تھے میں اسی دن تمہیں پہچان گئی تھی لیکن میں تم سب کے رحم و کرم پر تھی۔ میں نے خود کو اللہ کی رضا پر چھوڑ دیا تھا۔ ہو گا وہی جو ہمارے نصیب میں لکھا ہو گا۔ کیوں میں اپنی منطق چلاؤں۔“

”او آئی سی..... تو میں نے ٹھیک ہی کہا ہے ناں کہ تم نے مجھے ٹریپ کیا ہے اپنی معصومیت اور اپنے حسن سے تم کسی کو بھی اسیر کر سکتی ہو۔“ وہ اس پر طنز کرنے سے باز نہ آیا۔

”آئی ڈونٹ نو کہ میں کیا کر سکتی ہوں میں نے تم سے کبھی نہیں کہا پھر تم ایسا کیسے سوچ رہے ہو؟“

رات کا دامن آہستہ آہستہ پھیلتا جا رہا تھا۔ اشمیل نے بہت غصے سے اپنا والٹ ڈرینک ٹیبل پر پھینکا اور گھڑی اتار کر رکھی اور رومی پر ایک نظر ڈالی جو ڈرینک روم سے پنک ٹائپی پیسے ہوئے باہر آئی تھی۔ بلیو ٹائٹ بلب میں خوابگاہ میں گہرا سناٹا تھا۔ اشمیل نے ٹھٹھک کر اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ کروٹ بدل تو لی تھی اس نے مگر اس کے قرب میں رومی کے وجود کی مہک آہستہ آہستہ اتر رہی تھی۔

(جاری ہے)

ہوتی تھی۔ جنگ تو امی بابا بھی ہوتے تھے، مگر اس کے علاوہ گھر کا کوئی فرد اظہار نہیں کرتا تھا، صرف ایک ماہ ہوا تھا انہیں ان کے برابر آئے ہوئے۔

”ہیلے اچھی خاصی فیملی رہتی تھی اللہ جانے انہیں کیا مصیبت آئی تھی کہ ان میراثیوں کو بیچ دیا ہے یہ گھر۔“ ادھر سے پھر آواز آئی تھی وہ بڑ بڑانے لگی، صحن میں بیٹھ کر اخبار پڑھنے کا خیال دل سے نکال دیا۔

”تم تو ٹھہرے پردیسی وعدہ کیا نبھاؤ گے۔“
”اے بھیا! پردے بعد میں سی لینا، ناشتہ دے تاکہ ہم اس منحوس باس کے متھے لگیں سویرے سویرے۔“ طلحہ نے حارش کو گاتے میں ٹوکا، ساتھ ہی گانے کا بھی ستیاناس کیا، حارش لنگ اس کے سامنے پٹا۔

”میں تیرا ادا کا نوکر نہیں ہوں روز ناشتہ بناؤں، بس کل سے تو ناشتہ بنائے گا، شام کا میں کچھ نہ کچھ کر لوں گا۔“ حارش کئی دن برداشت کرتا رہا، وہ صرف بیٹھ کر کھاتا تھا، لیکن اس نے سنبھال رکھا تھا، جیسے وہ اس کی گھڑ بیوی ہو۔

”کیا یار حارش! یونو مجھے کتنی الرجک ہے ان لیڈیز کاموں سے۔“ وہ معصومیت سے بولا۔
”کینے، ذلیل، یا جی..... تجھے کھانے سے الرجی نہیں ہے صرف ایک اینے میں، تجھے کوئی لیڈی نظر آتا ہوں، جو

عابدہ سبین

مکمل ناول

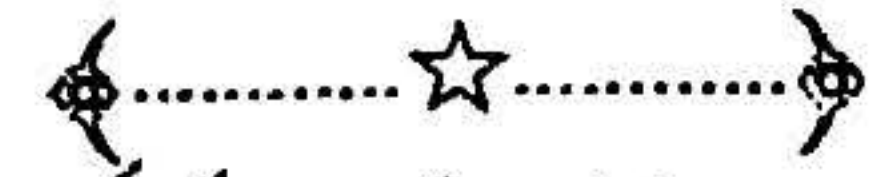
فیملی حارش کی فیملی

”طلحہ یار! نکل بھی آ باہر، کہیں مروت نہیں گیا، واش روم میں ہی۔“ روز کی طرح صبح صبح ہی وہ ہی آوازیں شور مہنگامہ کہنے کو تو اس گھر میں صرف دو فرد تھے، مگر ان کا شور و دوسو کے برابر ہوتا تھا اور حرمین کو ان کے اس ہنگامے سے سخت الجھن



سارے ایسے کام مجھ سے کراتا ہے، بس انیف آج سے بائیکاٹ۔ وہ جذبات میں اٹھ کھڑا ہوا۔

”اچھا یار! ناشتہ تو کر لے اب تو نے اتنی محنت سے یہ جلا ہوا آلیٹ اور سوکھے ہوئے پراٹھے بنائے ہیں ان کو حلق سے اتار کر بھی دکھاناں۔“ طلحہ اس کی بنائی اتنی پیاری پیاری آلیٹ اور پراٹھوں کی بے عزتی کرتا رہا وہ کڑھ کر ناشتہ کرتا رہا۔ یہ اس بات کی نشانی تھی کہ اب حارش عالم کو سنجیدہ غصہ آ گیا ہے تب طلحہ کو بھی بریک لگ گئی اور وہ جلدی جلدی ناشتہ ختم کرنے لگا، لیکن حارش پھر بھی اس سے پہلے ہی بائیک باہر نکال چکا تھا اور جب تک وہ تالے لگا کر باہر آیا وہ جا چکا تھا، یعنی آج آفس جانے کے لئے بس یار کسے کے دھکے کھانے تھے، خیر اس نے چابیاں پڑوس میں دیں تاکہ ماسی آ کے صفائی وغیرہ کر جائے اور خود بھی اللہ کا نام لیتا آفس چل دیا۔



یہ دولڑکے مہینہ بھر پہلے ہی یہاں شفٹ ہوئے تھے ان کے ساتھ کوئی لیڈریز یا بچے وغیرہ نہیں تھے یعنی دونوں چھڑے چھانٹ کنوارے تھے اور ایک نمبر کے بدتمیز نالائق اور چھپورے۔ خیر اسے تو آج تک کچھ نہیں کہا مگر آپس میں ان دونوں کی گفتگو اور مذاق اس قدر بھونڈے ہوتے تھے کہ وہ بعض دفعہ کانوں کو ہاتھ لگانے لگتی۔ صبح ان کی بک بک اس نے ساری سنی تھی اور پھر جب وہ چابیاں دینے آیا تو اسے ہنسی آ گئی۔

آج اس نے بڑے نمونے کو خفا کر دیا تھا اور سزا کے طور پر اس نے اپنی بائیک پر اسے لفٹ نہیں دی تھی ویسے یہ بھی سچ تھا کہ یہ طلحہ نام کا نمونہ ایک نمبر کا کام چور اور پیٹو تھا، کھانے کو جو مرضی دے دو سب ہضم اور پکانے کی باری میں اسے یہ کام خالصتاً عورتوں کا لگتا تھا، دوسرا بے چارہ صبح شام عورتوں کی طرح کچن بھی سنبھالتا اور نوکری بھی کرتا، کسی دن وہ لیٹ ہو جاتا تو کھانا بازار سے آ جاتا تھا مگر وہ پیٹو نہیں ہلتا تھا۔ پتہ نہیں یہ شخص کیسے برداشت کرتا ہے ایسے انسان کو.....؟ اسے تو یہ بھی نہیں علم تھا ان دونوں میں رشتہ کیا ہے اور ان کا کوئی آگے پیچھے بھی ہے یا نہیں۔

مئی کا آغاز تھا اور گرمی اچھی خاصی شروع ہو جاتی تھی اس لئے شام کو صحن میں بیٹھنا سب کو اچھا لگتا تھا، پھر ان کے صحن میں دو تین درخت تھے جن کی ہوا میں بیٹھ کر سکون ملتا تھا، اور وہ سب شام کی چائے پیہیں بیٹھ کر انجوائے کرتے تھے۔ اس وقت بھی زمین کے علاوہ وہ سب چائے پی رہے تھے زمین کچن میں شام کے کھانے کی تیاری کر رہی تھی تب ڈور بیل ہوئی۔ باہر ان دونوں میں سے ایک نمونہ تھا جو چابی لینے آیا تھا۔ ابو نے اخلاقاً اسے بھی چائے کی دعوت دی تھی۔

”تھینک یو سوچ انکل! مگر اس وقت گرمی سے برا حال ہے آپ پلیز انجوائے کریں ٹی“۔ واہ بھی واہ یہ لوگ اتنے مہذب انداز میں بھی بول سکتے ہیں بڑی حیرت کی بات ہے یہ یقیناً حارش تھا اگر طلحہ ہوتا تو کبھی انکار نہ کرتا اسے اپنی بات سوچ کر خود ہی ہنسی آ گئی اور کچھ دیر بعد ہی ادھر آوازیں آنا شروع ہو گئی تھیں۔

”حارش یار! چائے تو پلا دو سچ سر میں شدید درد ہے۔“ پھر وہ ہی پیٹو، جوبا، کوئی آواز نہیں آئی تھی۔ شاید وہ اب تک ناراض تھا۔

”تھینک یو برادر۔“ یعنی چائے بھی اسی بے چارے نے بنائی تھی، کچھ دیر خاموشی رہی، پھر طلحہ کی پریشانی بھری آواز آئی تھی۔

”حارش! یہ کیا ہوا تجھے اوگا ڈیہ ہوا کیا ہے.....؟“

”ایک سیڈنٹ.....“ مدھم آواز گونجی۔

”کیا اور تو مجھے اب بتا رہا ہے کب ہوا؟ اور زیادہ تو نہیں لگی چوٹ۔“ فکر پریشانی دکھ ہر احساس نمایاں تھا آواز میں۔

”صبح ہی ہو گیا تھا آج آفس گیا ہی نہیں ہاسپٹل تھا وہاں سے گھر آ گیا۔“

”حارش! سارا دن تو اتنی تکلیف برداشت کرتا رہا اور مجھے فون تک نہ کیا، اتنا برا ہوں میں۔“ وہ روہا ہنسا ہو گیا۔

”یار طلحہ! ایسا نہیں ہے میں نے سوچا تو پریشان ہوگا، دوپہر میں آفس سے بھاگے گا گرمی میں، بس اس لئے۔“

”تجھے میری اتنی فکر ہے اور میں کتنا خود غرض اتنی تکلیف کے باوجود چائے بھی تو نے بنائی، تو اب تو مجھے بتا سکتا تھا ناں، حارش یہاں کون ہے ہمارا ایک دوسرے کے علاوہ پڑوس بھی نیا ہے، کون جانتا ہے ہمیں، ہم نے خود ہی ایک دوسرے کا خیال رکھنا ہے، آئندہ تو نے ایسے کیا ناں، تو میں گھر چھوڑ کے چلا جاؤں گا، پھر سڑنا اکیلے۔ اس محلے میں تو کوئی ہم جیسوں کو پانی کا بھی نہ پوچھیں، بیماری میں تڑپ تڑپ کے مرجائیں گے اور کسی کو خبر بھی نہ ہوگی۔“ کتنا جذباتی ہو رہا تھا وہ۔

”یو نو طلحہ! میں کبھی کسی سے بھی کوئی امید نہیں رکھتا، انسانوں سے امیدیں باندھنا چھوڑ دی ہیں میں نے، پھر چاہیں وہ پڑوسی ہوں یا اپنے اور دیسے بھی اس جہاں میں اپنا ہے ہی کون.....؟ تنہا آئے تھے تنہا چلے جائیں گے۔“ اس کا جواب پہلے والے سے بھی زیادہ چھو لینے والا تھا۔

”یعنی تو مجھے بھی ان اپنوں کی کیٹیگری میں کھڑا کر رہا ہے۔“ طلحہ برا مان گیا۔

”ایسا نہیں ہے طلحہ! تو اچھی طرح جانتا تھا، میری زندگی کے ہر باب کو..... پھر تجھے اتنا اندازہ بھی ہوگا کہ میں نے اپنا ناطہ تعلق ختم کر ڈالا ہے سب سے اور تو اگر میرے سامنے بیٹھا ہے تو صرف اس لئے کہ میں تجھے اور پچھو کو ان جیسا نہیں سمجھتا۔“

”اچھا چل دفع کر۔“ طلحہ نے اس کا موڈ آف دیکھ کر کہا۔

”تو ریٹ کر۔“ اس نے حارش کو پکڑ کر کھڑا کیا، اس کے لئے صحن میں چار پائی ڈالی، بستر لگایا۔

”چل لیٹ جا، میں تیرے لئے کچھ لاتا ہوں کھانے کو۔“

”طلحہ! مجھے بھوک نہیں ہے یار! تو صرف اپنے.....“

”اچھا بس، مجھے پتہ ہے اب خواخوہ پرائی باتوں کو ذہن پر سواری مت کرنا۔“ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ ان کے ذکر پر وہ کس قدر ڈسٹرب ہو جاتا تھا۔ حارش نے اسے کوئی جواب نہیں دیا تھا، بس آنکھیں موند لیں، ذہن خود بخود ہی پیچھے چلا گیا۔



”اف او..... ایک تو یہ منحوس بچہ ہر وقت نندیدوں کی طرح میرے بچوں کو کھاتے پیتے دیکھتا ہے، چار دن ماں کے گھر رہنے کیا آگئی جان عذاب میں آگئی میری۔ اللہ جانے بھابی اس عذاب مسلسل کو اپنے باوا کے گھر ہی کیوں چھوڑ کر نہیں آئیں۔“ دس سال کے اس معصوم بچے کو دیکھتے ہی شمینہ باجی بولنے لگ گئیں اور شگفتہ آنکھوں میں آنسو بھرے اس بچے کا ہاتھ تھامے اندر آئیں اور اسے تنہا دیا۔

”کتنی بار منع کیا ہے تجھے مت نکلا کر باہر جو چاہئے مجھے کہہ دیا کر میں یہیں لا دوں گی مگر تو نہیں مانتا ناں میری۔“ ان کا غصہ اس معصوم پر نکلا تھا، دوپٹہ اور ہزاروں دفعہ کی ڈانٹ اسے رلا گئی اور وہ بے چارہ بیڈ پر اوندھا لیٹ گیا، خود وہ باہر چلی گئی تھیں کتنی دیر بعد کمرے میں آئیں تو وہ اسی طرح لیٹا تھا۔ ان کا دل بھرا آیا۔ روتے روتے سو گیا۔ کیسی ماں تھیں وہ.....؟ ایک طرف وہ معصوم سارے گھر والوں کی پھنکار سہتا تھا، پھر روتے کو ماں کا آنچل بھی نصیب نہ ہوتا، وہ کٹھور ہو جاتیں اور نہ چاہتے ہوئے بھی سارا قصور اس کا ہی نکال دیتیں زیادہ غصہ آتا تو دو چار لگا دیتیں، ایسے میں وہ بالکل تنہائی پسند ہوتا جا رہا تھا، اس گھر میں صرف ایک ماں کا رشتہ ہی تو۔ مگ تھا، روتے تو بہ رشتہ سویتا تھا، حتیٰ کہ اس کے چھوٹے بھائی بہن تک اسے

سوٹلا کہتے تھے آخر تھے جو سوٹیلے۔

اعظم علی سے ان کا دوسرا نکاح تھا اور حارش ان کے پہلے شوہر سے تھا، اعظم علی کی پہلی بیوی سے اولاد نہیں تھی اور صرف اولاد کی وجہ سے انہوں نے شگفتہ سے دوسرا نکاح کیا تھا، ان کے پہلے شوہر کا انتقال ہو گیا تھا اور وہ ایک بچے سمیت ماں باپ کے گھر بیٹھی تھیں، لیکن بھابیوں نے ان کا وقت گزارنا عذاب کیا ہوا تھا، پھر جب اعظم علی سے نکاح ہوا انہوں نے سوچا شاید ان کے برے دن ختم ہوئے لیکن حارش کا مسئلہ تھا، نانہانی معصومہ کو اسے کورکھ بھی لیتے لیکن ماموں، ممانیاں بالکل راضی نہ تھیں، دوسرا حارش کو اعظم علی نے خود بھی کہہ دیا تھا وہ اگر شگفتہ کے ساتھ آجائے گا تو ہمیں کوئی مسئلہ نہ ہوگا، شگفتہ نے سکھ کا سانس لیا، لیکن اعظم کے ماں باپ اور بہن بھائیوں نے حارش کو دل سے قبول نہ کیا، ان کا رویہ بہت سرد اور روکھا تھا، وہ حارش کو اپنے سامنے تک بیٹھا برداشت نہ کرتے تھے، اعظم علی البتہ اکثر اس کے لئے باہر سے کوئی چیز لے آتے، کبھی کبھار پیار سے بلالیتے تھے لیکن ان کے رویے میں بھی سوٹلا پن نمایاں ہوتا تھا، ایسے میں ان کا دل کٹ جاتا، سکے نانہانی، ماموں نے نہیں رکھا تو پھر ظاہر ہے کہ یہاں تو رشتہ سوٹلا تھا۔

حارش یہاں آ کر بہت گم صم رہنے لگا تھا، ان کی توجہ بھی کم ہو گئی تھی، سارا دن کام میں گزر جاتا تھا، بھرپور اگھر تھا، صبح سے کام میں لگتیں تو شام میں بھی فارغ نہ ہوتیں، پھر تھوڑی دیر حارش کے ساتھ گزارتیں، رات کو وہ اعظم کی اماں کے کمرے میں سوتا تھا۔

سال یوں ہی گزر گیا، حارش سب کے رویے محسوس کرتا لیکن جب ماں کا آنچل ملتا تو سب بھول جاتا، لیکن جب اعظم علی کی پہلی اولاد ہوئی تو حارش مزید تنہائی کا شکار ہو گیا، اعظم علی کبھی کبھار جو توجہ اسے دے دیتے تھے اب وہ بھی ان کی آنکھوں میں چھپنے لگا، کیونکہ اب اللہ نے انہیں بیٹا عطا کر دیا تھا وہ تمام گھروالے اس معصوم بچے کو مزید تکلیف دے دیتے اور شگفتہ کی توجہ بھی اب اس پر سے بالکل ختم ہو گئی۔

گھر کے کام اور ننھے ریان میں لگ کر وہ حارش کو خود سے بہت دور محسوس کرنے لگی تھیں۔ انہیں اپنے معصوم کی فریاد اور شکوہ کرتی نگاہیں بے کل کرتیں اور اگر کبھی ریان سے ہٹ کر وہ حارش کے پاس بیٹھ جاتیں اور ننھا روئے لگ جاتا تو اس کی ساس بہت زیادہ برا مناتیں، حد تو جب ہو جاتی جب وہ ریان کی وجہ سے حارش کو مارنے بھی لگ گئی تھیں اور یہ بات ان کا دل چیر دیتی۔ انہوں نے حارش کو سمجھایا بھی تھا کہ وہ زیادہ وقت کمرے میں گزارا کرے، مگر وہ بچہ تھا ہنسنے کھیلنے کو چلتا تھا، کبھی ریان کے پاس آ بیٹھتا تو دادی، پھپھو ڈانٹ کر اٹھا دیتیں اور وہ آنکھوں میں آنسو لئے کمرے میں جاتا اور لیٹ کر رونے لگتا، اسے دل کا بوجھ ہلکے کرنے کا یہ ہی ایک طریقہ آتا تھا۔

اسکول سے شکایت آئی تو اعظم علی نے اسے ڈانٹا بھی اور مارا بھی اس دن وہ بھی رو دیں تھیں، شاید ان کے آنسوؤں کی وجہ سے اعظم نے اسے ٹیوشن ڈال دیا، آفر آل شگفتہ بیگم کی وجہ سے آج وہ صاحب اولاد تھے اتنی تو قدر تھی انہیں اپنی بیوی کی۔ ٹیوشن کیا رکھی کہ حارش اب بالکل بھی انکے پاس نہیں رہتا تھا۔ اسکول سے مدرسے اور شام میں ٹیوشن رات کو آتے ہی سو جاتا، اکثر اب وہ رات میں کھانا بھی نہیں کھاتا تھا، گھر کا کوئی فرد یہ بات محسوس کرے نہ کرے، انہیں تو پتہ تھا ناں کہ ان کا بچہ بھوکا سو یا ہے، وہ اپنے آنسو پی کر رہ جاتیں، اتنی بے قدری تھی ان کے بچے کی، اگر یہ لوگ سمجھ بوجھ والے ہوتے تو حارش کو آنکھوں پر بٹھا کر رکھتے کہ اس کے نصیب سے ہی ان کے سونے گھر میں بچے کی قلعاریاں گونجیں ہیں، یہ اس قدر جاہل لوگ تھے کہ بس۔ دوسری طرف ان کے اپنے ماں باپ، بھائی، بھابیاں ان کے بیٹے کی شکل دیکھنے کو راضی نہ تھے، آخر وہ کیا کرتیں.....؟ حارش کا کیا مستقبل ہوگا.....؟ یہ سوچ سوچ کر گھلتی رہتیں۔

وقت تیزی سے گزر رہا تھا اور جیسے جیسے حارش بڑا ہو رہا تھا اتنی ہی حساس ہو رہا تھا، لیکن پے در پے چار بچوں کی

پیدائش نے ان کو ضرورت سے زیادہ مصروف کر دیا تھا، اور جیسے جیسے بچوں کو شعور آ رہا تھا وہ بھی حارش سے دور ہوتے جا رہے تھے، حارش چوری چھپے ان کے ساتھ کھیلتا، خوب خوش ہوتا، مگر اب ان کے ذہنوں میں بھی یہ بات بٹھادی گئی تھی کہ حارش سے ان کا کوئی رشتہ نہیں ہے اور وہ ان کا سوٹلا بھائی ہے۔ یہ بات ریان نے سب سے پہلے سیکھی، اب وہ بھی حارش کو دیکھتے ہی چڑ جاتا اور اگر وہ مخاطب کرتا تو بدتمیزی سے پیش آتا، پہلے پہل انہوں نے ریان کو پیار سے سمجھایا مگر اس پر اثر نہ ہوا کہ اس کی فیور میں سارا خاندان تھا، آخر انہوں نے حارش کو ہی منع کر دیا، اور پہلی بار انہوں نے حارش کے منہ سے کوئی ایسی بات سنی تھی کہ اندازہ ہو گیا کہ صرف گھروالوں سے ہی نہیں خود اپنی ماں سے بھی وہ بدگمان ہو چکا ہے۔

”آپ کو میری ضرورت نہیں تھی تو آپ مجھے مار دیتیں، آج مجھے اتنی اذیت نہ سہنی پڑتی۔“ کتنے آنسو ترے تھے اس کی آنکھوں میں مگر اب اس نے آنسوؤں کو پینا سیکھ لیا تھا، اس دن کے بعد اس نے ماں کو مخاطب تک کرنا چھوڑ دیا، اس کا میٹرک کا سال تھا لیکن وہ دیکھ رہی تھیں کہ وہ اب سارا دن باہر رہتا تھا، کہاں جاتا ہے؟ کیا کرتا ہے؟ انہیں علم نہ تھا، پھر آہستہ آہستہ اس نے رات میں بھی آنا کم کر دیا تو وہ پریشان ہوئیں لیکن اس کا اظہار وہ کس سے کرتیں کہ اعظم علی نے پھر اسے مارنا بیٹنا تھا، انہیں پرواہ کب تھی ظاہر ہے وہ صرف ان کا بیٹا تھا، یوں بھی اپنے چار بچوں کے بعد حارش کو وہ کچھ نہیں سمجھتے تھے، اگر وہ اس کی ضروریات پوری کرتے تھے تو صرف شگفتہ کی وجہ سے، ورنہ گھروالوں کے کہنے میں آ کر وہ کب کا اسے گھر سے پھینک چکے ہوتے۔

اس کے ایگزام کے لئے فیس جمع کرانی تھی لیکن پیسہ نہیں وہ گھر کیوں نہیں آ رہا تھا، کہیں ایسا نہ ہو اس نے اسکول چھوڑ دیا ہو.....؟ غلط دوست نہ بنا لئے ہوں.....؟ جانے کیسے کیسے وہم ہر وقت پریشان کر کے رکھتے تھے۔

آج کئی دن کے بعد وہ آیا تھا، دوپہر کا وقت تھا، تقریباً سب لوگ اپنے اپنے کمروں میں تھے دروازہ انہوں نے ہی کھولا تھا، اسے دیکھتے ہی جان میں جان آئی، لیکن وہ اس سے یہاں کوئی بات نہیں کرنا چاہتی تھیں اس لئے ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے کمرے میں لے آئیں۔

”کہاں تھے تم اتنے دن سے؟ اور کن لوگوں میں رہنے لگے ہو؟ جانتے ہو میں کتنی پریشان تھی۔“

”آپ کو بھی فکر ہوتی ہے میری.....؟“ کتنا کاٹ دار لہجہ تھا۔

”حارش! زبان درازی مت کرو آج کے بعد تم مجھے بتائے بنا کہیں نہیں جاؤ گے، تمہارے پیپرز ہونے والے ہیں اور تمہیں پرواہ.....“

”اس کی پرواہ ہے مجھے لیکن میں اب آپ کے شوہر کا مزید احسان لینا نہیں چاہتا اسی لئے میں نے خود اپنا بوجھ اٹھانا سیکھ لیا ہے، آپ برائے مہربانی میری فکر چھوڑ دیں اور صرف اپنے بچوں کی فکر کریں، میں اب الحمد للہ اپنا خیال رکھ سکتا ہوں اور میں آپ کو صرف یہ ہی بتانے آیا تھا کہ اب میں یہاں نہیں رہوں گا، اپنے کپڑے اور کتابیں اٹھانی تھیں، سو اس لئے آیا تھا۔“ اس نے اپنی بات مکمل کی اور اٹھ کر اپنی چیزیں سمیٹنے لگا، بت بنی شگفتہ کی طرف دیکھا تک نہیں۔

”تم اتنے بڑے ہو گئے ہو حارش کہ اپنے فیصلے خود کر لو۔“

”بڑا تو میں اسی دن ہو گیا تھا جس دن اعظم علی کا بیٹا اس دنیا میں آیا تھا، بس اب تو آپ کو علم ہوا ہے، اتنے سال ہو گئے ہیں، آپ نے کبھی میرے بارے میں سوچا بھی ہے، میں اپنے فیصلے خود ہی کرتا آ رہا ہوں، آپ کو آج خیال آیا ہے۔“ اس نے تمام چیزیں اٹھائیں ان کو جواب دیا اور پھر بنا ان کی شکل دیکھنے وہ تیزی سے باہر نکل گیا، وہ گم صم کھڑی تھیں جب وہ نکلا تو تیزی سے اس کے پیچھے لپکیں لیکن تب تک وہ دروازہ کراں کر گیا تھا، وہ وہیں

ڈھے گئیں اور رو پڑیں۔



”بچے! اپنی ماں سے بدگمان مت ہونا وہ بے چاری مجبور ہے۔ لیکن اس کا کیجیو بھی پھرتا ہے تیرے ساتھ سب کا رویہ دیکھ کر۔“ پھپھو اسے سمجھانے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں۔

”آج تک میرے ساتھ جو بھی زیادتی ہوئی ہے انہی کی وجہ سے ہوئی ہے اگر وہ ایک بار بھی میری سائیڈ لیتیں تو شاید وہ لوگ مجھے اس طرح نہ دھکارتے انہوں نے تو ہمیشہ دوسروں کی غلطی پر بھی مجھے مارا ہے پھر بھی آپ ان کی سائیڈ لے رہی ہیں۔“ وہ اپنی عمر سے بڑی باتیں کرتا تھا پھپھو کو لگانی الوقت اسے سمجھانا بے کار ہے کیونکہ اس کے زخم ابھی تازے تھے۔

وہ اعظم علی کی کزن تھیں مگر جس دن سے شگفتہ بیاہ کر اعظم کے گھر آئی تھیں وہ اس محسوس بچے پر ہونے والے ہر ظلم کو دیکھ رہی تھیں۔ شگفتہ جب بچوں میں معروف ہو کر حارش کی طرف سے بالکل علی لا پرواہ ہو گئیں تو انہوں نے اس کے سر پر شفقت کا ہاتھ رکھا حارش کو بھی ان کی محبت بے غرض اور پر خلوص لگی تو وہ ان سے اچھ ہو گیا وہ اسکول کے بعد پھپھو کے پاس آ جاتا سارا دن یہیں گزارتا ظلم کے ساتھ کھیل کر اس کے ساتھ بیٹھ کر سوچ کر آ کر سوجاتا اکثر وہ کھانا بھی پھپھو کی طرف ہی کھا لیتا تھا اگر پھپھو نہ ہوتیں تو جس طرح اس کی ماماں کی ذات سے لا پرواہ ہو گئی تھیں یا تو وہ مرجاتا اور نہ پھر غلط ہاتھوں میں چا جاتا لیکن پھپھو کی ماں جیسی محبت نے اس کی ذات کا اعظام دیکھنے سے نہ دیا وہ دن بدن ان کے اور ظلم کے قریب ہوتا چلا گیا۔

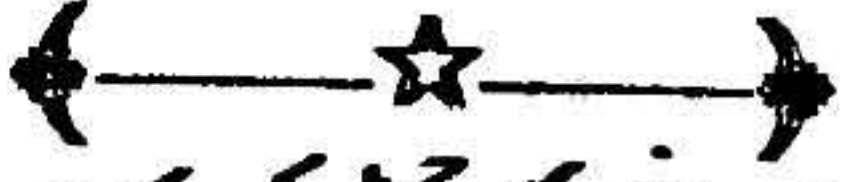
جب وہ آٹھویں میں تھا تو اس نے اسکول کے ساتھ ساتھ شام میں الیکٹریشن کی شاپ پر جانا شروع کر دیا کچھ اس کا انٹرسٹ تھا کہ وہ الیکٹریکل انجینئر بننا چاہتا تھا کچھ اس کی ضرورت کیونکہ وہ اعظم علی پر حریف و جہن کر اپنی زندگی مزید برباد کرنا نہیں چاہتا تھا۔ آہستہ آہستہ اس نے اپنی چھوٹی چھوٹی چیزیں اپنی پاکٹ مٹی سے جو دکان سے ہر ہفتے ملتی تھیں خریدنا شروع کر دیں اور اب جبکہ وہ میٹرک میں تھا تو اچھا خاصا کام بھی کچھ چکا تھا وہ اب بھی شام میں اسی شاپ پر کام کرتا تھا اب اس کی پاکٹ مٹی بھی بڑھ چکی تھی سو اسے لگا کہ اب وہ خود اپنا خرچ اٹھا سکتا تھا اس لئے وہ اپنی ماما کا گھر چھوڑ کر پھپھو کے پاس آ گیا۔

ظلم اس کے مستقل آنے سے بہت خوش تھا اب وہ صبح میں مل کر اسکول جاتے پھر شام میں ماٹھے کام پر چونکہ پھپھو یہ وہ تھیں اور وہ خود سیکنڈری اسکول میں نیچر تھیں ظلم بھی چاہتا تھا وہ اپنی ماما کے ساتھ مل کر کام کرے دونوں کا وقت اچھا گزر جاتا ساتھ ساتھ میں ہنر بھی آ گیا تھا اور اپنے پیروں پر کھڑا ہوتا انہیں اچھا لگتا تھا وقت اسی طرح گزرتا چلا گیا اس کی ماما پھپھو کے گھر آ جاتی تھیں کبھی کبھار اس سے ملنے لیکن اس کے دل پر اب گہری گرد چھا چکی تھی وہ اپنی ماما سے بہت دور جا چکا تھا۔ اسے اب ان کی آنکھوں کی نمی ڈھونگ اور ان کا یہ محض ڈرامہ لگتا تھا۔

کتنے سال یوں ہی بیت گئے وہ دونوں تعلیم مکمل کر کے اب پروفیشنل لائف اسٹارٹ کر چکے تھے اور اپنی پسندیدہ جاب پا کر وہ بہت خوش بھی تھے۔ ظلم ہر قدم پر اس کے ساتھ تھا۔ ان دونوں نے اپنی الیکٹریشن شاپ بنا رکھی تھی جاب سے پہلے ہی سوجاب کے بعد بھی وہ اکثر شام کا وقت وہیں گزارتے کہ بے کاری سے بہتر کارگزاری اور اس طرح وہ کافی پیسہ سیوا کر لیتا تھا پھپھو تقریباً اس کی ساری پے منٹ سیوا کرتی تھیں دکان سے ہی وہ اپنی ضرورت پوری کر لیتا تھا یوں جلد ہی اس نے اتنے پیسے کرائے کر اپنا خود کا گھر خرید سکے اب وہ اسی کوشش میں تھا انہی دنوں اچانک پھپھو کی طبیعت خراب ہو گئی ہائی بلڈ پریشر کی دہریض تو تھیں لیکن اچانک ان کا پی پی بہت ہائی ہو گیا وہ فوراً اسپتال لے گئے مگر تب تک دیر ہو چکی

تھی پھپھو کی دماغ کی رگ پھٹ چکی تھی جس کی وجہ سے وہ اپنی زندگی بارہنیں اس دن حارش کو لگا کہ اب وہ بالکل تنہا رہ گیا ہے ختم ہو گیا ہے لیکن ظلم کی حالت اس سے بھی بری تھی وہ بھی تنہا ہو گیا تھا ان دونوں نے ہی اب ایک دوسرے کو سنبھالنا تھا کیونکہ اس دنیا میں ان کا ایک دوسرے کے علاوہ کوئی نہ تھا۔

کافی وقت لگا تھا انہیں خود کو سنبھالنے میں مگر وقت نے آخر انہیں سنبھال ہی لیا وہ دونوں تھے اور زندگی کا ایک نیا سبز۔ پھپھو کے بغیر گھر کھانے کو آتا تھا اب اس گھر میں دل نہ لگتا اس لئے دوسرے علاقے میں گھر خرید لیا اور وہاں شفٹ ہو گئے دکان بھی ختم کر دی اب صرف جاب تھی اور گھر کے کام۔ شام میں دونوں اکٹھے ہوتے تو اٹنی سیدھی گئیں گانے اور مذاق کر لیتے جس سے زندگی تھوڑی سیل ہو گئی تھی اور نئے گھر میں بھی ان کا سن لگ گیا تھا آخر زندگی کو تو گزارنا تھا تو وہ انہی خوشی تھی۔



دو دن تک ظلم نے اسے آفس نہیں جانے دیا خود بھی چھٹی کی تاکہ اس کا مکمل خیال رکھ سکے کتنی حیرت کی بات تھی ہاں کہ بچھے دو دن سے وہ پڑوسیوں کے مہمان تھے اور تینوں وقت کا کھانا ان کے گھر سے آ جاتا تھا حارش نے بہت منع کیا مگر وہ انکل نہیں مانے اور پھر ان کا بیٹا جو تقریباً ان کا ہی ہم عمر تھا اچھے دوستوں کی طرح ان کا خیال رکھتا تھا۔

”حارش! کیا بات ہے یار۔؟ مجھے تو ڈر لگ رہا ہے آج کل ماتی شرافت اور نیک نیتی کا زمانہ کہاں ہے۔“

”بیک نہیں۔ یہ لوگ بہت شریف ہیں اور انہیں پتہ ہے کہ گھر کا باورچی بیار ہے تو کو کنگ کون کرے گا تجھ جیسے بے حس سے انہیں بھی امید نہیں کہ چائے ہی پلا دے گا مجھے۔“

”کیا کیا یعنی۔ میں۔“ وہ چیخا۔

”بس بائیکاٹ۔ میں اب تجھ سے بات نہیں کروں گا دو دن میں ہی بدل گیا۔“ اس نے منہ پھلایا تو حارش ہنس دیا۔

”ارے میرا بھائی! تو خفا ہو گیا میں تو مذاق کر رہا تھا تجھ سے تو نہ ہوتا تو بھلا آج میں یہاں ہوتا؟ جانے کہاں کہاں کے دھکے کھا رہا ہوتا۔“ وہ اب پھر سنجیدہ ہونے لگا تھا۔ ظلم نے اسے گھورا۔

”اور اگر تو نہ ہوتا تو امی کے بعد میں بھی دھکے کھا رہا ہوتا ہم دونوں ہی ایک دوسرے کے لئے ضروری ہیں۔“

”ہاں ظلم! یہ تو ہے یا ایک دوسرے کے بغیر ہمارا ایک بل کا بھی گزرا نہیں ہے۔“ وہ دونوں باتیں کر رہے تھے جب کاشف آیا۔

”ڈسٹرب تو نہیں کیا میں نے۔؟“

”ارے نہیں یار! آؤ ہاں بیٹھو۔“

”تھیک یو۔ وہ ان کے پاس ہی صوفے پر بیٹھ گیا۔

”دراصل مجھے ہونے بیجا ہے وہ چاہتے ہیں کہ آج شام تم دونوں کھانا ہمارے ساتھ گھر کھاؤ۔“

”کم آن کاشف! دونوں سے تم لوگوں کو ہم زحمت دے رہے ہیں یہ کافی نہیں ہے بلکہ یار۔۔۔ اب حریف کیوں۔“

”زحمت کی کیا بات ہے یار! پڑوسیوں کے حقوق کتنے ہیں یہ تو تم بھی جانتے ہو آئندہ ایسی باتیں مت کرنا ہمیں علم ہے کہ تم خود اچھے خاصے گھر ہو مگر ایک دو دن ریست کرنا تمہارا لباؤ ٹھیک ہو جائے پھر بے شک سنبھال لینا اپنا بکھن۔“ اس کی بات پر وہ ہنس دیا۔

”تھیک یو یار! تم لوگوں نے ہمارا خیال کیا وگرنہ ہم اس محلے میں بالکل نئے تھے لیکن اب لگتا ہے کہ ہمیں

”میں بھی یہ ہی کہہ رہی تھی اس سے کہ دو کپ چائے بنا کر دیوار پر رکھ دے حارش اور طلحہ کے لئے۔“
 ”دادی اماں! وہ ابھی گھر نہیں آئے“ صبح طلحہ ملا تھا مجھے بتا رہا تھا کہ ان کے کسی رشتے دار کی ڈیڑھ تھ ہو گئی ہے انہیں وہاں جانا ہے شاید وہیں چلے گئے ہوں گے۔“

”یقیناً وہیں گئے ہوں گے۔“ تب ہی ابو بھی آگئے اور دادی نے انہیں بھی بتایا۔
 ”پتہ نہیں مجھے ایسا لگتا ہے کہ حارش اپنے رشتے داروں سے کٹا کٹا ہے ذکر تک نہیں کرتا کبھی۔“ کاشف بولا ابو بھی کچھ سوچ رہے تھے۔

”اماں! مجھے حارش کو دیکھ کر جانے کیوں ایسا لگتا ہے کہ میں نے پہلے بھی اسے دیکھا ہے کچھ جانی پہچانی سی شکل اپنا پن محسوس ہوتا ہے اسے دیکھ کر مگر اس سے پوچھنے کی ہمت ہی نہیں پڑتی کہ معلوم کروں وہ کون ہے اس کے والد اس کا خاندان.....؟ ایک عجیب سا کھنچاؤ ہے جو مجھے اس کی طرف کھینچتا ہے۔“ ان کے لہجے میں حارش کے لئے اپنا پن صاف چھلک رہا تھا، حرمین تو دادی کو ہی کہہ رہی تھی اب تو ابو بھی ان کے شیدائی نظر آ رہے تھے وہ سب کو چائے دینے لگی۔

”ڈیڑھ کس کی ہوئی ہے.....؟“ ابو کاشف سے مخاطب تھے۔
 ”معلوم نہیں..... حارش تو اس معاملے میں بات کرنا ہی نہیں چاہتا تھا، طلحہ نے مجھے بتایا ہے آئی تھنک وہ حارش کو فورس کر رہا تھا جانے پر کیونکہ وہ جانا نہیں چاہتا تھا۔“ کاشف کی بات انہیں الجھا گئی اس کے لہجے میں رشتے داروں کے لئے نخی تو وہ محسوس کرتے تھے کیونکہ وہ صاف الفاظ میں کہتا تھا کہ اس کا دنیا میں کوئی رشتہ ہے ہی نہیں جو کچھ بھی ہے صرف طلحہ ہے اور بس۔



”حارش یار پلینز! اب تو غصہ تھوک دے دیکھ اگر تو وہاں چلا گیا تھا تو کیا عذاب آ گیا؟“
 ”میں گیا نہیں تھا تم زبردستی لے کر گئے تھے مجھے۔“ وہ بھڑک اٹھا اس نے تو قسم کھائی تھی اب دوبارہ زندگی میں اعظم علی کے گھر نہیں جائے گا، مگر اعظم علی کی ڈیڑھ کی خبر آئی تو طلحہ زبردستی اسے لے گیا تھا۔
 ”مجھے پتہ ہے کہ میں تجھے لے گیا تھا، اگر کوئی غیر بھی ہوتے تو تم ضرور جاتے تو کیا فرق پڑا کہ تم چلے گئے۔“
 ”طلحہ! میرا ہر زخم تازہ ہو جاتا ہے وہاں جا کر۔“ اس کے لہجے میں درد تھا، طلحہ سمجھتا تھا۔

”آئی نو..... لیکن تجھے پتہ ہے حارش! آئی شگفتہ کی آنکھیں تجھے کس بے تابانی سے ڈھونڈ رہی تھیں، کاش تو ایک بار.....“
 اندر جا کر ان سے مل لیتا انہوں نے مجھ سے تمہارے بارے میں پوچھا تو میں کہہ بھی نہ سکا کہ تم آئے ہو۔“
 ”اچھا کیا وہ میرے اندر کے دکھوں کی ذمہ دار ہیں میں ان سے ملنا نہیں چاہتا۔“ شاید اس کے بچپن کے حالات تھے ہی ایسے کہ وہ اپنی ماں سے بھی بدگمان تھا، کاش شگفتہ اپنی تمام تر مصروفیت میں سے اس کے لئے بھی کچھ توجہ پیار نکال پاتیں ان کی بے توجہی نے آج ان کے بیٹے کو بہت دور کر دیا تھا ان سے۔
 ”تمہارے نانا اور ماموں بھی تمہیں دیکھ رہے تھے۔“

”طلحہ! کیا مسئلہ ہے تیرے ساتھ.....؟ آج تو کیوں میرے زخم ہرے کر رہا ہے جب ایک بار میں کہہ چکا ہوں کہ میرا کوئی ہے ہی نہیں تو کیوں ایک ایک رشتے میرے سامنے لے کر گن رہا ہے۔“ اس کی برداشت کی حد ختم ہو چکی تھی۔
 ”رشتے کبھی ختم نہیں ہوتے حارش! صرف تمہارے کہنے سے کہ تمہارا کوئی نہیں ہے سارے رشتے مر بیس جائیں گے تلخیاں زندگی کا حصہ ہیں بیٹا! مگر ان سے تا عمر منہ نہیں موڑ سکتے تم ہاں کچھ وقت ایسا آتا ہے کہ ہم سب سے کٹ جاتے

اچھے لوگ مل گئے ہیں۔“ وہ تہہ دل سے مشکور تھا ان کا، شام میں دل تو نہیں کر رہا تھا۔ پہلی بار ان کے گھر جاتے ہوئے جھک رہے تھے پر انکل خود دوبارہ بلانے آئے تو انہیں جانا پڑا وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے خوبصورتی سے سجا ڈرائنگ روم بہت اچھا پر سکون سا لگا، حالانکہ گرمیوں کا موسم تھا ان کے جاتے ہی انکل نے کھانا لگو الیا ان کے ساتھ کھانے کے دوران وہ ہلکی پھلکی گفتگو کرتے رہے، طلحہ کے چپکے تو ظاہر ہے کم نہیں ہو سکتے تھے کھانے کے بعد انہوں نے چائے بنوائی۔

”اور حارش! اب بازو کیسا ہے بیٹا.....؟“

”بہت بہتر ہے انکل! تھینک یو ویری مچ آپ لوگوں کی مہربانی سے.....“

”یہ ہماری مہربانی نہیں ہے ہمارا فرض تھا اور بس اور ہاں آئندہ بھی کسی بھی طرح کی ضرورت ہو تو فوراً بتا دینا بالکل بھی اکیلا مت سمجھنا خود کو۔“
 ”جی بہت بہت شکریہ۔“

”اچھا چھوڑو یہ شکریہ..... یہ بتاؤ تم لوگ کس علاقے کے رہنے والے ہو، یہیں اپنے شہر کے.....؟“

”جی انکل! ہم ملتان سے ہی بی لوگ کرتے ہیں بس پہلے یہاں دوسرے ایریا میں تھے۔“

”اور تمہاری باقی فیملی.....؟“ کاشف کے سوال نے ان دونوں کے چہروں کی مسکراہٹ غائب کر دی تھی یہ بات خود انہوں نے بھی محسوس کی۔

”ہم دونوں کا ایک دوسرے کے علاوہ کوئی نہیں ہے، ایک پھپھو یعنی طلحہ کی ممتا میں سال بھر پہلے ان کی بھی ڈیڑھ ہو گئی ہے اس لئے ہم پرانا گھر رینٹ پر چھوڑ کر یہاں شفٹ ہو گئے، پھپھو کے بعد اس گھر میں ہمارا دل نہیں لگتا تھا۔“ حارش کی بات سن کر لمحے بھر کو وہ بھی چپ رہ گئے۔

”آئی ایم سوری بیٹا! انکل نے افسوس کا اظہار کیا۔“

”لیکن بیٹا! خود کو بھی اکیلا مت سمجھنا، کوئی بھی کام ہو وہ کھ تکیف ہر چیز میں ہم تمہارے ساتھ ہیں۔“

”تھینک یو انکل۔“ اس بار طلحہ بولا تھا کافی دیر وہ لوگ بیٹھے رہے پھر اجازت لے کر آ گئے۔



”بچے اس دنیا میں اکیلے ہیں اللہ کی مصلحت، کتنے پیارے بچے ہیں دونوں، سمجھدار، ذمہ دار.....“ دادی کو تو ان سے بہت ہی لگاؤ ہو گیا تھا جس دن سے یہ پتہ چلا کہ وہ دونوں بالکل اکیلے ہیں ان سے اور زیادہ ہمدردی ہو گئی تھی۔
 ”ذمہ دار.....“ حرمین کو کبھی آگئی چلو حارش کے بارے میں تو بندہ کہہ سکتا ہے مگر طلحہ اور ذمہ دار۔
 ”تو کیوں دانت نکال رہی ہے۔“ دادی نے فوراً ٹوکا۔

”بس یوں ہی دادی! یہ اخبار میں لطیفے پڑھ رہی ہوں۔“

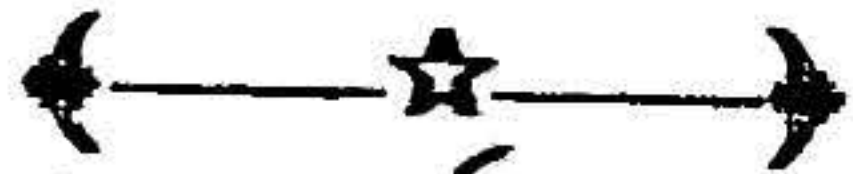
”اچھا سن..... شام تو ہو چلی ہے تو دو کپ چائے بنا کر بھیج دے ان بچوں کے لئے، تھکے ہارے آٹے ہوں گے آتے ہی چوبے میں گھسیں گے گرمی میں۔“

”آف دادی! آپ نے تو انہیں بہت ہی.....“ وہ جھنجھلا گئی مگر اندر آتے کاشف کو دیکھ کر بات مکمل نہیں کی اور چپ ہو گئی۔

”حرمین ڈیر! چائے تو پلاؤ زبردستی۔“ کاشف نے وہیں دادی کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

”جی بھیا! ابھی لاتی ہوں۔“ وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔

دیکھ رہے تھے چہرہ پر پھلکی بے چینی اور آنکھوں میں بحرِ مانی لہجہ بیگم کا تھا۔
”کیا بات ہے انکل؟“ سطل نے ان سے پوچھا مگر وہ کوئی بھی جواب دیے بغیر ہی سے چلے گئے اور انہیں پریشان چھوڑ گئے۔



یعنی سلطان نے سوتیلے پرن کے جتنے دکھ جھیلے اس سے کہیں زیادہ اس کا بیٹا جھیل رہا ہے۔ کاش ان کے لبا دوسرا نکاح کرنے سے پہلے سوچ لیتے تو آج حارث کا یہ حال نہ ہوتا اور نہ ہی ان کا بھائی جوانی میں اللہ کو نیا را ہوتا۔ وہ جب سے حارث کے پاس سے آئے تھے اپنے کمرے میں بند تھے اور ان کی سچ سی باہر آئے تھے ناشتے پر بیٹھ ان کا اتر چہرہ سو جھی آنکھیں دیکھ کر پریشان ہو گئے تھے۔

”کیا بات ہے فرمان! تیری طبیعت ٹھیک ہے بچے۔ کل شام سے تو کمرے میں بند ہے اور اب آیا ہے چہرہ اترا ہوا ہے تو رویا ہے کیا۔“ اماں سے ان کی خاموشی برداشت نہیں ہوئی باقی سب تو ہمت باندھ رہے تھے کچھ پوچھنے کی۔ انہوں نے کپ نیچہ دکھا اور اماں کو دیکھنے لگے۔
”اماں! بعض اوقات ہمارے بڑوں کی گئی چھوٹی سی غلطی ہماری نسل در نسل خیارہ بھگتی ہے۔“ ان کی بات کسی کی بھی سمجھ نہیں آئی تھی۔

”کیا مسئلہ ہے۔؟ آخر کیا بوجہ ہے جس نے آپ کو اسٹاپ سیٹ کر رکھا ہے۔“ شاید شریک حیات ہونے کے ناطے وہ ان کو اتنا دیکھی دیکھ کر برداشت نہیں کر پا رہی تھیں۔

”عالیہ بیگم! ہمارے ملانے جو کیا اس کی سزا ہم آج تک سہہ رہے ہیں سلطان دنیا سے چلا گیا اور۔۔۔۔۔“ ان کا لہجہ بھر آیا ان کی بات پر سب ہی دنگی تو ہوئے تھے مگر آج اتنے سالوں بعد یہ قصہ؟ بابا کا یوں یکدم اپ سیٹ ہونا۔۔۔۔۔ ان کی آنکھیں گواہ تھیں ان کے رونے کی، لیکن کیوں؟ اب یہ باتیں یاد کر کے رونے کا کیا فائدہ تھا۔؟

”بابا جانی! ہم سمجھتے ہیں سب مگر اتنے سال بیت گئے اس بات کو اب کیا حاصل یہ سب یاد کر کے خود کو جی تکلیف دینے کا؟ چاچو کا بد دل میں ہے مگر آپ کیوں اب یہ باتیں از سر نو سوچ سوچ کر خود کو دکھی کر رہے ہیں۔۔۔۔۔؟“

”اس لئے بیٹا! خود کہ سلطان نے جھیلے ہیں اب وہ دکھ اس کا بیٹا جھیل رہا ہے اور تمہیں پتہ ہے کہ اس نے کتنے کارشتوں پر سے اعتبار اٹھ گیا ہے وہ خود کو تھما تھما کر اپنے حال کو ان کے پاس تمام ہر شے ہیں لیکن چند سوتیلے رشتوں نے اس کو اتنی اذیتیں دیں کہ اس کا کائنات کے ہر رشتے سے بھرم اٹھ گیا اور جاتے ہو کہ وہ کون ہے جو سلطان کا بیٹا ہے۔؟ جس کے بارے میں آپ کو بتا رہا ہوں۔ وہ حارث ہے۔ حارث عالم۔ جو ہمارا اپنا خون تھا اور ہم بے خبر تھے جو دکھوں کے سمندر میں اکیلا ہاتھ پیر رہتا رہا اور ہمیں خبر بھی نہیں ہوئی۔ مجھے کل پتا چلا کہ کون اسے دکھ کر میرا دل بھلتا ہے ظاہر ہے وہ خون ہے ہمارا میرے بھائی کی نشانی۔ یہ سب بتاتے ہوئے جہاں ان کا لہجہ بھرا تھا آنکھوں سے آنسو بھی ٹپک پڑے اور واوی یہ سب سن کر میری طرح روویں۔

”میرے سلطان کا بیٹا یہاں میرے پاس رہتا رہا اور میں بے خبر رہی۔“

”حارث! سلطان چاچو کا بیٹا ہے۔ یہ بات ان کے لئے بھی حیرت انگیز تھی۔

”جی بیٹا۔۔۔۔۔“ بابا نے انہیں حارث کے بارے میں ایک ایک بات بتائی تو سب ہی اشک بار ہو گئے۔

”اس لئے اس کے اندر اتنی گہری ہے۔“ کاشف ہوا۔

”ہوں۔ اگر ظلو اور اس کی بددعا حارث کو نہ سنبھالے تو جانے آج حارث کہاں ہوتا۔“

ہیں، لیکن خون کے رشتے یوں نہیں ٹوٹتے۔“ انکل جانے کب آ گئے تھے اس کے اندر کی فحش محسوس کئے بغیر نہیں رو سکے۔
”انکل! اپنے نصیب میں خون کے رشتے تھے ہی کہاں سارے رشتے طے وہ بھی سوتیلے اور ظاہر ہے سوتیلے رشتوں کا زہر تو رگوں میں اترنا ہی تھا تاں سو مجھے رشتوں ناتوں نے صرف زہر دیا ہے بدگمانی اور نفرت سکھائی ہے پھر آپ بتائیں میرے اندر سے اور کیا نکلے گا سوائے اس کے کہ کسرا کوئی ہے ہی نہیں۔“ اس کا لہجہ بھگ گیا۔
”سوتیلے رشتے۔۔۔۔۔ وہ کچھ اچھے سے بولے۔

”انکل! حارث کی پیدائش کے چھ ماہ بعد ہی اس کے پیا کی ڈچھ ہو گئی تھی اور آئی کو ان کے سرال نے منحوس اور بد نصیب جیسے طعنے دے کر کمرے نکال دیا آئی چھ ماہ کے بچے کو لئے اپنے ماں باپ کے گھر آ گئیں دو سال گزر گئے جیسے جیسے حارث نے ہوش سنبھالا اسے ماموں ممانوں کی آنکھوں میں صرف نفرت ملی وہ چاہتے تھے کہ یہ بچہ مر جائے یا کہیں دفن ہو جائے انہی حالات میں غفرت آئی کا ایک رشتہ آیا اعظم علی کا جن کی پہلی بیوی سے اولاد نہیں تھی سو وہ دوسری شادی کے خواہشمند تھے۔ حارث کے نانا نانی نے رضامندی دے دی اس طرح آئی حارث کو ساتھ لئے وہاں سے اعظم علی کے گھر آ گئیں انہیں لگا شاید ان کے مصوم بیٹے کو یہاں قتل جائے یہ گھرانہ بچوں کو ترسا ہوا تھا مگر ایسا نہ ہوا ان کے مصوم کی یہاں بھی تذلیل تھی اعظم علی کی جب تک اپنی اولاد نہ ہوئی تب تک وہ حارث کو بیدار کرتے تھے مگر پہلے بیٹے کی پیدائش کے بعد حارث ان کے کیا اپنی ماں تک کے بیدار کو ترس گیا اور جیسے جیسے وقت گزرتا رہا حارث کے اندر رشتوں ناتوں سے نفرت پیدا ہوتی گئی حتیٰ کہ آج یہ اپنی نگاہوں سے بھی بدگن ہے۔“ ظلو کی زبانی ساری بات سن کر ان کا دل بھر سا آیا تھا انہوں نے حارث کو کندھوں سے تمام کر اپنے سامنے کیا۔

”آئی ایم سوری بیٹا! شاید تم بھی اپنی جگہ ہو مگر ایک بات بتاؤ۔ تم نے کبھی اپنی ماما سے اپنے گئے رشتوں کے بارے میں جاننے کی سعی نہیں کی؟ تمہارے پیارے بھائی ماں باپ۔“

”کس لئے جاننا انکل۔؟ چھ ماہ کے بچے کو انہوں نے کمرے نکالا تب انہیں خیال تک نہ آیا کہ وہ ان کے مرحوم بیٹے کی نشانی ہے تو میں کیوں اپنے آپ کو حیرت و نفرت دینا انہیں تلاش کر کے اگر میں ان کے پاس چلا بھی جاتا اور وہ بھی میرے ساتھ وہ بھی سلوک کرتے جو میرے سوتیلے رشتوں نے کیا پھر کیا بھرم رہ جاتا میرا۔؟ اب تو دل کو بھر بھی یہ آسرا ہے کہ رشتے سوتیلے تھے کم از کم خود کو کولی تو دیتا ہوں کہ سوتیلے رشتے اپنے نہیں بن سکتے آپ بتائیں انکل! اگر ایسا ہوتا تو پھر میں خود سے کیا کہتا۔؟ میرا تو ہر رشتے سے اعتبار بالکل ہی اٹھ جاتا۔“ کتا بڑا سچ تھا جو وہ کہہ رہا تھا اس کی بات کی گہرائی جان کر وہ چپ سے ہو گئے۔

”کیا نام تھا تمہارے پیارے پاپا کا۔؟“

”سلطان عالم۔۔۔۔۔“ اس کی زبان سے نکلا نام ان کی سماعتوں پر ہم کی طرح گرا تھا وہ بے چینی سے اس کی شکل دیکھ رہے تھے۔

”کیا نام بتایا تم نے۔؟“ شاید انہیں سننے میں غلطی ہوئی ہو۔

”سلطان عالم۔“ حارث نے انکل کو غور سے دیکھا ان کے چہرے کا اثر گنگ دیکھ کر ٹھنکا۔

”خیریت انکل۔۔۔۔۔؟“

”تم سلطان کے بیٹے ہو۔۔۔۔۔؟“ ان کو اب بھی بے چینی تھی حارث سلطان کا بیٹا تھا ان کے چھوٹے بھائی کا بیٹا ان کا اپنا خون تھا وہ۔۔۔۔۔ تب ہی اس کو دیکھ کر ان کو اپنے پرن کا احساس ہوتا تھا پاپا اس کے چہرے میں سلطان کی شبیہ جھلکتی تھی وہ جو اس کی صورت میں ہمیشہ کی کاچر ۳۰ شے تھے آج خود ہی جواب پا گئے تھے ان کی حالت ظلو اور حارث دونوں ہی حیرت روڈ انجسٹ [60] جولائی 2012ء

”تو مجھے لے چل حارش کے پاس۔“ دادی آنسو صاف کرتے ہوئے بولیں۔
 ”اماں! میں نے ابھی حارش سے کوئی بات کی ہی نہیں سچ تو یہ ہے کہ جب میں نے اس کے اندر رشتے ناتوں کی طرف سے اتنی تلخی اور بدگمانی دیکھی تو میری ہمت ہی نہیں ہوئی کہ اس سے کوئی بات کہہ سکوں۔ وہ بھی تو اپنی جگہ بالکل ٹھیک ہے اگر وہ میرے بتانے پر مجھ سے یہ سوال کر لیتا کہ آج تک ہم نے اس کی خبر کیوں نہیں لی تو ہم کیا جواب دیتے اسے؟“
 ”پر بابا! ہمیں تو علم نہیں تھا کہ سلطان چاچو کا بیٹا بھی تھا اور اس میں ہمارا کیا قصور تھا۔“
 ”آپ صحیح کہہ رہے ہو بچے مگر جن حالات سے اس وقت حارش گزر رہا ہے وہ کبھی ہمیں قبول نہیں کرے گا اس وقت تو وہ اپنی سگی ماں سے بھی بدگمان ہے پھر بھلا.....“

”بابا! آپ کو نہیں لگتا کہ اس سارے قصے میں واقعی چچی جان قصور وار ہیں ان کی بے توجہی نے حارش کو بدگمان کیا اگر وہ مضبوطی سے حارش کو تھامے رہتیں تو اس گھر میں اس کی اتنی تزیل نہ ہوتی اور اگر وہ واقعی اس معاملے میں مجبور تھیں تو حارش کو اس کے اپنوں کے بارے میں سچائی بیان کرتیں تاکہ حارش کے دل میں ہمارے لئے کم از کم بدگمانی نہ ہوتی“ آج اگر ہم اس کے پاس جاتے تو ہمیں یہ ڈر نہ ہوتا کہ وہ ہمیں اپنا گایا نہیں حارش ٹھیک کہتا ہے سارا قصور شگفتہ چچی کا ہے۔“ حرمین کی فل فور حارش کے ساتھ تھی۔
 ”بیٹا! ہو سکتا ہے حالات ایسے نہ ہوں کہ شگفتہ حارش کو سب بتا سکتی۔“
 ”بابا! ایسی صورت میں وہ آپ سے رابطہ کر سکتی تھیں احسان چاچو سے رابطہ کر سکتی تھیں وہ حارش کو اسی وقت ہمارے حوالے کر دیتیں تو آج اس کا اعتبار نہ ٹوٹا۔“ کاشف نے بھی حرمین کا ساتھ دیا۔
 ”بھلا ماں کب چاہے گی کہ اس کے کلیجے کا ٹکڑا اس کی نظروں سے دور رہے۔ شگفتہ کب اسے خود سے الگ کرنا چاہتی ہوگی۔“

”اور دادی! اب بھی تو وہ الگ رہ رہی ہیں ناں اب تو ان کا بیٹا ان کو دیکھنا بھی نہیں چاہتا اگر وہ اس وقت کوئی اچھا فیصلہ کر لیتیں تو آج کم از کم حارش کے دل میں ان کے لئے یہ بدگمانی نہ ہوتی۔“ حرمین نے کہا تو وہ خاموش سی ہو گئیں۔ وہ بھی تو کتنے عرصے اپنے بچوں سے دور رہی ترستی رہیں اپنی اولاد کی شکل کو بھی مگر آج وہ اپنے بچوں کے ساتھ ہیں اور ان کے بچوں کے دلوں میں ان کے لئے پیار ہی پیار ہے شاید یہ بس صبر کا پھل ہے کہ وہ اتنے سالوں ان کے لئے ترستی رہیں روٹی رہیں لیکن انہوں نے شوہر کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھایا بس خاموشی سے وقت گزرتی رہیں آخر اللہ نے ان کی سنی اور ان کے بچے ان کے پاس لوٹ آئے سوائے سلطان کے اس کے دنیا کے جانے کی خبر ان تک پہنچی تھی ان کا سب سے لاڈلا اور چھوٹا بیٹا جو صرف پانچ سال کا تھا جب اس کے ابا لے گئے تھے اس دن کے بعد انہوں نے اپنے بیٹے کو نہیں دیکھا اور دیکھا تو سفید کفن میں لپٹا چہرہ اور اس کی ہلکتی تڑپتی بیوہ..... یہ تو انہیں آج علم ہوا کہ سلطان کا بیٹا بھی تھا سوئم سے اگلے دن جب فرمان اور احسان اپنے بھائی کی بیوہ کو لینے گئے تو پتہ چلا کہ اس کے ماں باپ اسے اپنے گھر لے گئے ہیں اور اب انہیں حقیقت پتہ چلی تھی کہ اس ظالم عورت نے جس نے ان سے ان کے بچے چھین لئے تھے اس نے شگفتہ کو گھر سے نکال دیا تھا اگر انہیں علم ہوتا کہ ان کا پوتا بھی ہے تو کہیں نہ کہیں سے اسے ضرور ڈھونڈ نکالتے۔ آج یہ انکشاف سن کر وہ برداشت نہیں کر پار ہی تھیں کہ فوراً جاکر حارش کو گلے لگا لیتیں۔

”فرمان! میں خود حارش سے بات کر لوں گی تو مجھے اس کے پاس لے چل۔“
 ”اماں! پلیز! آپ حوصلہ رکھیں کچھ وقت دیں مجھے انشاء اللہ کوئی نہ کوئی حل تو نکلے گا میں آج احسان سے مل کر بات کرتا ہوں کوئی تو راستہ ہو گا ناں آخر۔“
 ”آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو آپ فوراً کہہ دیا کریں۔“
 ”بڑی مہربانی۔“ وہ چاہتا تھا کہ اب حرمین چلی جائے شاید وہ بھی یہ سمجھ گئی تھی تب ہی فوراً دیوار سے پیچھے ہو گئی اور حارش نے سکھ کا سانس لیا۔ اسے اعتراض حرمین پر نہیں تھا مگر وہ نہیں چاہتا تھا محلے پڑوس کے کسی دوسرے گھر سے کوئی بھی شکایت یا بات سننے کو ملے حالانکہ ایسا پہلی بار ہوا تھا فرمان انکل کے گھر سے کوئی خاتون اس سے مخاطب ہوئی ہو وہ بھی یہ لڑکی کتنے ماہ بیت گئے تھے اس نے آج پہلی بار اس دوشیزہ کو دیکھا تھا درنہ کوئی کام ہوتا کاشف یا فرمان انکل خود ہی آتے تھے۔

”دودن سے انکل نظر نہیں آئے تھے اس دن وہ پپا کا نام سن کر کچھ اپ سیٹ سے بھی ہوئے تھے آخر کیوں.....؟“
 اس کا ذہن پھر الجھنے لگا تو اس نے سر جھٹکا اور اپنی چائے انجوائے کرنے لگا جو بہت مزیدار تھی۔
 ”چائے اتنی زبردست ہے تو یقیناً کھانا بھی میسٹی ہوگا۔“ اس نے دل میں سوچا اور طلحہ کا نمبر ڈائل کرنے لگا تاکہ پتہ

”دودن سے انکل نظر نہیں آئے تھے اس دن وہ پپا کا نام سن کر کچھ اپ سیٹ سے بھی ہوئے تھے آخر کیوں.....؟“
 اس کا ذہن پھر الجھنے لگا تو اس نے سر جھٹکا اور اپنی چائے انجوائے کرنے لگا جو بہت مزیدار تھی۔
 ”چائے اتنی زبردست ہے تو یقیناً کھانا بھی میسٹی ہوگا۔“ اس نے دل میں سوچا اور طلحہ کا نمبر ڈائل کرنے لگا تاکہ پتہ

چلے وہ کہاں ہے۔

”جیتا رہ میرا بچہ۔“ کتنا سکون سلا تھا ان کی گود میں دل بھر آیا تھا مگر اس نے خود کو مضبوط کیا ہوا تھا کتنا وقت وہ اس کے پاس بیٹھے اسے مناتے رہے۔

”حارش! تم بے شک ہمیں اپنا نہ سمجھو مگر تم ہماری اولاد ہو اور بڑے ہونے کے ناتے ہم تمہیں کہہ رہے ہیں ہمارے گھر کے دروازے تمہارے لئے کھلے ہیں تم ہمارے ساتھ رہو ہمارے پاس۔“

”تھینک یو انکل مگر.....“

”آج کے بعد مجھے بابا کہا کرو کاشف کی طرح۔“ انہوں نے درمیان میں ٹوک دیا۔

”در اصل فاصلہ ہی کتنا ہے مجھے کسی بھی چیز کی ضرورت ہوئی تو میں ضرور آؤں گا آپ لوگ پلیز مجھے وہاں جانے پر مجبور مت کریں دادی پلیز..... صرف ایک دیوار کا تو فاصلہ ہے جب آپ بلائیں گی میں آ جاؤں گا لیکن.....“ وہ جانتے تھے اتنی جلدی سب کچھ ٹھیک نہیں ہوگا تو انہوں نے بھی زبردستی نہیں کی۔

”جیسے تو خوش..... بس بیٹا! تیرے دل میں اگر ہمارے لئے کوئی گلہ شکوہ ہے تو بتا دے۔“

”نہیں دادی! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا سب مطمئن تھے اور جب انہیں یقین ہو گیا کہ حارش کے دل میں کوئی شکوہ نہیں رہا تب اٹھ کر گئے تھے ان کے جانے کے بعد اس کے اندر پھر سنائے اترنے لگے طلحہ اس کی کیفیت اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔

”حارش! تو خوش ہے ناں؟“ اس نے کریدا۔

”پتہ نہیں طلحہ.....“ وہ بولا اور طلحہ کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا۔ کتنی دیر خاموشی رہی تھی دونوں کے درمیان طلحہ کو محسوس ہوا کہ وہ رو رہا تھا۔

”حارش۔“ اس نے پکارا مگر جواب نہ دار تھا پھر دوبارہ اس نے بھی نہیں چھیڑا اور خاموشی سے اس کے گھنے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔ حارش بہت مضبوط اعصاب رکھتا تھا یہ وہ جانتا تھا بہت چھوٹا تھا تب سے اس نے دیکھا تھا حارش کو روتے ہوئے اس کے بعد حالات کیسے بھی گزرے وہ کبھی کمزور نہیں پڑا تھا لیکن آج.....

شاید اسی طرح اس کے اندر کا غبار دھل جائے اس کے دل پر جماد گمانی کا غبار اتر جائے اور وہ اعتبار جو کہیں کھو گیا تھا بدگمانی کے صاف ہونے کے بعد شاید دوبارہ لوٹ آئے وہ صرف حارش کے لئے دعا کر سکتا تھا۔

☆.....

وہ صبح اٹھا تو ناشتہ تیار ملا تھا اب تو وہ حرمین کو منع بھی نہیں کر سکتا تھا مگر اسے اب بھی یہ اچھا نہیں لگتا تھا کیونکہ شروع سے ہی اسے اپنے کام خود کرنے کی عادت تھی آفس جانے سے پہلے دادی کا پیغام آ گیا کہ ان سے مل کر جایا کرو اب صبح کسی کے گھر جانا لیکن وہ کسی کا نہیں اس کے سکے تایا کا گھر تھا خیر وہ تیار ہو کر طلحہ کے پاس آیا جو سستی کا مارا اب تک نہانے بھی نہیں گیا تھا۔

”طلحہ! میں ذرا ادھر جا رہا ہوں دادی نے بلوایا ہے۔“ حیرت کی بات تھی اس نے کسی سے گلے شکوے نہیں کئے تھے مگر اتنے سارے رشتے ملنے پر بھی اس کے اندر کی خوشی منقود تھی ہاں وہ خاموش تھا اور ہر بات مان رہا تھا شاید یہ خون کی ہی کشش تھی۔

”طلحہ! تو نے آفس نہیں جانا اب فنافٹ اٹھ کھڑا ہو اور نہ پھر آتے رہنا رکشے سے۔“ یہ دھمکی کافی تھی کیونکہ طلحہ رکشے وغیرہ سے جانے سے بہت چڑتا تھا اور اس کی موٹر سائیکل ایک بار پھر ڈاکٹر کے پاس زیر علاج تھی وہ فوراً اٹھ کر واش روم میں گھس گیا اور حارش مسکراتا ہوا باہر نکل گیا۔

☆.....

میں گھس گیا اور حارش مسکراتا ہوا باہر نکل گیا۔ وہ رات بھر کا شیف نے روزہ کھوا تو سامنے اسے دیکھ کر

☆.....

کتنا عجیب سا ماحول تھا اس وقت اس کے گھر کا اتنے سارے لوگ تھے مگر سناٹا تھا عجیب سی خاموشی تھی ہر نظر اس پر تھی ہر نظر میں پیار تھا اپنا پن تھا مگر کوئی اس سے پوچھتا اس کی کیا حالت تھی اس کے اندر کتنی توڑ پھوڑ تھی۔

”ہم نے آپ کو ایک ایک بات بتا دی ہے آپ ذی شعور ہیں سمجھ دار ہیں خود فیصلہ کریں کہ ہمارا کیا قصور ہے.....؟ ہم قطعی لاعلم تھے اس بات سے کہ سلطان کی کوئی اولاد بھی ہے ورنہ ہم نے جتنے دکھ جھیلے تھے بچے ہم آپ کا بچپن کبھی ان دکھوں میں نہ گزرنے دیتے اب ہمیں پتہ چلا ہے تو ہم آپ کو اپنانے آئے ہیں لینے آئے ہیں آج سے آپ اکیلے نہیں ہیں آپ کے پاس ہر رشتہ ہے سچا اور خون کا انشاء اللہ آپ کو ہر رشتے سے پیار ہی ملے گا۔“

”لیکن اب کیا فائدہ..... اب مجھے ضرورت ہی نہیں رہی میں نے تنہا جینا سیکھ لیا ہے آپ خود بھی یہ بات جانتے ہوں گے کہ رشتے توجہ محبت احساس ان سب کی بچپن میں زیادہ ضرورت ہوتی ہے اور جب میں نے وہ عمر گزاری تو اب تو میں اپنا خیال خود رکھ سکتا ہوں اب مجھے کسی کی ضرورت.....“ وہ یقیناً بہت تلخ ہو رہا تھا طلحہ نے اس کے ہاتھ پر دباؤ دیا تو وہ نہ چاہتے ہوئے سر جھکا گیا اور خاموش ہو گیا۔

”اب تو مجھے سزا دے گا پانچ سال کا تھا میرا سلطان جب تیرے دادا نے میری گود سے اٹھا کر اسے سوتیلی ماں کی گود میں ڈال دیا تھا اور میں عمر بھر ترستی رہی اپنے بچے کو دیکھنے کو اور جب وہ سامنے آیا تو کیسے کفن میں لپٹا خاموش..... میرا کلیجہ پھٹ گیا تھا اور اب جب مجھے تیری صورت میں اپنا سلطان مل گیا ہے تو اب تو میری سزا بڑھا دے میں یوں ہی ترستی تڑپتی قبر میں چلی جاؤں گی۔“ دادی بری طرح رد دیں اس کے دل کو کچھ ہوا ضرور تھا مگر جانے کیوں.....؟ اس کے اندر عجیب سی سرد مہری تھی تمام حالات جاننے کے بعد بھی..... وہ جان گیا تھا کہ اس کے چچا تایا سب بے قصور ہیں مگر شاید حالات نے اس کا اعتبار کہیں کھو دیا تھا وہ چاہے کبھی کسی رشتے پر اعتبار نہیں کر پار ہا تھا بہت سمجھنا چاہتا تھا وہ خود کو لیکن اس کے اندر کی توڑ پھوڑ اس وقت بہت زیادہ تھی کہ اسے اپنے اندر کے شور کے علاوہ کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی لیکن دادی کو اس طرح روتا دیکھ کر وہ کچھ نرم پڑ گیا۔

”میں نے ایسا کچھ نہیں کہا مجھے یقین ہے کہ آپ لوگوں نے جو کہا وہ سچ ہے مگر..... میں.....“ جانے کیوں اس کی آواز اس کے اندر ہی کہیں گھٹ گئی فرمان عالم نے اٹھ کر اسے خود سے بھینچ لیا۔

”کچھ مت بتاؤ بیٹا! ہمیں اچھی طرح اندازہ ہے کہ تم پر اس وقت کیا بیت رہی ہوگی۔ بیٹا ہماری بائیں تمہارے لئے کھلی ہیں تم جب چاہو آ کر سا جانا پر بیٹا تمہیں وقت چاہئے اپنے آپ کو سمجھانے کے لئے منانے کے لئے وہ تمہارا حق ہے تم جتنا ٹائم لینا چاہتے ہو لے لو بس اپنی دادی کے لئے دل میں تھوڑی گنجائش بناؤ۔ ان کی بات پر وہ سر جھکا گیا شاید ان کی بات کا مطلب سمجھ گیا تھا تب ہی اس نے سر ہلایا پھر احسان عالم نے اسے سینے سے لگا کر بہت پیار کیا حتیٰ کہ وہ رو پڑے۔

”ہمیں معاف کر دینا بیٹا! انجانے میں سہی ہم بھی تمہارے قصور وار ہیں کاش ہمیں علم ہو جاتا تو شاید آج ہمارے بچے یہ فاصلہ نہ ہوتے۔“ وہ سمجھ ہی نہیں پار ہا تھا کہ کیا کہے بس خاموشی ہی خاموشی تھی احسان عالم سے مل کر وہ دادی کے قدموں میں آ بیٹھا۔

”آئی ایم سوری دادی میں آپ سے آپ کا بیٹا کبھی نہیں چھینوں گا۔“ اس نے کہا تو دادی نے دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھام کر چوم لیا۔

مسکرا دیا۔ شیک ہینڈ کیا۔

”یہ بات مجھے مت سمجھاؤ دادی سے کہنا اب چل دیر ہو رہی ہے۔“ طلحہ نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔
”پتہ نہیں یہ کب سدھرے گا۔“



کتنا پیار اور اپنا پن تھا اس کے چاروں طرف، لیکن وہ جیسے بالکل ہی بے نیاز بنا ہوا تھا، بقول طلحہ کے حارش عالم اپنے اندر کی انا اور بدگمانی نکال کر دیکھو آنکھیں کھولو تمہارے چاروں طرف رب نے خوشیاں بکھیر دی ہیں مگر اسے تو شاید خوشیوں میں رہنے کی عادت ہی نہیں رہی تھی، لیکن اب اسے شام میں گھر آنا اچھا لگنے لگا تھا، پہلے آتا تو سناٹا استقبال کرتا تھا، مگر اب دادی کی آواز اور حرمین، زمین کی ہنسی، شور اور ان کے ساتھ طلحہ بھی شامل ہو جاتا تو گھر میں اتنی آوازیں رونق بن جاتیں اس کے اندر کا انسان یہ ہی گھر تو چاہتا تھا، آواز، شور، اپنا پن، خیال رکھنے والے بڑے، چھوٹی چھوٹی سی باتوں پر خوش ہونے والے، بہن بھائی، یہ ہنسی مذاق ایک دوسرے کے لئے پیارا، ایک دوسرے کی ضرورت کا دھیان، اور اس کے پاس اب سب کچھ تھا، تو اس کے اندر کا وہ انسان مر چکا تھا، وہ ان کو دیکھ کر خوش محسوس کرتا تھا مگر ان میں گھل مل نہیں سکتا تھا ایک عجیب سا تناؤ اور سرد مہری تھی اس میں، جو سب محسوس کرتے تھے مگر برا نہیں مناتے تھے، اب اسے اپنی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کے لئے بھی پریشان نہیں ہونا پڑتا تھا، ہر کام ہر چیز تیار ملتی۔

طلحہ کتنا اچھا تھا، وہ ان سب لوگوں میں یوں شامل ہو گیا تھا جیسے شروع سے ان کا حصہ ہو، حرمین، حرمین، کاشف سب کے ساتھ گہری دوستی کر لی تھی اس نے، بس وہ ہی کتنا کٹا رہتا تھا۔
اب بھی وہ گھر لوٹا تو سب صحن میں ہی تھے، دادی لیٹی ہوئی تھیں، حرمین، کاشف، طلحہ اور حرمین بیڈ منٹن کھیل رہے تھے، خوب شور کیا ہوا تھا اور دادی ہنگامے سے تنگ ہونے کے بجائے انجوائے کر رہی تھیں، طلحہ اسے دیکھ کر مسکرایا تھا وہ بھی ہلکے سے مسکرا کر اندر آ گیا۔ فریش ہو کر دوبارہ آیا، وہ سب کھیل بند کر چکے تھے اور اب سب آرام سے بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔

”بس تھک گئے.....؟“ وہ طلحہ کے پاس آ کے بیٹھ گیا۔

”نہیں یار! وہ حرمین کا خیال تھا کہ تم تھکے ہوئے آئے ہو اور ہمارے شور سے ڈسٹرب ہو جاؤ گے اور ویسے بھی ہم تمہارے منتظر تھے کہ تم آؤ تو ہمیں بھی چائے نصیب ہو،“ طلحہ ہنستے ہوئے بولا۔
”میں نے کب کہا کہ تم میرا انتظار کرو؟“
”مجھے پتہ ہے تو آدم نیزار ہے مگر حرمین کا خیال تھا کہ تمہارے آنے کے بعد سب مل کر چائے انجوائے کریں گے۔“
اس نے کہا تو حارش اسے گھور کر رہ گیا تھی حرمین سب کے لئے چائے لے آئی ساتھ اسٹیکس وغیرہ بھی تھے۔
”واہ..... اللہ تمہارے جیسی بہن ہر بھائی کو دے۔“ طلحہ نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر عادی وہ مسکرا دی۔

”تھینک یو بھیا۔“ حارش نے غیر ارادی نظر اس پر ڈالی تھی وہ دادی کے برابر میں بیٹھی چائے پی رہی تھی ساتھ ہی طلحہ کی باتوں پر مسکرا رہی تھی، سرخ پرنڈ لان کے سوٹ میں چمکتی دکتی رنگت اور پرکشش نقوش اس لمحے جانے کیوں وہ حارش کو بے پناہ اچھی لگی تھی کہ اس کو خود علم نہ ہوا وہ کب تک اسے دیکھتا رہا، وہ تو حرمین نے اسے دیکھا تو وہ قدرے شرمندہ ہو کر سر جھکا گیا۔

”دادی! میں گھر جا رہی ہوں، کوئی کام ہو تو بلا لیجئے گا۔“ وہ کپ سمیٹ کر کچن میں رکھ آئی تھی اور اب دادی کے سامنے کھڑی تھی۔

”برتن میں آ کے دھولوں گی کھانا تیار ہے۔“ وہ ساری تفصیل بتا رہی تھی طلحہ اور کاشف کے ساتھ باتیں کرتا حارش اس

”تم دروازے پر کیوں کھڑے ہو اندر آ جاتے۔“ بہت اپنائیت سے وہ بولا تو جواباً وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا اور اس کے ساتھ اندر آ گیا، جہاں سب ناشتہ کر رہے تھے۔

”السلام وعلیکم۔“ اس نے قدرے زور سے سلام کیا دادی اسے دیکھ کر بہت خوش ہو گئی تھیں۔

”وعلیکم السلام جیتے رہو خوش رہو۔“ وہ ان کے قریب آ گیا۔

”ادھر میرے پاس آ جا، زمین! بھیا کے لئے ناشتہ لے آئے۔“

”دادی میں ناشتہ کر چکا ہوں۔“ وہ ان کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

”جائے لے لو۔“

”نہیں آنی..... پلیز..... میں ناشتہ کر چکا ہوں۔“ اس نے منع کر دیا، عالیہ سمجھ سکتی تھیں ابھی کچھ وقت لگے گا اس کو گھٹنے ملنے میں وہ مسکرا دیں۔

”جیسے تمہاری مرضی۔“ وہ کچھ دیر بیٹھا مگر بالکل خاموش، ان میں سے کوئی بات کرتا تو جواب دے دیتا ورنہ پھر خاموش۔

”دادی میں چلوں.....؟ آفس جانا ہے۔“

”میرے ساتھ نکل جانا۔“ کاشف نے آفر کی۔

”نہیں یار! وہ طلحہ کو بھی ڈراپ کرتا ہے، اس کی بائیک خراب ہے۔“ اس نے سہولت سے منع کر دیا اور سب کو سلام کرتا واپس گھر آ گیا جہاں طلحہ مکمل تیار بیٹھا چائے پی رہا تھا۔
”چلیں.....؟“

”ہاں میں تیار ہوں۔“ حارش نے خاموشی سے بائیک نکالی، طلحہ دروازہ بند کرتا آ گیا۔
”چابی.....؟“

”یار! تم لے آؤ۔“ حارش بولا وہ فقط اس کی شکل دیکھ کر رہ گیا، ابھی دروازے تک پہنچا تھا تبھی تیزی سے حرمین باہر نکلی۔
”خیریت طلحہ بھیا۔“

”حرمین! یہ چابی اور ہاں شام میں زبردستی سی بریانی ہو جائے تو..... مزہ آ جائے۔“
”ضرور بھیا۔“ وہ مسکراتی ہوئی آگے بڑھ گئی، چابی اس نے اپنے ہینڈ بیگ میں ڈال لی، حارش حیرت سے طلحہ کو دیکھ رہا تھا وہ اس کی فرسٹ کزن تھی لیکن حقیقت یہ تھی وہ اس کا نام تک نہیں جانتا تھا اور طلحہ اس کے ساتھ کتنی اپنائیت سے بات کر رہا تھا۔

”یہ کیا فرمائشی پروگرام چل رہا تھا.....؟“

”یار! دادی اماں نے سختی سے منع کر دیا ہے کہ تم دونوں میں سے کوئی بھی کوکنگ نہیں کرے گا، ظاہر ہے تم ہرگز بھی روز ان کی طرف کھانا پسند نہیں کرو گے اس لئے اس مسئلے کا حل یہ ہی نکلا کہ شام کا کھانا حرمین آ کے بنا دیا کرے گی، صبح میں ناشتہ وہ گھر سے بنا کر بھیج دے گی۔“

”لیکن طلحہ! میں اپنی ذات کی وجہ سے کسی کو تکلیف نہیں دے سکتا، روز وہ بے چاری ہمارے باعث پریشان ہو، جب ایک کام ہم خود کر سکتے ہیں۔“

کی باتوں پر زیادہ دھیان نہیں دے رہا تھا۔

”دادی! صبح میری چھٹی ہے میں صبح کروں گی اب میں جاؤں.....؟“ دادی نے اسے کوئی کام کہا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ وہ بہت انجوائے کرتی یہاں کام کرتے ہوئے مگر حارش کے آنے کے بعد جانے کیوں وہ بھاگنے کی کرتی، اسے لگتا کہ حارش کو ان کا آنا پسند نہیں ہے اور یہ بات وہ شدت سے محسوس کرتی تھی، کتنے دن گزرنے کے بعد بھی حارش کا رویہ ان کے ساتھ بہت روکھا اور سرد سا تھا، یہ بات حرمین عالم محسوس کرتی تھی تب ہی اس کی کوشش ہوتی کہ حارش کے آنے سے قبل وہ کام مکمل کرنے کے حالانکہ طلحہ بھیا کے ساتھ ان کا وقت بہت اچھا گزرتا تھا، وہ بالکل اپنے سکے بھائیوں کی طرح ان میں گھل مل گئے تھے۔

”حرمین بہنا میرا کام کر دیا ہے ناں“ وہ جانے لگی تو طلحہ نے پکار لیا۔

”رات میں کروں گی آپ بے فکر رہیں۔“

”کاشف لگتا ہے حرمین کچھ بھول رہی ہے۔“ طلحہ نے کاشف کو مخاطب کیا، حرمین نے بھی نہ سمجھتے ہوئے کاشف کو دیکھا جو سر ہلار ہا تھا۔

”کیا کاشف بھائی! بتائیں ناں۔“

”رات میں طلحہ سے آنکر کیم کھانی ہے کیونکہ یہ کل تم سے شرط ہار اٹھا، اور تم خود ہی بھول گئیں۔“ اس نے سر پر ہاتھ مارا۔

”جناب اب یاد آ گیا“ میں جلدی جلدی کام ختم کرتی ہوں آپ تیار رہیں، جان نہیں نیچے گی آپ کی۔“

”یار کاشف! وہ اچھا خاصا بھول گئی تھی تم نے لازمی میرا خرچہ کرانا تھا۔“ طلحہ نے کاشف کو گھورا۔

”ابھی سے ڈر گئے آپ بھیا ابھی حنا بھائی کو تو آنے دیں گھر میں پھر دیکھئے گا۔“

”حنا بھائی.....؟“ حارش نے قدرے چونک کر طلحہ کو دیکھا وہ یکدم گڑبڑا گیا۔

”اچھا تم ابھی کام کرو جا کے۔“ اسے پتہ تھا کہ اب اس کی خیر نہیں، کیونکہ حارش اس تمام معاملے سے قطعی انجان تھا۔

وہ طلحہ کو گھورنے میں مصروف تھا جب حرمین اور کاشف باہر نکل گئے۔

”یہ کیا چکر ہے ذرا اور یہ مجھ سے کیا راز داری؟“

”نہیں یار! بس وہ حرمین اور حرمین نے میرے لئے ایک لڑکی پسند کی ہے مجھے بھی اچھی لگی میں نے سوچا، کیا دل توڑوں ان معصوم لڑکیوں کے سو.....“ ان نے بات بعد میں مکمل کی تھی حارش پہلے اس پر حملہ کر چکا تھا۔

☆.....

”بھیا چلیں ناں پلیز..... آپ بہت مزہ آئے گا۔“ حرمین نے اس کا ہاتھ پکڑ کر لاڈ سے کہا مگر وہ اٹھا نہیں، البتہ حرمین خاموش کھڑی تھی، طلحہ نے بھی زور دیا۔ اس کا ایک ہی موقف تھا کہ اس کے سر میں درد ہے سب کے کہنے کے باوجود وہ نہیں مانتا، سو وہ چپ ہو گئے لیکن جب وہ سب باہر نکل رہے تھے تو ایک لمحے کے لئے وہ رک گئی۔

”آپ ہمیں اچھا نہیں سمجھتے ناں اس لئے آپ کو ہمارے ساتھ رہنا بھی پسند نہیں، لیکن اگر آپ ہمارے ساتھ چلتے تو ہمیں بہت اچھا لگتا۔“ وہ کہنے کے بعد اس کے تاثرات دیکھنے کو ٹھہری نہیں فوراً باہر نکل گئی اور حارش بعد میں جانے کیوں خود سے الجھتا رہا، سکون نہ آیا تو آ کے دادی کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا، وہ اسے بے کل ٹھٹھاتا تو دیکھ رہی تھیں اور جب وہ ان کی گود میں سر رکھ کے لیٹا تو جان گئیں کہ وہ کچھ پریشان ہے۔

”حارش نیچے! کیا بات ہے.....؟“ یعنی دادی اس کی بے کلی محسوس کر گئیں تھیں، وہ خود کو اتنا عیاں کر گیا تھا۔

”دادی! کچھ نہیں بس سرد میں درد ہے۔“ اس نے پھر وہ ہی بہانہ بتایا۔

”اچھا..... اٹھ ذرا۔“ دادی نے اسے اٹھایا پھر اٹھ کر تیل لائیں اور اس کے سر کی مالش کرنے لگیں، مالش سے ذہنی سکون ملا تھا مگر دل میں جو بے کلی کی چھائی تھی وہ کم نہ ہوئی اور وہ حد سے سوتا ہوئی۔ جب طلحہ اکیلا لوٹا باقی سب باہر سے گھر چلے گئے، طلحہ بھی جتنا خوش گیا تھا اتنا ہی خاموش لوٹا تھا، اور آتے ہی وہ اپنے بستر پر ڈھیر ہو گیا، چونکہ گرمیاں تھیں اور وہ دونوں صحن میں ہی چار پائیاں ڈال کر سوتے تھے وہ بھی اس کے ساتھ ہی دوسری چار پائی پر آ لیٹا، دادی نماز ادا کر رہی تھیں اس نے دیکھا طلحہ خاموش تھا۔

”طلحہ! تو خفا ہے.....؟“ ظاہر ہے وہ جانتا تھا اسے اچھی طرح۔

”تجھے کیا پرواہ..... تو سو جا آرام سے.....“ یعنی وہ شدید خفا تھا بھی اس کی طرف سے کروٹ بدل لی۔ اس کے اندر کی بالکل شدت اختیار کر گئی، ایک وہ دھان پان سی لڑکی اسے الجھا گئی تھی اور اب طلحہ اتنا شدید خفا ہو گیا تھا بھلا اسے نیند کہاں آتی تھی وہ اٹھ کر طلحہ کی چار پائی پر آ بیٹھا۔

”طلحہ! تو ناراض ہو تو مجھے نیند کب آتی ہے تجھے پتہ تو ہے پھر بھی۔“

”لیکن تجھے اب میری ضرورت کب ہے تجھے تو صرف خود سے پیار ہے آج ٹریٹ میں نے دی تھی میری خاطر بھی تو نہیں گیا ناں۔“ وہ بھی اسی بات پر خفا تھا۔

”طلحہ! میں کیا کروں بہت سمجھاتا ہوں خود کو مگر پھر دل ہے کہ مانتا نہیں، میں سب لوگوں میں بیٹھ کر تمہاری طرح ہنستا بولنا چاہتا ہوں مگر جانے کیا چیز مجھے ایسا نہیں کرنے دیتی۔“

”تمہاری خود ساختہ انا، حارش! جو کچھ بھی تمہارا ماضی رہا ہے اسے اللہ کا امتحان سمجھ کر آنے والی خوشیوں کو دیکھ کر کہو، تم نے خود ہی ان خوشیوں سے خود کو دور رکھا ہوا ہے تجھے پتہ ہے آج تیرے رویہ کی وجہ سے حرمین بہت ہرٹ ہوئی ہے وہ بہت حساس ہے اسے پہلے ہی وہم تھا کہ تیرا رویہ ان کے ساتھ اچھا نہیں اور تو نے وہاں نہ جا کر اس کا بہت دل دکھایا ہے۔“

طلحہ کی باتوں نے اس کا دل اور بے کل سا کر دیا، وہ چپ چاپ اٹھ کر اپنے بستر پر آ لیٹا، مگر ساری رات اسے نیند نہیں آئی

جانے کیوں.....؟ اور صبح جب ناشتہ نرمین نے بنایا تو اسے لگا کہ اس نے اچھا نہیں کیا، وہ بھوکا بنانا شتے کے آفس چلا گیا، یہ بات طلحہ نے نوٹ کی تھی، شام کو اسے یقین تھا کہ ٹیٹھی سی جائے اس کی ساری تھکن اتار دے گی مگر آج چائے میں وہ مزہ

نہیں تھا، پھر کھانا بھی اچھا نہیں لگا، وہ تو اسے بعد میں پتہ چلا کہ آج حرمین نہیں آئی تھی، نرمین نے کھانا بنایا تھا، کئی دن گزر گئے اسے حرمین نظر نہیں آئی تھی تو آج وہ سیدھا شام میں ان کی طرف آیا تھا، وہ بابا کے ساتھ ہی بیٹھی اخبار دیکھ رہی تھی

لیمن لان کے سوٹ میں وہی دکتی رنگت اور پرکشش نقوش لئے، بال کا ندھوں پر کھلے پڑے تھے، خوبصورت سی ہیر کٹنگ

اس پر سوٹ کر رہی تھی اس نے سلام کیا تو وہ چونک گئی بابا اسے دیکھ کر خوش ہو گئے۔

”ارے میرا بیٹا آیا ہے آؤ نیچے بیٹھو۔“ ان کی گرجوٹی اسے شرمندہ سی کر گئی کتنے دن بعد مل رہا تھا وہ ان سے۔

”کیسے ہیں آپ بابا.....؟“ اس کے منہ سے بابا سن کر انہیں بہت اچھا لگا تھا حیرت حرمین کو ہوئی تھی۔

”اچھا ہوں..... حرمین! جاؤ بیٹا اچھی سی چائے لاؤ، حارش آفس سے آیا ہے تھکن اتر جائے گی۔“ اس کے ہاتھ کی

چائے کی وجہ سے تو وہ آیا تھا اس نے فوراً حرمین کو دیکھا، وہ دوپٹہ ٹھیک کرتی اٹھ کر کچن میں چلی گئی۔ وہ بابا کے ساتھ باتوں

میں لگ گیا، ڈورنیل بھی تو بابا اٹھ کر باہر دیکھنے چلے گئے تھے وہ چائے لے آئی، اسے چائے کا کپ تھا کہ وہ باہر کود دیکھنے لگی۔

”بابا کہاں گئے ہیں.....؟“

”باہر شاید کوئی آیا تھا ان سے ملنے۔“

”طبیعت ٹھیک نہیں تھی ریٹ کرنے کو دل چاہ رہا تھا۔“ حرمین نے دیکھا بکھرے بال اور چہرے پر بھی تازگی نہیں تھی شاید وہ صبح سے اٹھا ہی نہیں تھا جینز اور بنیان میں آج واقعی وہ کچھ بیمار سا لگ رہا تھا۔

”پھر میڈیسن لی آپ نے.....؟“

”نہیں دل نہیں چاہا کہ اٹھ کر کچھ کروں سو بس لیٹا رہا۔“ وہ دوبارہ لیٹ چکا تھا حرمین نے دیکھا پھر واپس مڑ گئی۔ کچھ دیر بعد وہ ٹرے میں چائے اور ساتھ ٹیبلٹس لئے حاضر تھی۔

”حارش بھائی! انھیں یہ ٹیبلٹ لے لیں۔“ اس نے ٹرے سینئر ٹیبل پر رکھتے ہوئے اسے آواز دی حارش بمشکل اٹھا تھا اٹھ کر منہ دھو کر آیا پھر اس نے چائے پی اور گولی کھائی۔

”کچھ دیر بعد جب آپ اچھا محسوس کریں تو جا کے دوا لے آئیے گا۔“ وہ اب ہال کی صفائی کر رہی تھی ساتھ اسے ایڈوائز بھی کر رہی تھی ہال کی صفائی کے بعد وہ باہر چلی گئی صحن کی صفائی کی کچن دیکھا پھر اس نے حارش کی طبیعت کے خیال سے اس کے لئے دلیہ بنایا اب صرف طلحہ اور حارش کے کمرے صاف کرنے تھے جو اس نے شام پر چھوڑ دیئے وہ دوبارہ ہال روم میں گئی تو حارش صوفے پر لیٹا پھر سوچا تھا اس نے ڈسٹرب نہیں کیا اور گھر آ گئی اب کو بتایا امی چلی آئیں حارش بے سدھ لیٹا تھا وہ اس کے قریب آ گئیں پیشانی چھوئی تو ہلکا سا بخار تھا ان کے ہاتھ کے کس سے حارش نے فوراً آنکھیں کھول دیں اور سامنے انہیں پا کر اٹھ بیٹھا۔

”تائی امی آپ؟“

”حرمین نے بتایا تمہاری طبیعت خراب ہے دیکھنے چلی آئی۔“

”جی بس کچھ تھکاؤٹ محسوس کر رہا تھا آپ بیٹھیں ناں۔“ وہ اس کے قریب بیٹھ گئیں۔

”بیٹا! اپنا دھیان رکھا کرو تم ضرورت سے زیادہ خود کو مصروف رکھتے ہو تمہاری عمر کے بچے لائف انجوائے کرتے ہیں کچھ وقت اپنے لئے نکالو ہنسو بولو دیکھنا تم خود فریش محسوس کرو گے۔“

”شاید آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔“

”آج شام میں ہم سب تمہارے چاچو کی طرف جا رہے ہیں انہوں نے فون پر تاکید کی تھی تمہیں ضرور ساتھ لائیں تمہارے بابا سویرے جلدی نکل گئے میں نے سوچا تمہیں بتا دوں شام میں ہمارے ساتھ چلنا ہے اب تم اٹھ کر دوا لاؤ حرمین نے تمہارے لئے دلیہ بنادیا ہے وہ کھاؤ اور شام تک فریش ہو جاؤ۔“ وہ صرف سر ہلا کر رہ گیا اب کچھ بہتر محسوس کر رہا تھا سو اٹھ کر نہایا تو اور زیادہ فریش محسوس کرنے لگا۔ بھی حرمین اس کے لئے دلیہ لے آئی۔

”تم نے مجھے پکا مریض بنادیا ہے کچھ اور بنادیتیں۔“ دلیہ دیکھ کر اس کی بھوک اڑ گئی۔

”آپ کو نہیں پسند؟ اچھا کیا کھانا ہے بتائیں؟“ اس نے بہت اپنائیت سے پوچھا حارش اس کے چہرے پر پھیلی

معصومیت اور سادگی میں کھو گیا۔

”بناؤ گی جو میں کہوں گا۔“

”آف کورس بنادوں گی آپ بتائیں تو۔“ اتنی تیز دھوپ گرمی کی شدت میں اسے اچھا نہیں لگا کہ وہ مزید اسے تنگ کرتا۔

”چلو چھوڑو میں یہ ہی کھا لیتا ہوں تم نے بنایا ہے تو یہ بھی مزہ لے کا ہوگا۔“

”آپ مجھے خواہ مخواہ مکھن لگاتے ہیں اتنا اچھا بھی نہیں بناتی میں۔“ اس کی اتنی تعریف پر وہ نجل ہوئی تھی۔

”بلیوی..... مکھن نہیں یہ سچ ہے۔“ اس نے دلیہ چکھتے ہوئے کہا۔ وہ واقعی لذیذ تھا حرمین اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اچھا.....“ وہ بابا کی چائے رکھ کر جانے لگی تو حارش نے پکارا۔

”حرمین! تم خفا ہو.....؟“ حارش کا لہجہ اور رویہ اتنا اچھا بہت حیرت سے مڑ کر اس نے دیکھا وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

”کیوں بھلا.....؟“ وہ مسکرائی۔

”پھر کئی دن سے گھر کیوں نہیں آئیں.....؟“

”بس ویسے ہی.....“ وہ سر جھکا گئی گویا اس نے محسوس کیا تھا۔

”آئی نو..... تم میرے اس رات نہ جانے پر خفا ہو۔“

”حارش بھائی! میں خفا نہیں ہوں بس مجھے لگا کہ آپ کو ہمارا آنا پسند نہیں تو میں نہیں گئی۔“

”ایسا نہیں ہے حرمین! بس مجھے شاید وقت لگے گا خود کو چھینچ کرنے میں ساری عمر تنہا رہا ہوں ناں اب ایک دم اتنا بڑا چھینچ دیکھو..... آئی ایم سونڈی اگر تم میرے رویے سے ہرٹ ہوئی ہو یہ رویہ میری نیچر کا حصہ ہے ارادتا ایسا نہیں کرتا میں ہو سکتا ہے تم لوگوں کے ساتھ رہتے ہوئے میں خود کو بدل سکوں پلیرز آئندہ میری کسی بھی بات کو دل پر مت لینا میری عادت سمجھ کر انکو ردینا پلیرز.....“

”حارش بھائی پلیرز..... آپ کیوں اتنی وضاحتیں دے رہے ہیں میں خفا نہیں ہوں۔“ وہ نجل سی ہو گئی۔

”سچ کہوں تمہارے ہاتھ کی چائے اور کھانے کو مس کر رہا تھا کئی دن سے آئندہ بابا مجھ سے غلطی ہو بھی جائے تو یہ سزا مت دینا صرف تمہارے ہاتھ سے بنی چائے پینے آیا تھا میں تھینک یو سوچ اور مجھے امید ہے صبح مجھے یہی مزیدار چائے ملے گی۔“

”حارش بھائی! آپ بھی بس.....“ جانے کیوں اس کا چہرہ تپش سی محسوس کرنے لگا حارش کے دل کا بوجھ بھی ہلکا ہو گیا بابا آئے تو وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”میں چلتا ہوں۔“ حرمین بابا کے لئے دوسری چائے لے آئی تھی کہ وہ ٹھنڈی ہو چکی تھی۔

”حارش بھائی! کھانا نہیں کھائیں گے.....؟“ اس کے لبوں کی مسکراہٹ سے حارش عالم پر عجیب سی کیفیت چھائی تھی

”جیسے وہ کنٹرول کر گیا۔“ مگر آج مجھے کہیں جانا ہے میں یہ ہی بتانے آیا تھا بابا! میں لینٹ ہو جاؤں گا ہمارے پاس نے پارٹی

”کوئی بات نہیں یہ سب کی زندگی کا حصہ ہے۔“ بابا نے مسکرا کر کہا اس نے ایک بھر پور نگاہ حرمین پر ڈالی اور اللہ حافظ کہتا باہر نکل گیا۔

☆.....☆

بس کی طبیعت اچھی نہیں تھی اس لئے آج آفس کی چھٹی کر لی۔ طلحہ صبح تیار ہو کر جاچکا تھا دادی کل سے احسان چاچو کی طرف گئی تھیں وہ اب تک کسٹمندی سے لیٹا تھا جو اس بات کی تصدیق تھی کہ واقعی وہ اچھا محسوس نہیں کر رہا ورنہ وہ کبھی بھی بے وجہ زیادہ دیر صبح میں نہیں لیٹتا تھا صحن میں دھوپ چڑھی تو اٹھ کر اندر آ گیا ہال روم میں صوفے پر گر گیا جسم میں شدید درد محسوس کر رہا تھا باہر سے آہٹ ہوئی تو وہ اٹھ کر نہیں جاسکا کچھ دیر بعد قدموں کی چاپ اسے اپنے قریب سنائی دی وہ اٹھ بیٹھا حرمین کو دیکھ کر اسے حیرت ہوئی۔

”کالج نہیں گئیں تم.....؟“

”نہیں دل نہیں چاہا مگر آپ آج گھر پر؟ خیریت ہے.....؟“

”حارش بھائی! اگر کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو کہہ دیجئے گا میں چلتی ہوں۔“

”تم بھی جاؤ گی شام میں احسان چاچو کے گھر.....؟“

”آپ چلیں گے؟“ وہ حیران کن خوشی سے بولی۔

”اگر تم جاؤ گی تو.....“ پتہ نہیں حارش کے لیے میں کیا تھا اس کا دل زور سے دھڑکا۔

”میں تو صبح آئی ہوں کل دوا کی کے ساتھ گئی تھی شام میں آپ لوگ جائیے گا۔“

”تو ٹھیک ہے میں بھی پھر کبھی چلا جاؤں گا۔“ حرمین نے دیکھا اس کے چہرے پر سنجیدگی تھی مگر وہ خاموشی سے اٹھ گئی اور شام میں وہ ہی کیا اس نے جو کہا تھا جب اسے پتہ چلا کہ حرمین واقعی ہی نہیں جاری تو منع کر دیا۔

”میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے بابا۔“ کہہ بابا کو رہا تھا دیکھ اسے رہا تھا پہلی بار وہ چاچو کی طرف جارہا تھا اور صرف حرمین کے نہ جانے سے منع کر رہا تھا۔

”بابا! میں بھی چلوں.....؟ اکیلے کیا کروں گی یہاں؟“ اس نے ایک نظر اس ضدی انسان پر ڈالی اور بولی۔

”جیسے آپ کی خوشی آپ نے خود منع کر دیا تھا کہ میں کل تو آئی ہوں۔“ وہ تیار ہونے چلی گئی۔

”بیٹا! احسان کو اچھا لگتا اگر آپ بھی چلتے تو..... اس کے بچے آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔“

”اچھا میں چلتا ہوں.....“ وہ سر جھکا کر بولا لیوں پر آئی مسکراہٹ چھپانے کے لئے اور جب وہ تیار ہو کر آئی تو خود بھی تیار بیٹھا تھا حرمین نے فحشی سے دیکھا اور امی کے پاس آ گئی۔

☆.....☆.....☆

اس کے اندر کے سناٹے ٹوٹنے لگے تھے وہ خوش رہتا تھا بہت خوش اور اس خوشی کی وجہ وہ تھی طلحہ کو اس کا یہ چہنچ بہت اچھا لگتا تھا احسان چاچو کے بچوں سے مل کر اسے مزہ آیا تھا وہ بہن بھائیوں کے لئے ترستا تھا یہاں کتنے بھائی بہنیں تھیں اسے یہ زندگی اچھی لگتی تھی اب اکثر شام میں وہ بھی کاشف طلحہ اور حرمین کے ساتھ بیڈ منٹن کھیلتا کبھی لڈو وغیرہ اور خوب مزے کرتا طلحہ کے ساتھ ساتھ اس کا یہ چہنچ حرمین کو بھی بہت اچھا لگتا تھا کیونکہ جب وہ دل کھول کے ہنستا تھا تو بہت خوبصورت لگتا تھا ہاں وہ بالکل سلطان چاچو کی طرح تھا اور سلطان چاچو بہت خوبصورت تھے سیاہ بڑی بڑی آنکھیں کھڑی یا کب اور سیاہ گھنے بال لمبا قد اور کشادہ سینہ چاچو تو فوجی تھے تب ہی اتنی اچھی ہائیٹ اور جسامت تھی لیکن وہ بھی بالکل ویسا ہی تھا بس اس کے چہرے پر مونچھیں تھیں اور اس کا خیال تھا وہ اس پر سوٹ بھی بہت کرتی تھیں وہ بہت اچھا تھا مگر اس کی باتیں حرمین عالم کا دل اور دھڑکنیں دونوں ہلا دیتیں تھیں اس کی آنکھوں میں جانے کیا تھا کہ وہ اس کی طرف دیکھ بھی نہ پاتی تھی وہ بہت بدل گیا تھا ہاں یہ اچھا تھا مگر وہ کہتا تھا میں صرف تمہاری وجہ سے زندگی کی طرف لوٹا ہوں اس کے معاملے میں حارش کا اتنا کر بڑی ہونا اسے اپ سیٹ کر دیتا تھا۔

☆.....☆.....☆

آج اتوار تھا سب گھر پر تھے صبح سے ہی شور ہنگامہ شروع ہو چکا تھا اور جب فریال، عمر اور عثمان آئے تو اور زیادہ ہو گیا۔ موسم صبح سے ہی اچھا تھا بادل چھائے ہوئے تھے دھوپ کا نام و نشان نہیں تھا ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی وہ لوگ باہر ہی بیٹھے تھے۔

”یار! اتنے اچھے موسم میں اگر پکڑے سو سے ہوں پودینے کی چٹنی ہو تو کیا زبردست لگے گا۔“ عثمان اور طلحہ نے رائے دی۔

”یار! تم لوگ چٹورے بہت ہو مجھ سے آج کو کونگ نہیں ہوتی۔“ حرمین نے پتہ تھا شامت اس کی آئی ہے سو

پہلے ہی منع کر دیا۔

”اف او تم تین لڑکیاں ہول کے بناؤ۔“

”معاف کرو ہمیں اتنے اچھے موسم میں کچن..... او گاڈ۔“ حرمین اور فریال دونوں نے منع کر دیا حرمین موڈ آف کرتی امی کے ساتھ کچن میں ہیلپ کرانے لگی اس نے سب کی فرمائش پوری کر دی تھی مگر اب وہ ان کے ساتھ نہیں تھی اور ظاہر ہے حارش عالم کو اس کی محسوس کیوں نہ ہوتی وہ سب کے ساتھ بیٹھا تھا مگر اس کی بے چینی صرف طلحہ محسوس کر رہا تھا اس نے بغور اس کی طرف دیکھ کر آنکھوں میں پوچھا تو وہ سر ہلا گیا اور کچھ دیر بعد اٹھ کر ٹیرس پر چلا گیا ہلکی ہلکی بوندیں اب تیز ہو گئی تھیں اور نیچے سے آتی آوازیں اسے بتا گئی تھیں کہ وہ بارش انجوائے کر رہے ہیں وہ یوں ہی ادھر ادھر دیکھ رہا تھا کہ دوسری طرف صحن میں اکیلی بارش میں بھکتی حرمین عالم اس کی توجہ کا مرکز بن گئی وہ آسمان کی طرف دیکھتی خود بخود مسکراتی کبھی چہرہ صاف کرتی کبھی بالوں کو جھاڑتی اسے بہت اچھی لگتی تھی اسے تو حرمین عالم ہر حال میں اچھی لگتی تھی بس اس کے جذباتوں نے ابھی اظہار کے لفظ نہیں تلاٹھے تھے ورنہ تو اس کے ہر سو صرف حرمین تھی اسے اپنا ہر کام صرف حرمین کے ہاتھ سے ہونا پسند تھا کھانے سے لے کر کپڑے استری تک وہ صرف حرمین سے کام کہتا تھا اگر کبھی حرمین کوئی کام کر دیتی تو اسے اسی وقت پتہ چل جاتا تھا کہ آج حرمین نے یہ کام نہیں کیا ابھی جب وہ غصے میں گئی تو اسے بہت محسوس ہوا تھا لیکن اب اسے اس طرح مسکراتا بوندوں سے کھیلتا دیکھ کر من شانت ہو گیا تھا وہ بے خود سادہ دیکھے گیا معا حرمین کو خود پر کسی کی نظروں کی پیش محسوس ہوئی تھی نظریں انھیں تو ٹیرس پر کھڑا وہ نظر آیا وہ جلدی جلدی دوپٹہ درست کرنے لگی حارش محسوس کر گیا کہ وہ اس کی موجودگی میں ایزی فیل نہیں کر رہی۔ اپنے وجود میں چھپتی اسے وہ بہت معصوم اور پاکیزہ لگتی تھی وہ فوراً ہیٹ گیارا میں جب سب چلے گئے تو طلحہ اس کے پاس آ لیتا۔

”آج سب انجوائے کر رہے تھے لیکن تو اتنا اپ سیٹ سا کیوں تھا؟“ یعنی اس کی بے چینی طلحہ نے محسوس کی تھی۔

”طلحہ! مجھے خود علم نہیں ہے یہ کیا ہے؟ یہ بے چینی یہ بے کلی کیوں ہے؟ مجھے خود پر اختیار نہیں ہے ایسا کیوں ہے؟“ کتنا کھویا کھویا بول رہا تھا وہ اتنا خوش تھا پھر یہ بے کلی طلحہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

”طلحہ! میں نے عہد کیا تھا خود سے کہ کبھی شادی نہیں کروں گا کبھی محبت بھی نہیں کروں گا لیکن طلحہ اب مجھے لگتا ہے میں اپنے عہد سے مکر گیا ہوں اس کی معصومیت سادگی اس کی ہنسی اس کی تمام اداؤں نے مجھ سے میزاسکون چھین لیا ہے مجھے لگتا ہے کہ اگر ایک بل کو بھی وہ میری نظروں سے اوجھل ہوئی تو میرا دم گھٹنے لگتا تھا مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا میری ہر خوشی اس کے وجود سے وابستہ ہے میرے ہر جذبے میں وہ ہے لیکن میں اس سے صاف لفظوں میں کہہ نہیں پاتا۔“ یہ تبدیلی تو حارش عالم میں سب سے خوبصورت تھی طلحہ کے لیوں پر مسکراہٹ اتری حارش عالم کی آنکھوں میں اترے کسی کے نام کے رنگ اور دیئے وہ محسوس کر رہا تھا اور شاید وہ جانتا بھی تھا کہ وہ کون ہے مگر اس کے لیوں سے سننا تھا۔

”کون ہے وہ.....؟“ طلحہ نے سرگوشی کی تو وہ چونکا اپنی بے خودی میں وہ طلحہ کو راز دے گیا تھا اب چھپاتا بھی تو کیسے۔

”حرمین عالم۔“ اس کے لیوں سے نام ابھرا۔

”تیری چو اس اتنی اچھی ہو سکتی ہے تیرے جیسے پاجی سے امید نہیں تھی۔“ اس نے شرارت سے چھیڑا۔

”طلحہ! میرے دل نے غلط فیصلہ تو نہیں کیا ناں؟“ اس کو کھودینے کا ڈر اسے خوش ہونے نہیں دیتا تھا۔

”دل کے فیصلے غلط نہیں ہوتے تمہیں ڈر کیسا ہے وہ کوئی دور ہے تم سے۔“

”لیکن مجھے اپنی قسمت سے ڈر لگتا ہے آج تک مجھے کوئی خوشی ملی جو نہیں“۔ کتنا وہی ہو رہا تھا وہ لیکن شاید اپنے ماضی کو لے کر وہ ٹھیک ہی تو وہم کر رہا تھا، بھلا اس نے خوشیاں دیکھی ہی کب تھیں، طلحہ نے زندگی میں اسے کھل کر ہنستا بھی اب دیکھا تھا جب اس کی جگہ گالی آنکھوں سے اسے کسی کے نام کے جذبے ابھرتے نظر آئے، حرمین کے لئے وہ کریزی تھا اپنا ہر کام صرف اسے حرمین کے ہاتھ سے انجام پانا پسند تھا لیکن اس کے دل میں حرمین کے لئے اتنی طوفانی محبت ہوگی اس کا اندازہ نہیں تھا طلحہ کو۔

”لیکن مائی ڈیر حارش عالم! اب خوشیوں نے تیرے گھر کا راستہ دیکھ لیا ہے اب انہیں تم تک آنے سے کوئی نہیں روک سکتا اوکے“۔

”طلحہ! وہ میرا پگل پن بن گئی ہے اگر اس نے میری چاہت کے اقرار میں ناں کر دی تو؟“
”کم آن حارش! اچھا سوچا کرو اچھا سوچو گے تو ہر کام خود بخود اچھا ہوگا“ اب سو جاؤ اور اچھے خواب دیکھو“۔ اس کے بال شرارت لئے نکھیرتا مسکراتا وہ اٹھ گیا حارش بھی سونے کے لئے لیٹ گیا۔



”بس مجھے اسی لئے بارش پسند نہیں ہے“۔ وہ خاصے خراب موڈ میں تھا سویرے سویرے حرمین نے بڑے حیران انداز میں دیکھا تھا اسے۔

”بارش پسند نہیں ہے آپ کو؟ بھلا اتنا خوبصورت موسم کیسے ناپسند ہو سکتا ہے کسی کو؟“
”میڈم! تمہارے اس خوبصورت موسم کے باعث میں آفس سے لیٹ ہو رہا ہوں“۔ اس کی بے زاریت چہرے سے عیاں تھی۔

”اب انسان کو اتنا پریکٹیکل بھی نہیں ہونا چاہئے کہ اچھے خاصے موسم سے بیزاریت ہو، آپ اسے انجوائے بھی تو کر سکتے ہیں، کیا ہوا جو ایک دن آفس لیٹ ہو جائیں گے“۔ وہ اسے گھورتا غصہ سے رہا تھا مگر اس کے چہرے کی معصومیت نے سارا غصہ ہوا کر دیا وہ بے خود ہو گیا، کاش وہ اپنے جذبوں کو الفاظ دے پاتا، جانے کوئی چیز تھی جو ہر بار اس کے لبوں پر آتے اقرار کے لفظ روک دیتی تھی۔

”حرمین.....“ اس نے بہت بے خودی میں نام پکارا تھا، وہ خود ہی گڑ بڑا گئی، کاش اس لمحے وہ یہاں سے بھاگ سکتی، اسے حارش عالم کی یہ دیوانگی ڈراتی تھی اس نے لفظوں میں کبھی اقرار نہیں کیا تھا، لیکن اس کی آنکھیں ہر راز خود عیاں کر دیتی تھیں، وہ جان گئی تھی کہ اس کے دل میں کیا ہے.....؟ سارے جذبات اس کے دل کی ہر کہانی اس کی آنکھیں بیان کر دیتی تھیں، لیکن کیا اسے یہ اختیار ہے کہ وہ اس کے جذبوں کی ہمسفر بن سکے.....؟ دل کی سختی اس کی دیوانگی نے اس کے اندر اپنی جگہ بنالی تھی اور اگر آنکھیں کھول کر دماغ کی سنتی تو شاید اپنی زندگی کے فیصلے کا اختیار اس کے پاس نہ تھا، شاید حارش عالم کی خاموشی میں بہتری تھی اس کے جذبے اگر لفظوں میں ڈھل گئے تو بھلا وہ کیسے اور کیا جواب دیتی.....؟

”حارش بھائی! میں چلوں مجھے بابا کو بھی ناشتہ دینا ہے وہ انتظار کر رہے ہوں گے“۔ اس نے فرار کا راستہ اختیار کیا لیکن جب باہر نکلنے سے پہلے ہی اس نے اس کی کلائی تھامی تو دل حلق میں آ گیا۔

”مجھے لگتا ہے تم ڈر رہی ہو مجھ سے“۔ اس کے انداز میں بے خودی کے ساتھ شرارت بھی نمایاں تھی اس نے گہری سانس خارج کر کے ایک نظر حارش عالم کو دیکھا جو بغور اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

”ڈر تو آپ کے اندر بھی ہے“۔ اس کی بات پر حارش کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی تھی اس کی کلائی پر۔

”ہاں ڈرتا ہوں، لیکن تم سے نہیں اپنی قسمت سے“۔

”حارش بھ.....“ بھائی کہنے سے قبل ہی اس نے حرمین کے لبوں پر ہاتھ رکھ دیا، یعنی وہ نہیں چاہتا تھا کہ بھائی کا صیغہ اس کے نام کے ساتھ لگائے۔

”پلیز..... میرا بازو درد کرنے لگا ہے“۔ اس نے التجائیہ انداز میں کہا تو مسکراتے ہوئے اس نے بازو چھوڑ دیا۔
”مجھے کل آفس کی طرف سے اسلام آباد جانا ہے کچھ دن کے لئے اور جانے سے پہلے میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں“۔ وہ اب بہت سنجیدہ تھا۔

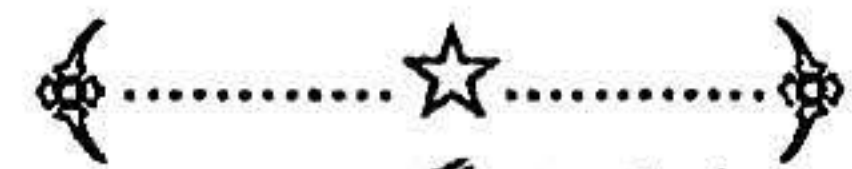
”آپ لیٹ ہو رہے ہیں، بارش بھی رک چکی ہے“۔ اس نے حارش کی بات کے جواب میں غیر سنجیدہ انداز اختیار کیا۔

”حرمین پلیز“۔ اس نے سنجیدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا، اس کی نگاہوں میں کچھ تھا کہ وہ خاموش ہو گئی۔
”حرمین..... آئی.....“

”حارش..... آ جا بارش رک گئی ہے“۔ طلحہ کی آواز اور آمد پر اس کا موڈ بری طرح بگڑا تھا اور وہ پیر پٹختا اک نگاہ اس پر ڈالتا باہر نکل گیا، اس کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ خفا ہو گیا ہے، طلحہ نے اس کا اتنا خطرناک موڈ دیکھا تو پوچھتے بنانہ رہ سکا۔

”یہ تیرے تھوڑے پر بارہ کیوں بچے ہیں صبح“۔
”تجھے بھی اسی وقت مرنا تھا اگر پانچ منٹ لیٹ ہو جاتا تو قیامت آ جاتی ناں“۔ وہ اس پر برس پڑا، طلحہ نے بڑی حیرت سے اسے دیکھا۔

”کیوں کیا ہوا؟“
”کچھ نہیں اور اب بالکل خاموش ہو جاؤ، میرا موڈ بہت خراب ہے“۔ اس نے غصے سے کہا اور بائیک اسٹارٹ کر دی۔



صبح جب وہ اسلام آباد گیا تو امی، بابا سے مل کر گیا تھا مگر اس سے شدید خفا تھا تبھی بھی تو وہ سامنے بھی آئی تو نظر تک نہیں ڈالی، جانے کیوں حرمین کے دل میں اداسی نے ڈیرہ ڈال لیا، وہ اس سے بنا بات کئے ہی جا رہا تھا اس نے ہمت کر کے خود بلالیا۔

”حارش بھائی! چائے لاؤں آپ کے لئے؟“ اس کے مخاطب کرنے پر اس نے خفگی بھری نظر ڈالی۔
”نہیں..... تھینکس..... ناشتہ کر کے آیا ہوں“۔ بہت روکھے لہجے میں جواب دے کر امی، بابا سے خدا حافظ کہتا باہر نکل گیا، وہ بہت بے چین دل لئے سارا دن گھومتی رہی، مگر رات کو جب بستر پر لیٹی تو شدت سے رونا آیا۔

”خفا ہو کر تو نہ جاتے کم از کم“۔ وہ ساری رات نہ سو سکی، اگلی صبح بھی بے کل سی تھی طلحہ اس کا کھویا کھویا انداز دیکھ رہا تھا۔
”خیریت ہے بہنا! بہت افسردہ ہو، کوئی یاد تو نہیں آ رہا؟“ اس کی شرارت پر مسکراتے کے بجائے اس کی آنکھیں نمکین پانیوں سے بھر گئیں۔

”حرمین! تم رو رہی ہو“۔
”طلحہ بھائی! آپ مجھے حارش بھائی کا نمبر دے سکتے ہیں“۔ اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”مجھے نہیں بتاؤ گی کیا بات ہے.....؟“

”وہ مجھ سے خفا ہیں، جاتے دقت بھی شدید خفا تھے۔“
 ”اوہو..... تو وہ تم سے ناراض تھا اور غصہ مجھ غریب پر نکلا مگر کیوں.....؟“ طلحہ نے پوچھا لیکن وہ کیا بتاتی اسے۔
 ”پتہ نہیں.....“ وہ نظریں چراگئی۔ طلحہ نے مزید بحث بھی نہیں کی اور اسے نمردے دیا۔
 ”حرمین ڈیر! ایک بات کہوں؟“ حرمین نے طلحہ کا چہرہ دیکھا جہاں اس لمحے بہت سنجیدگی تھی۔
 ”وہ بہت حساس دل رکھتا ہے اور اس نے اپنی زندگی میں صرف دکھ دیکھے ہیں پلیز خیال رکھنا۔“ شاید وہ مختصر سی بات میں سب کچھ سمجھا گیا تھا اس نے فقط سر ہلایا تھا۔

شام میں اس نے فرصت ملنے ہی اس کے نمبر پر مس نیل کی تھی لیکن اس نے پلٹ کر کوئی رسپانس نہیں دیا تھا۔
 منزلیں بلند ہوں تو مشکلیں بھی آتی ہیں
 مشکلوں سے لڑنے کا حوصلہ تو رکھنے ہیں
 جو تمہارے اپنے ہوں تم سے پیار کرتے ہوں
 ان کا حال کیسا ہے.....؟ کچھ پتا تو رکھتے ہیں
 حارش نے شام میں فرصت ملنے ہی موبائل چیک کیا تھا اور اس کے دل کو سکون مل گیا تھا اس کے لیوں پر مسکراہٹ
 ریگ گئی ساتھ لفظ سوری اسے صاف بتا گیا تھا کہ یہ کس نے سینڈ کیا ہے۔ جواب اس نے کال کی تھی اور وہ جیسے منتظر بیٹھی تھی
 فوراً ہی اینڈ کر لی۔

”اب تک خفا ہیں.....؟“ سلام کے بعد پہلا سوال کیا تھا اس نے۔

”خفا تھا، مگر اب نہیں ہوں۔“ وہ مسکرائی تھی۔

”کب آئیں گے؟ دادی یاد کر رہی تھیں آپ کو۔“

”اور تم.....؟“

”مجھے کیا ضرورت پڑی۔“ اس کے لہجے میں شوخی تھی حارش عالم ہنس دیا۔

”حرمین! ٹھیکس.....“

”کس بات کا.....؟“ اس نے انجان بن کر پوچھا۔

”یہ آ کر بتاؤں گا اور اس بار تمہیں سننا ہوگا ورنہ.....“

”اوکے..... آ تو جائیں۔“

”مس کر رہی ہو مجھے.....؟“ کتنی آس تھی ناں اس کے لہجے میں بھلا وہ کیسے جھوٹ بول سکتی تھی مگر اقرار۔

”بہت زیادہ.....“ کئی لمحوں بعد اس کی سرگوشی ابھری تھی پھر ٹوں، ٹوں کی آواز، مگر اس کے لئے حرمین کا

واب ہی بہت تھا۔

رات میں طلحہ نے دیکھا اس کا موڈ بہت اچھا تھا۔

”لگتا ہے روٹھے پیامان گئے ہیں۔“ وہ کھل کر مسکرائی تھی۔

”ٹھیکس بھیا! نمبر دینے کا۔“ وہ اس لمحے بھی موبائل سے کھیل رہی تھی۔

”حنا کیسی ہے؟ اور کب بات کریں گے آپ دادی سے؟ کتنے دن تو ہو گئے ہیں۔“ اس نے نیانا پک چھیڑ دیا۔

”تم کہتی ہو تو آج ہی کر لیتے ہیں بلکہ..... ابھی۔“ وہ جیسے تیار ہی بیٹھا تھا۔

”چلیں میں بھی فیور کروں گی۔“ اس نے خلوص سے کہا، دادی بھی عشاء کی نماز پڑھ کر آئیں تھیں اور اپنی چار پائی پر

بیٹھیں تب سچ پڑھ رہی تھیں۔ وہ دونوں ان کے پاس آ گئے۔

”دادی! طلحہ بھیا آپ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔“ وہ آتے ہی ان سے لپٹ کر بیٹھی تھی۔ دادی نے انہیں دیکھا۔

”ہاں..... تو بولو نیچے۔“ طلحہ نے حرمین کو گھورا، پھر ہمت باندھی بات تو کرنی تھی ناں۔

”دادی! آپ جانتیں ہیں کہ میرا اب کوئی بزرگ نہیں ہے ان فیکٹ حارش کے بعد اب آپ لوگ ہی ہمارے سب کچھ ہیں۔“

”بیٹا! یہ تو آج کس طرح کی باتیں کر رہا ہے، بھلا تجھے کبھی لگا کہ ہم نے تجھ میں اور حارش میں فرق رکھا ہے۔“

”نہیں دادی! میرا مقصد یہ نہیں تھا، دراصل دادی وہ۔“ وہ بڑی تھیں وہ شوخ و شرارتی ضرور تھا، مگر ان کے سامنے اپنے لئے لڑکی منتخب کرنا اور پوپول کا ذکر اس کی ہمت نہیں ہو رہی تھی حرمین شاید سمجھ گئی تھی۔

”دادی! بات یہ ہے کہ میں نے بلکہ ہم دونوں بہن بھائیوں نے ایک لڑکی پسند کی ہے اور اب یہ آپ لوگوں کی ذمہ داری ہے کہ کب آپ لوگ جا کر اسے طلحہ بھیا کے لئے مانگیں دادی بہت پیاری لڑکی ہے طلحہ بھیا کے ساتھ ہی جاب کرتی ہے پلیز دادی۔“

”اچھا یہ بات ہے تبھی تو اتنا جھجک رہا تھا، بچے میری تو اپنی خواہش ہے جلد سے جلد سارے بچوں کی خوشیاں دیکھ لوں، بھلا زندگی کا کیا بھروسہ ہے سب سے زیادہ فکر تو حارش کی ہے مجھے بچے نے بہت دکھ دیکھے ہیں، فرمان سے بات کروں گی تیری بھی اور حارش کی بھی۔“

”حارش کے لئے کوئی لڑکی دیکھ لی آپ نے؟“ اس نے غیر سنجیدگی سے پوچھا۔

”نہیں..... ہو سکتا ہے اس کی کوئی اپنی پسند ہو اور تجھے تو وہ ہر بات کہتا ہے تجھے تو پتہ ہوگا؟“

”دادی! وہ ایسا نہیں ہے شریف سا بچہ ہے، لیکن اگر اس نے کوئی پسند کر لی تو کیا آپ اس کی شادی کر دیں گے وہاں.....؟“

”ہاں..... میں نے اپنے سلطان کے بہت دکھ دیکھے ہیں اور میں حارش کی دفعہ میں چپ نہیں رہوں گی، اس کی خوشیوں کے لئے تو ہر پل میرے دل سے دعا نکلتی ہے کہ اللہ پاک میرے بچے کو صدا خوشیاں دینا، اس کی حفاظت کرنا۔“ وہ حارش کے لئے اتنی ہی جذباتی تھیں، طلحہ کو اس بات کا یقین سا ہو گیا کہ حارش کی خواہش ضرور پوری ہوگی۔

”دادی! میں آتی ہوں۔“ حرمین اٹھ کر چلی آئی۔

سب کچھ بھول کر اسے صرف یہ یاد تھا کہ حارش عالم کی محبت کے آگے وہ ہار بیٹھی ہے اپنا دل..... اس وقت اسے حقیقت کی بالکل بھی فکر نہ رہی تھی۔ یاد تھا تو صرف اتنا کہ حارش عالم اسے دیوانگی سے بڑھ کر چاہتا ہے اور اس کی یہ دیوانگی جانے کب حرمین عالم پر اثر کر گئی، یہ سچ تھا کہ اس نے بہت کوشش کی خود کو اس محبت کی آگ میں جلنے سے روکنے کی۔ وہ حارش عالم سے اسی لئے ڈرنے لگی تھی بھاگنے لگی تھی، لیکن شاید..... اس کی محبت کی گہرائی میں اثر تھا یا اس کی آنکھوں کی سچائی میں.....؟ جو بھی تھا حارش عالم اپنی تمام تر وجاہت سمیت اس کے دل میں آ بسا تھا، وہ شدتوں سے چاہنے لگی تھی اسے اب اسے صرف اس کی آمد کا انتظار تھا کہ وہ کب آئے گا اور اپنے جذبوں کو لفظوں کا روپ دے گا۔

روشنی فاطمہ

ناولٹ



وہ لائبریری میں آدھے گھنٹے پہلے ہی موجود تھا اک لمحہ اس پر بہت بھاری تھا، صرف کسی کا انتظار ہوتا اور یہ انتظار اب بہت کٹھن لگ رہا تھا گزرتا ہوا اک تو بات الگ ہوتی، مگر یہاں تو اضطراب تھا، خوف بھی

خدشات و ابہام بھی، حالانکہ وہ خود کو سمجھا کر ریلیکس رکھنے کی کوشش کر رہا تھا مگر جیسے ہر کوشش ہی ناکام ہو رہی تھی، کیونکہ خوف و خدشات اس کے ہر جذبے پر حاوی تھے۔
کبھی وہ بیٹھ کر ٹیبل پر رکھی کتابوں کے ورق الٹ پلٹ کرتا تو کبھی اٹھ کر شیف میں لگی کتابوں کو ایسے دیکھتا جیسے اسے کسی کتاب کی تلاش ہو، مگر حقیقت میں وہ الفاظ تلاش کر رہا تھا، لہجہ و انداز کا چناؤ کر رہا تھا، جو اسے سب کچھ کہنے کے لئے درکار تھے، وقت جوں جوں بیت رہا تھا، بے چینی و اضطراب بھی بتدریج بڑھ رہا تھا، پچھلے کئی مہینوں سے وہ اپنے دوستوں سے مشورہ و رائے طلب کرتا رہا تھا کہ اسے اپنی کیفیات کا اظہار کرنا چاہئے یا نہیں؟ مختلف رائے اور مشورے سامنے تھے جن کی روشنی میں وہ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ اسے مزید وقت ضائع نہیں کرنا چاہئے اور سب کچھ اسے ردِ اختر ہمدانی کے گوش گزار کر دینا چاہئے اور آج وہ فیصلہ کر کے آیا تھا کہ جو کچھ اس نے خط میں رقم کیا تھا اپنی زبان سے بھی کہہ ڈالے گا۔
وہ سوچ رہا تھا کہ وہ کیونکر کہہ سکے گا وہ سب کچھ جو اس کے دل کی خواہش تھی، جو اس کی آرزو تھی کیا اظہار



کھڑا رہا۔

”تمہارا اس طرح خاموش رہنا اظفر کی بات کی تصدیق کر رہا ہے کہ تم نے واقعی اقرار جرم کیا ہے۔“ اس کا لہجہ غیر سنجیدہ تھا مگر اس کی یہ بات صائم کے دل پر جا لگی۔

”نمیک کہہ رہے ہو تم لوگ، محبت کا اعتراف کر کے جرم ہی تو کیا ہے میں نے۔“ اس کے چہرے کی از حد سنجیدگی اور لہجے کی نمی کو محسوس کر کے وہ سب یکدم ہی سنجیدہ ہو گئے۔

”اس معاشرے میں محبت جرم ہی تو ہے جہاں وفا، خلوص، ہمدردی، محبت سب کچھ مادہ پرستی کی اس دنیا میں کہیں کھو گیا ہے بے حسی کی نذر ہو گیا ہے سب کچھ۔“ مضحک انداز میں کہہ کر اس نے جوتے کی نوک سے پتھر کو ٹھوکر ماری۔

”محبت جرم ہے اور جرم کی سزا ملتی ہے داد نہیں۔“ وہ بے حد ملول تھا اور رنجیدہ بھی۔ ان تینوں نے تاسف سے اک دوسرے کو دیکھا تھا، اس کے چہرے پر مسکراہٹ کی ہلکی سی رمق بھی نہ تھی، اس کی اس کیفیت کا پس منظر یقیناً کوئی غیر معمولی رد عمل تھا، کچھ دیر تینوں ہی اس بات پر چپ سے رہ گئے کچھ دیر توقف کے بعد دانیال بولا تھا۔

”یار! لو تم اس قدر اداس کیوں ہو رہے ہو اللہ بہتر کرے گا، تم ابھی سے ہار مان گئے ابھی تو عشق کے امتحان اور بھی ہیں۔“

”ہاں! وہ کہتے ہیں ناں یار! ابتداءً عشق ہے روتا ہے کیا آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔“ ارجم نے مزاح کے انداز میں شعر پڑھتے ہوئے دانیال کی بات کو آگے بڑھایا۔

”یار! تم ابھی سے ہمت و حوصلے کا دامن چھوڑ دو گے تو آگے کس طرح وقت کا سامنا کرو گے، ہمت نہ ہار میرے یار حوصلہ رکھ۔“ اظفر نے پیچھے سے آ کر کاندھے پر ہاتھ رکھ کر تسلی آمیز دباؤ والا اس کی بات پر

اس نے لمبی سانس کھینچی۔

”اب کچھ باقی نہیں بچا اظفر۔“

”یہ کیا کہہ رہا ہے تو.....؟“ ارجم نے تڑپ کر کہا۔

”ابھی بہت کچھ باقی ہے نا امید کیوں.....؟“

دانیال نے متاسف ہو کر اس کے چہرے کو دیکھا جہاں ملال و شکستگی کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔

”جب کوئی مسافر لمبی مسافت طے کر کے منزل تک نہ پہنچ پائے اور بندگی اس کا مقدر ٹھہرے تو امید باقی نہیں رہتی۔ تھک جاتا ہے انسان، اعصاب شل ہو جاتے ہیں، جسم بھی تھک جاتا ہے اور..... روح بھی۔“ اس کا لہجہ بہت رنجور تھا اک اک لفظ یاسیت کی گہرائیوں میں ڈوبا ہوا۔

”اتنی ناامیدی اچھی نہیں ہوتی صائم! مایوسی کفر ہے، تو کیوں اتنی جلدی شکست کھا گیا تو ایسا تو نہیں تھا۔“ اظفر نے مایوسی سے اس کے آزرہ چہرے کو دیکھا۔

”ہاں میں ایسا نہیں تھا۔“ اس کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔

”اچھا ہوا کیا یہ تو بتا.....؟“ ارجم نزدیک آ کر بولا۔ ”میری کیفیت جان لینے کے بعد بھی تمہیں اشتیاق ہے اس بات کا.....؟“ اس کی نم ہوتی آواز سن کر وہ شرمندہ ہو گیا کہ واقعی اسے ایسا سوال نہیں کرنا چاہئے تھا۔

”یار! بڑی بھوک لگ رہی ہے چل کر کچھ کھاتے ہیں۔“ اظفر نے ماحول کی سنجیدگی کو دیکھتے ہوئے انہیں موضوع سے ہٹانے اور صائم کا دھیان بٹانے کی کوشش کی۔ ارجم نے تائید کی تو دانیال زبردستی صائم کو کھینچتے ہوئے ان دونوں کے پیچھے چل دیا۔

☆.....☆

”اماں! پلیز آپ انہیں منع کر دیں۔“ پچھلے دو دن سے وہ فاطمہ کو قائل کرنے کی کوشش کر رہی تھیں، مگر ہر بار اس کا جواب نفی میں ملتا اور آج بھی وہ اسے راضی کرنا

چاہ رہی تھیں۔

”بیٹی! سمجھا کرو، تمہاری خالہ کے کوئی جاننے والے لوگ ہیں بتا رہی تھیں بہت عرصے سے انہیں جانتی ہیں اچھا خاندان ہے دیکھے بھالے لوگ ہیں اور.....“

”اماں پلیز! میں بار بار کی اس نمائش سے تنگ آ چکی ہوں۔“ فاطمہ کے لہجے سے بے زاری نمایاں تھی۔ ”بیٹی! کیا کریں یہ وقت کا تقاضہ ہے ایسا تو کرنا پڑتا ہے انسان مجبور ہو تو نہ چاہتے ہوئے بھی وہ کام کرنے پڑتے ہیں جو وہ نہیں کرنا چاہتا۔“ اک مجبور ماں کی بے بسی بول رہی تھی وہ ان کے چہرے سے لہجے سے ان کی بے چارگی کو محسوس کر سکتی تھی مگر ان سے کہیں زیادہ وہ پریشان تھی۔

”مگر اماں! میں اب مزید ناگوار رویے اور مغرور آنکھوں کو برداشت نہیں کر سکتی۔“ انداز التجائیہ تھا آنکھوں میں نمی تھی۔

”معاشرے کے دستور ہی ایسے ہیں کہ.....“ اماں نے مزید کچھ کہنا چاہا مگر اس کے چہرے پر پھیلنے والی اداسی و مایوسی نے ان کے لبوں کو چپ کر دیا۔ وہ بھی کیا کرتیں، بیٹی کی عمر ڈھلتی جا رہی تھی، گزرتا ہوا وقت انہیں خدشات و واہیات میں مبتلا کر رہا تھا، اس کے رشتے کے لئے آنے والے لوگ یا تو اس کی بڑھتی ہوئی عمر کو جواز بنا کر انکار کر جاتے یا پھر اس کی اعلیٰ تعلیم اس کی قسمت کے کھلنے والے در کو تالا لگا دیتی۔

”ٹھیک ہے اماں.....“ اس نے اماں کے ماتھے پر ابھرنے والی شکنیں دیکھ کر حامی تو بھری تھی مگر اسے قطعاً کوئی آس نہیں تھی ہر بار کے انکار نے اس کی تمام امیدوں کو توڑ ڈالا تھا، ہر آنے والے لوگوں کو یا تو 16 سال کی کم عمر چاند چہرہ ستارہ آنکھوں والی دو شیزہ کی تلاش ہوتی جس کا خوبصورتی کے ساتھ ساتھ سلیقہ شعار، گھڑ، نیک ہونا اس کی لازمی خوبیاں تھیں۔ ان سب کے بغیر وہ ان کے معیار پر پورا نہیں اتر سکتی تھی

ایسے لوگوں کی نگاہ میں 33 سالہ فاطمہ بھلا کیسے جیتی بڑھتی عمر کے ساتھ جس کا عام صورت ہونا قابل گرفت تھا اور مستزاد اس کی ایم ایس سی کی ڈگری سونے پر سہاگہ ہی تو تھی۔

ہر بار کے ٹھکرائے جانے کے احساس نے اسے از حد مایوس کر دیا تھا اپنی ذات کی بے قدری کی تکلیف وہ بار بار سہہ چکی تھی اس میں اب مزید اپنی بے توقیری بے مائیگی برداشت کرنے کا یا رانہ تھا مگر اماں سے رضا مند ہونے کے بعد وہ آنے والے کل کے لئے خود کو ذہنی طور پر تیار کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

☆.....☆

”کیا بات ہے صائم! طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری.....؟“ فاطمہ کہتے ہوئے اندر آئی۔

”صائم!“ اس کی آواز پر اس کے وجود میں کوئی حرکت نہ ہوئی تو وہ آوازیں دینے لگی۔

”اٹھو صائم کیا بات ہے طبیعت تو ٹھیک ہے؟“ اس نے پریشان ہو کر سوچ کی طرف ہاتھ بڑھایا اور لائٹ آن کر دی۔

”آپا..... پلیز لائٹ آف رہنے دیں۔“ صائم نے بے چینی سے کروٹ لی وہ اس کی بات کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اس کے بیڈ کے قریب آئیں۔

”اماں بتا رہی تھیں تم چار دن سے کالج نہیں گئے اور آج کل ٹیوشن بھی نہیں لے رہے، طبیعت خراب ہے تمہاری یا پھر کوئی اور مسئلہ ہے۔“ صائم اٹھ بیٹھا تو اک تشویش بھری نگاہ انہوں نے اس پر ڈالی، ان کی نگاہوں سے الجھ کر وہ بول اٹھا۔

”کچھ نہیں ہوا مجھے، بس یوں ہی کالج نہیں جا رہا، ارجم اور دانیال لاہور گئے ہوئے ہیں تو میں کیا کروں گا کالج جا کر.....“

”اور ٹیوشن کیوں نہیں لے رہے.....؟“ بدستور نگاہیں اس پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

”ٹیوشن وہ اس..... لئے۔“ اس کی سمجھ نہ آیا کیا

بہانہ بنائے۔

”صائم.....“ فاطمہ نے گہری نگاہوں سے اسے دیکھا چہرے پر غیر معمولی تاثرات اسے ٹھکنے پر مجبور کر گئے۔

”کیا بات ہے صائم! مجھے نہیں بتاؤ گے.....؟“ اس نے نرمی سے پوچھا اور وہ جزبہ ہو کر رہ گیا اب وہ کیسے بتاتا کہ وہ کیوں اتنا آزرده ہے اسے گہری سوچ میں مستغرق دیکھ کر اور اس کے چہرے پر آتے جاتے رنگوں سے اس نے کافی حد تک اندازہ لگالیا تھا کہ بات کس نوعیت کی ہے کچھ دیریوں ہی خاموشی سے گزر گئے۔ پھر کھوئے کھوئے لہجے میں صائم نے لب کھولے۔

”آپا! اک بات بتائیں کوئی شخص کسی منزل کی جانب سفر کرنے بہت لمبی مسافت طے کر لے اور جب.....“ فاطمہ بہت تعجب سے اس کی بات سن رہی تھی یاسیت کا عنصر اس کے لہجے میں نمایاں تھا۔

”اس منزل کی جانب پہنچنے والا ہو تو اسے معلوم ہو کہ یہ اس کی اصل منزل ہی نہیں تو پھر اس انسان کو کیا کرنا چاہئے.....؟“ فاطمہ نے اس کے لہجے میں موجود نمی اور درد کو محسوس کر کے اندازہ لگالیا تھا کہ وہ کس پریشانی میں مبتلا ہے۔

”تو پھر اس شخص کو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ اس نے اسے سفر کی مزید تکان سے بچالیا۔“ اس کے رسائیت سے کہنے پر صائم نے متعجب ہو کر دیکھا۔

”مگر وہ پچھتاوا اور دکھ جو اس سفر کے رائیگاں ہو جانے کا ہے وہ کیسے ذہن سے محو ہو سکتا ہے.....؟“

”پچھتاوا اور دکھ اسی صورت میں ذہن سے محو ہو سکتا ہے جب اس سفر کو رائیگاں نہ سمجھا جائے بلکہ آئندہ زندگی میں اس سے سبق لے کیونکہ زندگی کا سفر بہت طویل ہے کئی اتفاقات حادثے رونما ہوتے ہیں کیا زندگی منجمد ہو جاتی ہے.....؟“ اس نے رک کر اس کے اداس چہرے کو دیکھ کر سوال کیا۔

”نہیں نا وقت گزرتا جاتا ہے لیکن اگر ہم زندگی کی کسی ایک ناکامی پر مایوس ہو جائیں اور تھک کر بیٹھ جائیں تو زندگی کو کیسے گزاریں گے؟ مثبت سوچ کو اپنا کر اپنی پچھلی اور گزری ہوئی زندگی کو یاد رکھیں تو آگے کا سفر آسان ہو جاتا ہے ہمیں یہ نہیں سوچنا چاہئے کہ ہم نے گزرا ہوا وقت رائیگاں کر دیا کوئی سفر رائیگاں نہیں ہوتا اور ہر غلطی صرف پچھتاوا نہیں دیتی بلکہ ہمیں آئندہ کے لئے محتاط کر دیتی ہے غلطی ہمیشہ کچھ نہ کچھ سبق دیتی ہے بس یہ بات یاد رکھنی چاہئے ہمیشہ۔“ وہ اسے کسی نیچر کی طرح سمجھا رہی تھی جیسے وہ اک نادان سا بچہ ہو اور وہ واقعی اس کے لئے چھوٹا بچہ ہی تو تھا زمانے کی اونچ نیچ سے ناواقف زندگی کے اسرار و رموز سے نا آشنا۔

☆.....☆.....☆

”آج تمہاری چچی آرہی ہیں۔“ صائم کہیں جانے کی تیاری کر رہا تھا تب ہی اماں چلی آئیں پتہ نہیں وہ خاص طور پر اسے کیوں بتا رہی تھیں۔

”اچھا.....“ اس نے سرسری سے انداز میں جواب دیا۔

”تم کہاں جا رہے ہو.....؟ آج گھر پر ہی رکو۔“ اسے شوز پہننے دیکھ کر وہ بہ غلت بولیں۔

”چچی تو آتی رہتی ہیں میرا موجود ہونا اتنا ضروری بھی نہیں ہے۔“ وہ اٹھ کر کھڑا ہوا۔

”بیٹا! دو گھڑی رکو تو سہی۔“ اس کے ساتھ وہ بھی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”اماں! مجھے دیر ہو رہی ہے۔“ وہ بہ غلت آگے بڑھا۔

”میری پوری بات تو سن لو بیٹا!“ وہ پیچھے آئیں۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ بات کرنے کا یہ موقع گنوا دیں۔

”جی بولیں اماں.....“ وہ رک کر پلٹا۔

”تمہاری چچی چاہ رہی ہیں کہ عائشہ کے لئے تم.....“ اس کو از حد تعجب ہوتا دیکھ کر ان کی آدھی بات

منہ میں ہی رہ گئی۔

کیا کہے وہ؟ کیسا رد عمل ظاہر کرے اسے سمجھ ہی نہیں آیا تھا کیونکہ یہ بات اس کے لئے انکشاف سے کم نہ تھی۔

”تمہاری چچی عائشہ اور تمہاری بات طے کرنا چاہ رہی ہیں تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں.....؟“ اماں تو گویا ہتھیلی پر سرسوں جمانا چاہ رہی تھیں۔

”اماں پلیز یہ معاملات ایسے نہیں کہ میں آج ہی اس کا فیصلہ کر لوں۔“ اس کے اس طرح کے رد عمل پر اماں خاصی مایوس سی ہو گئیں تب ہی وہ فوراً بولا۔

”اماں! میں نے عائشہ کے لئے کبھی اس طرح نہیں سوچا۔“

”تو اب سوچ لو نا بیٹا! وہ بہت اچھی لڑکی ہے سلیقہ مند گھریلو اور.....“ اماں نے اس کی قصیدہ خوانی شروع کر دی۔ اماں کا از حد اصرار اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا یوں اچانک سے انہیں اس کے رشتے کا خیال کیسے آ گیا تھا۔

”اماں پلیز! میں ابھی اس پوزیشن میں نہیں ہوں کہ.....“ وہ الجھ سا گیا تھا۔

”میں ابھی تمہاری منگنی کرنا چاہ رہی ہوں شادی نہیں۔“ اماں اس کے انکار پر تپ کر بولیں۔

”آپ سمجھ نہیں رہیں اماں.....“ وہ زچ ہو گیا۔

”کیا سمجھانا چاہ رہے ہو تم.....؟ میری تو سمجھ میں نہیں آ رہا آخر تم اتنے خائف کیوں ہو رہے ہو۔“ وہ ناراض ہو گئیں۔

”اماں! میں کیسے سمجھاؤں آپ کو؟ وہ بے زار سا جب ہو گیا ادھر اماں ناراضی میں خاموش ہو گئیں اماں کی جھنجھکی کو بھانپ کر وہ ان کے قریب آیا۔

”اماں!“ اس نے لاڈ سے کہہ کر دونوں بازوؤں کو تھام لیا۔

”میں نہیں چاہتا کہ آپ سے پہلے میرا رشتہ طے ہو یا منگنی ہو میری اولین خواہش یہ ہے کہ پہلے آپ کا رشتہ

طے ہو جائے۔“

”تو ٹھیک کہہ رہا ہے یہی بات ہے.....؟“ انہوں نے مشکوک نگاہوں سے اسے دیکھا۔

”سچ اماں! یہی بات ہے بس۔“ اس نے بھرپور یقین دلانے کی کوشش کی۔

”کہتا تو ٹھیک ہے بیٹا!“ وہ قائل ہوتے ہوئے بولیں۔

”اب میں جاؤں اماں.....؟“ وہ اجازت طلب کرنے لگا۔

”ہاں بالکل بیٹا!“ پر سوچ لہجے میں وہ بولیں تھیں۔ اسے تھوڑا افسوس ہوا اس نے انہیں پھر اسی سوچ میں ڈال دیا تھا جس کی وجہ سے وہ ہر وقت ہی پریشان رہتی تھیں۔

”اماں پلیز! آپ پریشان نہ ہوں فاطمہ آپا کے لئے اللہ بہتر کرے گا انشاء اللہ۔“ اس نے ان کے کاندھوں پر ہاتھ رکھا۔

”معلوم نہیں بیٹا کب کھلے گا میری فاطمہ کا نصیب۔“ ان کے لہجے کی یاسیت اور بے بسی پر اس کا دل کٹ کر رہ گیا۔

”مایوسی اللہ کو پسند نہیں بس آپ دعا کیا کریں ماں کی دعا اللہ تعالیٰ کبھی رد نہیں کرتا۔“ اس کے کہنے پر جبراً انہوں نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

☆.....☆.....☆

ایک ہفتہ یوں ہی گزر گیا اماں نے اس ایک ہفتے میں رشتے کی بابت کوئی ذکر نہ کیا۔ مگر اس دن وہ میوش دے کر واپس لوٹا چچی کے ہمراہ عائشہ کی موجودگی اسے الجھن میں مبتلا کر گئی۔

”السلام علیکم۔“ وہ سلام کر کے اندر جانے کو تھا۔

”کبھی ہمیں بھی ٹائم دے دیا کرو ہر وقت ہوا کے گھوڑے پر سوار رہتے ہو۔“ چچی جان کے شکوے پر وہ شرمسار ہو کر دھیمے قدموں سے چلتا ہوا ان کی جانب چلا آیا۔

☆.....☆.....☆

☆.....☆.....☆

☆.....☆.....☆

”ایسی تو کوئی بات نہیں چچی جان“۔ وہ ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہیں اور ہر بات میں اس کی تائید اور رائے لینا وہ ضروری سمجھتیں وہ جتنا زیادہ ان سے کترا رہا تھا اسی قدر اسے ان کے ساتھ وقت بتانا پڑ رہا تھا ہوں ہاں کے سوا وہ کبھی کیا سکتا تھا اس کی عدم دلچسپی اماں کو کھل رہی تھی مگر یہ بھی صائم کا احسان تھا کہ وہ چچی جان کے کہنے پر وہاں بیٹھنے پر رضامند تو ہو گیا تھا عائشہ کے چہرے سے نمایاں ہوتی خوشی چیخ چیخ کر اسے یہ بتا رہی تھی کہ اس کی موجودگی عائشہ کے لئے باعث مسرت ہے اس کا جھینپا جھینپا انداز صائم کو بہت عجیب محسوس ہو رہا تھا۔

”آپ لوگ باتیں کریں میں فریش ہو کر آتا ہوں“۔ بالآخر اس نے وہاں سے اٹھنے کا بہانہ ڈھونڈ ہی نکالا چچی اور عائشہ کو اس کا اس طرح سے حیلے بہانے سے فرار ہونا بہت کھٹکا تھا۔ ان کے چلے جانے کے بعد ہی وہ نیچے آیا تھا۔

”اماں! ایک کپ چائے ملے گی“۔ دونوں ہاتھوں سے گردن کو دو باتے ہوئے اس نے فرمائش کی گردن کو دائیں بائیں گھمانا گویا تھکن کا اظہار تھا۔

”میں لاتی ہوں چائے“۔ اس سے قبل کے اماں اٹھتیں فاطمہ کہتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”پھر کیا سوچا ہے تم نے.....؟“ فاطمہ کے چلے جانے کے بعد وہ فوراً اپنے پسندیدہ موضوع کی جانب آئیں وہ خاموش رہا گویا اس نے سنا ہی نہ ہو پاس پڑا ریموٹ اٹھا کر چینل سرچ کرنے لگا اماں کی نگاہوں کا ارتکاز اسے جزیرہ کر رہا تھا۔

”میں نے تم سے کچھ پوچھا ہے بیٹا.....؟“ انہوں نے تھوڑا سخت لہجہ اختیار کیا۔

”اماں! میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ.....“ وہ دوبارہ بات دہرائی نہیں چاہتا تھا۔

”جانتی ہوں میں مگر تمہاری چچی تمہارا فیصلہ جاننا چاہتی ہیں“۔

”اماں! پلیز اس فیصلے میں اتنی جلدی نہ کریں ابھی“۔

”میں نے بھی یہ بات سارہ کو بتائی تھی کہ تم جب تک اس رشتے کے لئے رضامند نہیں ہو گے جب تک کہ فاطمہ اپنے گھر کی نہیں ہو جاتی“۔

”پھر.....؟“ سوالیہ نگاہیں جواب سننے کی منتظر تھیں۔

”وہ اس بات پر راضی ہے وہ آج اسی خاص مقصد کے لئے آئی تھیں“۔

اس کا دل زور سے دھڑکا کہیں وہ اس کی مٹگنی کا دن تو طے نہیں کر گئیں اس خیال نے اس کے رونگٹے کھڑے کر دیئے۔

”فاطمہ کے لئے ایک رشتہ بتا رہی تھیں ان کی کوئی جاننے والی خاتون ہیں اپنا نام سن کر چائے لاتی فاطمہ کے قدم دروازے کی دہلیز پر ہی رک گئے صائم کے سانس بحال ہوئے کہ اس نے شکر ادا کیا کہ فی الوقت ایسا کچھ نہیں تھا جیسا وہ سوچ رہا تھا۔ پھر اک نیا امتحان پھر نمائش پھر رد کئے جانے کا تکلیف دہ احساس..... فاطمہ کے ذہن و دل میں پھر یہ باتیں گردش کرنے لگی تھیں۔

”یہ تو اچھی بات ہے اماں آپ کو جو دن مناسب لگے بلا لیں نہیں“۔ صائم کی آواز سماعت سے ٹکرائی۔

”ہاں بیٹا! میں جلدی بلا لوں گی نہیں“۔

”مگر بیٹا! فاطمہ.....“ وہ اس بار بہت دکھ کا شکار تھیں۔ یہ بات انہیں معلوم تھی کہ اس بار فاطمہ کو قائل کرنا ناممکن کی حد تک مشکل تھا۔

”مجھ میں ہمت نہیں بیٹا کہ فاطمہ سے بات بھی کروں اس بارے میں“۔ ان کے لہجے میں یاسیت اتر آئی تھی۔ فاطمہ کا اپنی ماں کی بے چارگی پر دل بھرا آؤ وہ مزید کچھ نہ سن سکی وہاں سے واپس کچن کی جانب مڑ گئی۔

”آپ فکر نہ کریں اماں! میں کوشش کروں گا فاطمہ آپ کو راضی کرنے کی“۔ صائم نے ساتھ بیٹھی ماں کے

ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔

”وہ مان جائے گی تا بیٹا.....؟“ ان کی آس بھری نگاہوں میں ان گنت اندیشے تھے جن کو وہ بخوبی سمجھ رہا تھا۔

”ہاں اماں! کیوں نہیں آپ دعا کریں کہ اس بار آپ کی قسمت کھل جائے“۔

”ہاں کیوں نہیں بیٹا! انشاء اللہ میری بیٹی اپنے گھر کی ہو جائے گی جلد“۔ وہ بے حد معصومانہ انداز میں بہ عجلت بولیں تو دکھ کی اک لہر اس کے پورے وجود میں دوڑ گئی ان کی خواہش فطری تھی پر قسمت نامہربان تھی یا معاشرے کے لوگوں کے ذہنوں میں پنپنے والے وہ معیار تھے جو اماں کی اس خواہش کو پورا ہونے ہی نہ دے رہے تھے وہ سوچ کر رہ گیا۔

☆.....☆.....☆

بے وقعتی کا احساس رگ و پے میں سرایت کر جائے تو نس نس تکلیف میں مبتلا ہو جاتی ہے روا اختر ہمدانی کے تلخ اور حقارت آمیز لہجے میں کہے گئے جیلے آج بھی اس کی سماعتوں میں گونجتے تھے وجہ کوئی بھی تھی بہر حال اسے رجیکٹ کیا گیا تھا اور رد کئے جانے کی تکلیف آٹھ ماہ ہو جانے کے باوجود بھی کم نہ ہوئی تھی اب تو اسے فاطمہ کے دل پر بننے والے دکھ کا اندازہ لگانا مشکل نہ تھا فاطمہ واقعی بہت بہادر تھی جو ہر بار اپنی بے وقعتی کے درد اور اسی خوف و اندیشے کے ساتھ والدین کی رضا کی خاطر اس تکلیف کو سہنے کے لئے ہر بار تیار ہو جاتی تھی۔ صائم کو بہت ہمت درکار تھی اس بارے میں بات کرنے کے لئے وہ آج آفس بھی نہیں گئی تھی صبح سے چپ چاپ تھی اور اس کی یہ ہی خاموشی تو اسے خوف زدہ کئے دے رہی تھی وہ نہ جانے اس بات پر کیسا رد عمل ظاہر کرے بس یہ ہی سوچ کر وہ بہت ہچکچا رہا تھا مگر بہر طور پر بات تو کرنا ہی تھی۔

ڈرتے ڈرتے ادھ کھلے دروازے کو ناک کرتے ہوئے وہ اندر آیا فاطمہ ہاتھ میں پین اور ڈائری پکڑے

تعب سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”صائم تم.....؟“ اس طرح سے باقاعدہ وہ کبھی اس سے بات کرنے کی ضرورت پیش ہی نہ آئی تھی۔

”سوری.....“ میں نے آپ کو ڈسٹرب کیا“۔ وہ بے حد کنفیوژ تھا۔

”ارے! تم تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے میں کوئی بہت بڑی آفیسر ہوں“۔ وہ مسکرائی تو کچھ اس کی بھی ہمت بندھی۔

”مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے“۔ وہ اس کے سامنے بیڈ پر بیٹھ گیا۔

”ہاں بولو.....؟“ وہ بھرپور طریقے سے اس کی جانب متوجہ تھی۔

”مجھے آپ کی کیفیات کا بخوبی اندازہ ہے آپا۔ اس معاشرے کی سوچ ہے اور معاشرے میں ان گنت برائیاں ہیں مگر ہمیں انہیں بھگتنا بھی پڑتا ہے اور سہنا بھی کیونکہ یہ ہماری مجبوری ہے“۔ اس کی تمہید سے وہ جان گئی تھی کہ وہ اس سے کس سلسلے میں بات کرنے کے لئے آیا ہے۔

”میں آپ کو ہرگز پریشان نہ کرتا مگر میں مجبور ہوں آپا کہ اماں نے.....“ وہ شرمندہ بھی تھا اور پریشان بھی۔

”میں سمجھ رہی ہوں تم کیا کہنا چاہتے ہو“۔ اس کی پریشانی کو بھانپتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ اس نے چونک کر سر اٹھایا۔

”مگر آپ.....“

”میں نے اس دن تمہاری اور اماں کی باتیں سن لیں تھیں“۔ اس کے انکشاف پر وہ متذبذب رہ گیا۔

”میں جانتی ہوں میں اماں! اب اور تمہارے لئے بوجھ بن گئی ہوں رکاوٹ بن گئی ہوں تم سب کی خوشیوں کے آگے“۔ جذباتی انداز میں کہتے کہتے اس کی آواز بھرا گئی یکدم اس کا یوں جذباتی ہو جانا صائم کے لئے

بہت حیران کن بھی تھا اور پریشان کن بھی۔
 ”اماں سے کہو کہ تمہاری معنی کر دیں میں شادی نہیں کروں گی اور نہ ہی میری قسمت میں شادی ہے۔“
 اس کی آواز میں درد شامل تھا، وہ ششدر ہی تو رہ گیا بظاہر اتنی مضبوط دکھائی دینے والی آپا اندر سے کتنی ٹوٹ گئی تھیں۔

”آپا پلیز! آپ غلط نہ سمجھیں میں نے اماں کو صرف اس لئے ایسا کہا کہ میں ابھی منگنی نہیں کرنا چاہتا، اماں اور چچی جان نہ جانے کیوں میری منگنی کرانا چاہتی ہیں۔“ وہ الجھے الجھے لہجے میں بولا، اسے قدرے یقین ہوا کہ صائم سچ کہہ رہا ہے ورنہ تو وہ بدگمان ہو گئی تھی اس کی طرف سے۔

”مگر صائم! میں اب کسی نئے امتحان سے نہیں گزرنا چاہتی، میرا حوصلہ ٹوٹ چکا ہے، امیدیں بار بار ٹوٹ جائیں تو اپنے قدموں پر کھڑے رہنا بڑا دشوار ہو جاتا ہے۔“ آنکھوں میں آنے والی کی کو تو وہ چھپا گئی تھی مگر لہجے میں موجودی کو وہ مخفی نہ رکھ سکی۔
 ”آپ اتنی کمزور تو نہ تھیں، آپ تو بہت حوصلہ مند تھیں آپ تو مجھے حوصلہ دیتی تھیں پھر اب؟“ اس نے تاسف سے اسے دیکھا۔

”میں انسان ہوں صائم! فرشتہ نہیں ہوں میں۔“
 اس کی آواز کی لرزش نے صائم کو ہراساں کر دیا، وہ کس قدر کمزور پڑ گئی تھی، دکھ کی لہر نے اس کے پورے وجود میں سنسنی دوڑا دی تھی۔

”آپا پلیز! مایوسی اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں، انسان کی آزمائش کسی بھی صورت میں ہو سکتی ہے، کیا معلوم یہ آزمائش ہو، صبر اور برداشت سے ہی انسان کی آزمائش ہو کر رہتی ہے آپا۔“ اس نے ملول سی نگاہوں سے اس کے سنجیدہ چہرے کی جانب دیکھا۔

”اللہ تعالیٰ ناراض ہو گیا تو ہم انسانوں کے پاس کیا بچے گا، وہ اپنی نعمتیں دے کر یا دکھ دے کر امتحان لے، ہر صورت میں ہمیں اپنے رب کا بندہ بن کر رہنا ہے۔“

کل تک وہ اسے سمجھاتی آئی تھی آج وہ کتنی بردباری سے اسے سمجھا رہا تھا، نم آنکھوں کے ساتھ اس نے مسکرا کر صائم کو دیکھا۔
 ”بہت سمجھداری آگئی ہے اب لگ رہا ہے تم واقعی بڑے ہو گئے ہو۔“

”اور مجھے لگ رہا ہے کہ آپ کی آئی سائیڈ اب بالکل ٹھیک ہو گئی ہے۔“ اس نے فاطمہ کی ہی ٹون میں ہی جواب دیا تو وہ بھیگی آنکھوں کے ساتھ مسکرا دی۔

☆.....☆.....☆.....
 اور پھر وہی ہوا جس کا فاطمہ کو اندیشہ تھا، وہ لوگ بناء جواب دیئے چلے گئے تھے حالانکہ انہوں نے حتی جواب نہ دیا تھا، تاہم ان کے چہروں سے انکار صاف واضح تھا، جسے سمجھنا اب فاطمہ کے لئے مشکل نہ تھا، اور تب سے ہی فاطمہ کو جیسے چپ سی لگ گئی تھی، بہت تنہا تنہا الگ تھلگ رہنے لگی تھی سب سے۔ اس وقت بھی وہ کھانے کے برتن سمیٹ کر کچن میں رکھ کر اپنے کمرے کی سمت جانے لگی تھی تب ہی ابرار صاحب کی آواز پر وہ چونک گئی۔

”بیٹا! ادھر آئیں۔“ وہ اس کی حد درجہ خاموشی سے کافی پریشان تھے، وجہ انہیں معلوم تھی مگر وہ اسے کرید کر اسے مزید دکھی نہ کرنا چاہتے تھے۔

”آپ کی جاب کیسی چل رہی ہے؟“ انہوں نے بات کا آغاز بہت ہلکے پھلکے انداز میں کیا۔
 ”ٹھیک چل رہی ہے۔“ سپاٹ لہجے پر وہ ذرا بھی نہ چونکے تھے جانتے تھے وہ کس کیفیت سے دوچار ہے۔

”پرموشن کے کوئی امکان ہیں یا؟“ بات برائے بات انہوں نے پوچھا۔

”امکانات تو اب ختم ہی ہو گئے ہیں بابا۔“ مایوس کن جواب سن کر وہ ملول ہو گئے، پر ظاہر نہ کیا کہ انہیں اس کے رویے میں ہونے والی پریشان کن تبدیلی نے کتنا دکھی کیا ہے۔

”مایوسی اچھی بات نہیں بیٹا! گناہ ہے کفر ہے۔“

”اور جو کچھ دوسرے میرے ساتھ کر رہے ہیں وہ گناہ نہیں، وہ ناپسندیدہ نہیں اللہ کے نزدیک۔“ اس کا نم لہجہ انہیں مزید پریشان کر گیا۔

”ہے بیٹا بالکل ہے، مگر دوسروں کے عمل کے ہم ذمہ دار نہیں ان کا عمل ان کے ساتھ ہے اور.....“

”مگر بابا! جو کچھ میرے ساتھ ہو رہا ہے کیا اس کی قصور وار میں ہوں؟“ بھیگی آنکھوں اور نمی سے پر لہجے کے ساتھ اس نے سوال کیا، وہ اتنی نادان تو نہ تھی کہ اسے سمجھانے کی ضرورت پیش آتی اب وہ واقعی ٹوٹ کر بکھر رہی تھی، انہیں اندازہ ہو رہا تھا کہ اب اسے سب کی سپورٹ درکار ہے۔

”نہیں بیٹا ہر گز نہیں، ایسا نہیں سوچئے، اللہ کے ہر کام میں مصلحت ہوتی ہے، حکمت مخفی ہوتی ہے، انسان صرف ظاہری پہلو پر غور کر سکتے ہیں مگر دلوں کے بھید اور نیت سے تو اللہ ہی واقف ہے ناں، جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ انسان کے بھلے کے لئے ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ وہی راستہ نکالتا ہے جو ہمارے لئے مناسب ہو۔“ آنکھیں جھکائے وہ آنسو ضبط کرنے کی کوشش کر رہی تھی وہ جانتے تھے وہ کس درد سے گزر رہی ہے مگر اسے اس طرح دیکھ کر وہ کتنے رنجور تھے یہ اسے معلوم نہ تھا شاید۔

”ہمت سے کام لو بیٹا! تم تو بہت بہادر ہو۔“ وہ چپ رہی وہ بچوں کی طرح اسے بہلا رہے تھے۔
 ”سب بہلاوے ہیں بابا! میں اب شادی نہیں کرنا چاہتی کسی سے بھی۔“ اس کا دل ناراض تھا شاید اس ساری دنیا سے۔ وہ سوچتی رہی اور بابا اسے نہ جانے کیا سمجھا رہے تھے وہ اب سن ہی نہ رہی تھی۔

☆.....☆.....☆.....
 وقت گزرتا گیا، ہفتے مہینوں میں تبدیل ہوتے گئے اور مہینے سالوں پر محیط ہو گئے، صائم کا M.com کمپلیٹ ہو گیا تھا۔ گزرتے وقت کے ساتھ فاطمہ کا ہنسنا بولنا بالکل ختم ہو کر رہ گیا تھا، اس کی چپ اور

خاموشی ابرار صاحب اور رخسانہ کے دل پر گراں گزرتی تھی، اسے یوں زندگی سے اکتایا دیکھ کر بہت کڑھتے تھے، اماں کے چاہنے کے باوجود چچی نے عائشہ کا رشتہ کہیں اور طے کر دیا تھا، صائم کی عدم دلچسپی کو اماں نے کچھ سمجھا ہوا یا نہیں مگر چچی نے محسوس کر لیا تھا، اسی لئے چچی نے عائشہ کا رشتہ دوسری جگہ کرنے میں دیر نہ کی۔

☆.....☆.....☆.....
 ”اماں میں اب مزید تماشا نہیں لگانا چاہتی تین سال پہلے میں کسی کی نظر میں نہ جھج سکی تو اب.....“ اس نے کٹھور سے لہجے میں کہا تو اماں کا دل ٹپ گیا، اس قدر مایوس ہو چکی تھی کہ ذہن و دل کے کسی گوشے میں روشنی کی ایک کرن بھی نہ باقی رہی تھی، اس کی بات سن کر اماں کے لبوں پر بھی جیسے تالا پڑ گیا تھا۔

ابرار صاحب نے اسے پتہ نہیں کیسے قائل کیا تھا کہ وہ آنے والے مہمانوں کو خوش آمدید کہنے کے لئے تیار ہو گئی تھی۔ اور اس بار اس کی توقع اور سوچ و گمان کے برعکس جواب ملا تھا۔ آنے والے لوگ اسے پسند کر گئے تھے، تاقتاب اختر، ابرار صاحب کے باس کم دوست کے بیٹے تھے، رخسانہ خوشی سے نہال تھیں بدیر ہی سہی ان کی دعائیں بارگاہ الہی میں قبولیت کا شرف پا گئیں تھیں، وہ سجدہ ریز تھیں کہ فاطمہ کے نصیب کے در کھل گئے تھے، ادھر فاطمہ کی کیفیت عجیب تھی اسے تا حال یقین نہ آ رہا تھا کہ ایسا ہو سکتا ہے یا ایسا ہو چکا ہے.....؟ وہ یقین کرنی تو بھر پور طریقے سے خوش ہوئی، بعض مرتبہ مایوسی کی کیفیت میں گمان حقیقت میں تبدیل ہو جاتا ہے اور حقیقت گمان کی صورت دکھائی دینی لگتی ہے، اس کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ اسے لگ رہا تھا یہ سب محض خوش فہمی ہے یا پھر غلط فہمی جس کی حقیقت جلد ہی آشکار ہو جانی تھی۔

☆.....☆.....☆.....
 ابرار صاحب کا انکشاف رخسانہ کے لئے دھماکے

سے کم نہیں تھا۔

”یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ.....؟“ انہیں اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔

”میں ٹھیک کہہ رہا ہوں اختر صاحب نے مجھ سے ایسا ہی کہا ہے۔ پریشان کن لہجے میں وہ انہیں یقین دلانے کی سعی کرنے لگے تھے۔

”مگر ایسا تھا تو انہوں نے پہلے کیوں نہ کہی یہ بات.....؟“ وہ برہم ہو رہی تھیں اختر صاحب کی انوکھی فرمائش پر۔

”پتہ نہیں.....“ الجھن بھری حالت میں وہ پیشانی مسنے لگے۔

”آپ کو اپنا اعتراض ان پر واضح کر دینا چاہئے تھا کہ ایسا ممکن نہیں اور اس طرح تو بالکل ممکن نہیں جس طرح انہوں نے اس رشتے کی آڑ میں اپنا مسئلہ حل کرنا چاہا ہے۔“

”پلیز رخسانہ! یہ معاملے جذباتی ہونے کے نہیں ہوتے ہیں عقل و شعور سے تدبیر کرنے کے ہوتے ہیں۔“ ابرار صاحب کو ان کا جذباتی رد عمل پسند نہ آیا تھا۔

”اختر صاحب! میرے بیٹے سے اپنی معذور بیٹی کا رشتہ جوڑنے کی فرمائش کر رہے ہیں اور آپ کہہ رہے ہیں میں جذباتی نہ ہوں۔“ وہ کچھ اور بھی طیش میں آ گئیں۔

”کس قدر مفاد پرست لوگ ہیں دوسروں کی مجبوری کا کس طرح فائدہ اٹھایا جاتا ہے سب خوب معلوم ہے انہیں۔“ ان کا پارہ ہانی ہو رہا تھا بس نہ چل رہا تھا ابھی انہیں بے نقط سنا آئیں۔

”اس بات کا ذکر انہیں پہلے ہی دن کر دینا چاہئے تھا۔“

”رخسانہ! یہ معاملہ جذبات سے حل نہیں ہوگا، غورو فکر سے کوئی حل نکالنا ہوگا۔“ پریشان وہ بھی تھے مگر شاید کسی مصلحت کے تحت خاموش تھے۔

”آپ خود سوچیں کیا ہو سکتا ہے اس مسئلے کا حل.....؟“ ان کے کہنے پر وہ گہری سوچ میں غرق ہو گئے کچھ پل ماحول پر خاموشی چھائی رہی۔

”ایک اولاد کی خاطر دوسری اولاد کو قربان کر دینا کہاں کا انصاف ہے ابرار صاحب۔“

”مگر تم جانتی ہو فاطمہ کی قسمت کا بند دروازہ اب کھلا ہے انہیں صاف انکار کرنا اپنے ہاتھوں سے اس دروازے کو قفل لگانے کے مترادف ہوگا۔“

”آپ کیا چاہتے ہیں ہم فاطمہ کے مستقبل کی خاطر صائم کو اس کی بھینٹ چڑھا دیں۔“ اس خدشے پر ان کا دل دھڑکا تھا۔ ان کی نگاہوں میں شکایت بھرا استفسار تھا۔

”اور کوئی حل کوئی تدبیر سجھائی بھی تو نہیں دے رہی۔“ مجبوری ان کے لہجے میں جیسے رچ بس گئی تھی بیٹی کے باپ تھے بیٹی کو اپنے گھر میں خوش دیکھنے کے لئے انہیں اگر اپنا آپ بھی قربان کرنا پڑتا تو شاید وہ اس سے بھی دریغ نہ کرتے۔

”صائم سے بات کر کے دیکھو شاید وہ راضی ہو جائے۔“ ابرار صاحب ان کی کیفیت سے بے نیاز کتنی آسانی سے مشورہ دے رہے تھے یہ تو کوئی ان کے دل سے پوچھتا کہ وہ کیا محسوس کر رہی تھیں اس وقت۔ ماں کا دل تو موم کی طرح ہوتا ہے کہ ذرا سی محبت کی لو پڑے تو وہ پھل جاتا ہے وہ ان سے اکلوتے لاڈلے بیٹے کی اتنی بڑی خوشی کو قربان کر دینے کو کہہ رہے تھے وہ انہیں اس وقت چٹان کی طرح سخت گیر دکھائی دے رہے تھے جنہیں اپنی دوستی اور تعلقات کے آگے کچھ دکھائی نہ دے رہا تھا۔

”آپ کیوں اپنے بیٹے کو قربان کر دینے کو تیار ہو گئے صرف اس لئے کہ آپ کو اپنا عہدہ بچانے اپنے تعلقات کے خراب ہونے کا اندیشہ ہے.....؟“ وہ بدگمان ہو رہی تھیں ان سے۔

”تم نے ایسا کیوں سوچا رخسانہ.....؟“ انہوں

نے اچنبھے سے انہیں دیکھا۔

”میں اتنا سنگدل نہیں ہوں کہ اپنی نوکری اور دوستی کو برقرار رکھنے کی خاطر اپنے عزیز بیٹے کی زندگی کو مشکل میں ڈال دوں۔“ انہیں بہت دکھ ہوا کہ انہوں نے ان کے لئے ایسا سوچا۔

”میں تو صرف فاطمہ کی خاطر.....“ اس سے آگے ان سے بولا نہ گیا آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی۔

”میں جانتی ہوں آپ فاطمہ کے لئے کتنے پریشان رہے ہیں۔“ انہوں نے نزدیک آ کر ان کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

”مگر فاطمہ کے لئے صائم کو مشکل میں ڈالنا بھی تو ٹھیک نہیں ہے۔“ انہوں نے پھر اپنی بات دہرائی وہ کسی صورت نہ چاہتی تھیں کہ صائم پر اس سمجھوتے کے لئے دباؤ ڈالا جائے۔ اس رات نہ تو ابرار صاحب کی پلکیں جھپکیں نہ ہی رخسانہ سو سکیں پوری رات سوچ بچار خدشات و دواہیات کے درمیان گزر گئی۔

”تم سوچ سمجھ کر جواب دینا بیٹا! ہم نہ تمہارا برا سوچتے ہیں نہ ہی کچھ غلط چاہتے ہیں۔“ اماں نظر نہ ملا پا رہی تھیں اس سے اتنی بڑی قربانی دینے کے لئے کہہ رہی تھیں اس سے مگر کتنے ہلکے پھلکے الفاظ میں جیسے یہ کوئی بات ہی نہ ہو۔

”ہاں بیٹا! تم جتنا چاہو وقت لے لو سونے کے لئے۔“ ابرار صاحب بھی نادم سے تھے جیسے گزارش کر رہے ہوں۔ اسے بہت تاسف نے آن گھیرا اتنی مجبوری و بے چارگی کبھی اس سے قبل نہ ان کے لہجوں میں تھی نہ چہروں پر۔

”پلیز اماں! بابا اس طرح مت کہیں مجھ سے۔“ وہ تڑپ کر بولا۔

”فاطمہ کی خوشی تمہارے فیصلے سے مشروط ہے صائم بیٹا۔“ ابرار صاحب کا لہجہ نہ چاہتے ہوئے بھی ملتجیانہ ہو گیا تھا۔

”کیسی بات کر رہی ہیں آپ.....؟“ وہ اس کی بات پر تڑپ گیا۔

رداؤ انجسٹ 91 جولائی 2012ء

”بیٹا! تمہارے ساتھ کوئی زبردستی نہیں کر رہا تم جو بھی فیصلہ کرو کسی بھی دباؤ کے بغیر آزادی سے کرنا۔“ اماں نے اس کے دائیں بازو کو پکڑا وہ ہکا بکا ان کے اوپر کئے ہوئے چہروں کو دیکھنے لگا۔

”فاطمہ کی خوشی اب تمہارے ہاتھ میں ہے بیٹا۔“ بابا کا درخواست گزار لہجہ اس کے دل کو ٹکڑے ٹکڑے کر گیا۔ اسے شاید سوچنے کے لئے وقت درکار ہی نہ تھا فیصلہ وہ کر چکا تھا مگر فی الوقت وہ ان کو یوں ہی کمرے میں حیران پریشان چھوڑ کر باہر نکل گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

”صائم تم جانتے ہو کتنا بڑا فیصلہ ہے یہ.....؟“ فاطمہ شدید حیرت میں مبتلا تھی۔

”جانتا ہوں۔“ اس کا پرسکون ٹھہرا ہوا لہجہ اسے مزید حیران کر گیا۔

”میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم نے اتنا بڑا فیصلہ اتنی آسانی سے کیوں کر کیے کر لیا۔ ایک ڈس اہل لڑکی کے ساتھ عمر گزارنا آسان نہیں ہے صائم۔“ وہ اس فیصلے کی حقیقت جاننا چاہتی تھی جو اس کے پس منظر میں کارفرما تھی۔

”جانتا ہوں نہ یہ فیصلہ آسان تھا اور نہ ہی نبھانا آسان ہوگا۔“ اس کا لہجہ پر اعتماد تھا۔

”تو پھر.....؟“ اس کی الجھن بڑھ رہی تھی اس نے ایک گہری سانس خارج کی وہ سمجھ رہی تھی کہ صائم وضاحت سے اس کی الجھن دور کرے گا مگر اس نے مکمل خاموشی اختیار کر لی۔

”تم میری وجہ سے اگر خود کو مشکل میں ڈال رہے ہو تو میں تم سے درخواست کرتی ہوں کہ پلیز مجھ پر احسان مت کرو اپنی زندگی کو دشوار مت بناؤ اپنے ہاتھوں سے۔“ اس کی آواز میں لرزش آ گئی وہ یوں ہی بات بات پر رنجیدہ ہو جایا کرتی تھی اب۔

”کیسی بات کر رہی ہیں آپ.....؟“ وہ اس کی بات پر تڑپ گیا۔

رداؤ انجسٹ 91 جولائی 2012ء

”میں کسی پر احسان نہیں کر رہا، میں کسی کو دکھ نہیں دینا چاہتا، امی! بابا سب خوش ہیں اس فیصلے پر میرے لئے یہ ہی بہت ہے اور اگر آپ بھی خوش رہیں گی تو میں سمجھوں گا کہ مجھے اپنی زندگی کی سب سے بڑی خوشی مل گئی۔“ وہ سچے دل سے یہ سب کہہ رہا تھا اس کا مستحکم لہجہ اس کی آنکھیں اس کی سچائی کی گواہی دے رہی تھیں۔ وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی خاموش رہ گئی۔

”بس میں چاہتا ہوں آپ خوش رہیں اب کبھی ادا نہیں ہوں۔“ وہ قریب چلا آیا اس کے گرم ہاتھوں کو تھام کر وہ محبت سے بولا اس کی آنکھیں فرط جذبات سے نم ہو گئیں۔

”اللہ ہر ایک کو تم جیسا بھائی دے۔“ آہستگی سے اس کے ہاتھوں سے اپنے ہاتھ نکال کر اس نے دونوں ہاتھوں کے پیالے میں اس کا چہرہ اٹھایا۔

”اور ہر بھائی کو آپ جیسی بہن۔“ اس نے کہا تو وہ نم آنکھوں سے مسکرا دی۔



اور پھر وہ دن بھی آن پہنچا جب رخسانہ اور ابرار صاحب بیٹی کے فرض سے سبکدوش ہو گئے بیٹیاں والدین کے لئے بوجھ بن جاتی ہیں جب تک ان کے نصیب کے دروازے نہیں ہوتے مگر یہ تو کوئی والدین کے دل سے پوچھے اپنے جگر کے ٹکڑے کو دل پر پتھر رکھ کر خود سے کیسے جدا کرتے ہیں دل کا بوجھ تو ان کے جدا ہونے کے بعد بڑھتا محسوس ہوتا ہے مگر بہر حال یہ نظام قدرت ہے وقت کے ساتھ جب خدشات واہمہ بن کر اڑ جاتے ہیں تو دل مطمئن و شاد خود بخود ہو جاتا ہے۔



اس کی زندگی کس کے ساتھ جڑ رہی ہے یہ اسے نکاح نامے پر سائن کرتے وقت معلوم ہوا تھا اسے حیرت و صدمے نے شدید ترین جھٹکا دیا تھا مگر اس وقت جب وہ کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا تھا ردا اختر ہمدانی آج اس کی شریک حیات بن کر اس کی زندگی میں شامل

ہو گئی تھی وہ کبھی اس کی چاہت تھی مگر اب نہیں۔ اب وہ ان چاہی تھی من چاہے اور ان چاہے میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے جیسے ریت کا ایک زرہ اور صحرا۔ جیسے پانی کا ایک قطرہ اور وسیع سمندر۔

”یہ تم ہی ہونا مس ردا اختر ہمدانی.....؟“ اس نے بیڈ کے گرد گھومتے ہوئے اس کے سراپے کا جائزہ لیا وہ سہم کر سمٹ گئی۔

”مجھے غور سے دیکھو مس ردا اختر میں وہی شخص ہوں جس کی تم نے تذلیل کی تھی مذاق اڑایا تھا میری ذات کا آج وہی شخص تمہارے سامنے ہے وقت نے سب کچھ بدل دیا ہے آج تم میرے سامنے ہو مگر کیا حیثیت اور کیا رتبہ رکھتی ہو.....؟“ اس نے تمسخرانہ مسکراہٹ سے اسے دیکھا۔

”چاہوں تو دو منٹ میں اپنی زندگی سے نکال پھینکوں۔“ اس نے چٹکی بجائی اس کی نگاہوں میں خوف کے سائے لہرا گئے دل انجانے خدشے سے کانپ اٹھا۔

”بہت گھمنڈ تھا ناں تمہیں ان پیسوں پر۔“ اس نے بلیک کوٹ کی اندرونی جیب سے 5 ہزار کے کئی کرارے نوٹ نکالے اور چلتا ہوا اس کے نزدیک آکھڑا ہوا۔

”کیا خرید سکتی ہو مس ردا اس دولت سے.....؟“

کرک و سپاٹ دار آواز اس کے کانوں پر جیسے ہتھوڑے برسا رہی تھی۔

”کیا خرید سکو گی کاغذ کے ان حقیر پرزوں سے۔“ اس نے نوٹ ایک ایک کر کے اس کی جھولی میں گرا دیے۔

”صحت.....؟ محبت.....؟ یا ہمدردی.....؟ کیا خرید سکتی ہو تم.....؟ نعمت.....؟ جذبات احساسات اپنی ساری دولت بیچ کر کچھ خریدنا چاہو تو نہیں خرید سکتیں تم۔“ اس کا طنز یہ لہجہ اس کے وجود کو ڈھیر کر رہا تھا جو سر کبھی فخر سے تانا ہوا ہوتا تھا آج ندامت و بے بسی سے

جھکا ہوا تھا گود میں دھرے ان نوٹوں سے اسے نفرت ہونے لگی تھی۔

”وقت کسی کا دوست نہیں ہوتا مس ردا اختر ہمدانی جو چیز آج ہماری دسترس میں ہے وہ ضروری نہیں کہ ہمیشہ ہی رہے وقت کی روانی میں وہ بہہ جاتی ہے دانستہ یا نادانستہ طور پر ہم اسے گنوا بیٹھتے ہیں مگر ہمیں خبر تک نہیں ہو پاتی۔ کل تک تم وقت کو اپنے تابع سمجھتی تھیں مگر یہ تمہاری نادانی تھی وقت کسی کا غلام نہیں ہوتا وقت سے زیادہ ظالم شاید اس دنیا میں اور کوئی شے ہے ہی نہیں جو کبھی انسان کو انمول اور کبھی بے مول بنادیتی ہے۔“

بے مول و بے وقعت ہی تو ہو گئی تھی وہ آنسو تو اتر سے اس کے رخسار بھگونے لگے۔

”مجھے معاف کر دو صائم! مجھ سے بہت بڑی غلطی ہو گئی تھی جو میں نے تمہاری محبت کی قدر نہ کی۔“ وہ زار و قطار رو رہی تھی۔ وہ اس کے رونے سے قطعی متاثر نہ ہوا اس کی بات کو نظر انداز کر کے وہ پھر کہنا شروع ہوا۔

”تمہیں یاد ہو گا مس ردا اختر! میں نے کہا تھا تم سے کہ ایک نہ ایک دن وقت یہ بات ضرور ثابت کر دے گا کہ محبت بڑی نعمت ہے یا دولت۔ آج دولت محبت کے آگے ڈھیر ہو گئی۔“ ردا نے چونک کر سر اٹھایا۔ حیرانی اس کی بھیگی آنکھوں میں موجود تھی۔

”کس کی محبت نے زیر کیا ہے دولت کو جانتی ہو تم.....؟“ اس نے رک کر ایک نخوت بھری نگاہ اس پر ڈالی۔

”بہن اور ماں باپ کی محبت فاتح ٹھہری ہے میں نے صرف اور صرف.....“ اس نے زور دے کر کہا۔

”اپنوں کی خوشی کے لئے تم سے شادی کی ہے۔“ اس کے الفاظ خنجر کی طرح دل میں پیوست ہوتے محسوس ہوئے تھے لگ رہا تھا جیسے وہ زمین میں دھنستی چلی جا رہی ہو۔

”میں چاہوں تو ابھی تمہیں آزاد کر دوں۔“ اس کے جارحانہ عزائم اس کو خوف زدہ کر رہے تھے وہ جیسا

کہہ رہا تھا اس پر عمل کرنے میں دیر نہ لگاتا۔

”خدا کے لئے صائم! مجھے معاف کر دو میں.....“

”بس.....“ اس نے درشتی سے اس کی بات کاٹ دی۔

”میں تمہاری ایک بات بھی نہیں سننا چاہتا۔“ کاٹ دار آواز میں وہ غرایا۔

”پلیز صائم! اتنے ظالم نہ بنو جانتی ہوں میں نے تمہارے ساتھ زیادتی کی جو کچھ کیا وہ غلط تھا مگر اب میری زندگی کا ہر فیصلہ تمہارے ساتھ وابستہ ہے۔“ وہ التجا کرنے لگی جیسے سانسوں کی ڈور اسی کے ہاتھ میں ہو۔

”کیوں اب کیا ہو مس ردا! برداشت نہیں ہو رہا ناں اپنا ٹھکرایا جانا۔“ استہزائیہ مسکراہٹ بدستور اس کے چہرے پر موجود تھی۔

”پلیز صائم! میرے ساتھ اس طرح نہ کرو انتقام نہ لو مجھ سے کہ میں زندہ درگور ہو جاؤں۔“ سہمے ہوئے لہجے میں خدشات ہی خدشات تھے۔

”مجھے تمہاری دولت سے نہ تو پہلے کوئی غرض تھی نہ اب ہے میں تم سے انتقام نہیں لے رہا تم سچ سمجھو یا جھوٹ میں نے سائن کرتے وقت تمہارا نام سنا تھا مجھے نہیں معلوم تھا کہ وقت تمہیں اس طرح میرے سامنے لا کھڑا کرے گا۔“ وہ آنکھیں پھاڑے حیرت سے اس انکشاف کو سن رہی تھی۔

”مگر یاد رکھنا مس ردا اختر ہمدانی! ہم جیسے لوگ.....“ اس نے دانت کچکچائے۔

”ایک بار کوئی معاہدہ کر لیں تو مرتے دم تک نبھاتے ہیں۔“ اس کے لہجے کی سچائی نے اس کا سر ہمیشہ کے لئے جھکا دیا تھا۔ اس کا وجود کسی گہری کھائی میں گرتا محسوس ہوا۔ آج اسے معلوم ہوا تھا کہ کچھ غلطیاں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کی سزا لوگ نہیں دیتے وقت تجویز کرتا ہے وقت نے اسے مات دے دی تھی۔



سعدیہ عابد

افسانہ

وقت گزاری

”راہی! وہ مجھ سے محبت نہیں کرتا۔“ رائیل غفار
اور ماہم صدیقی اس کو روتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔
رائیل نے ہر ممکن کوشش کر ڈالی تھی رونے کی وجہ پوچھنے
کی اور وہ دونوں ہی پریشانی کے باوجود اس کی خاموشی



ہے۔ چڑنے لگی تھیں۔ ماہم تو باقاعدہ واک آؤٹ کا سوچ رہی تھی، سامان اٹھا کر آگے بڑھتی کہ اس کا ٹوٹا بکھرا لہجہ قدم جکڑ گیا، اس نے بے حد چونک کر اپنی دوست کو دیکھا تھا مگر وہ اُن دونوں کو ہی کب دیکھ رہی ہے۔ روتی جا رہی تھی اور کہتی جا رہی تھی۔

”ماہی! وہ مجھ سے محبت نہیں کرتا، وہ جسٹ ٹائم پاس کر رہا تھا، وہ میرے جذبات سے کھیل رہا تھا۔“ وہ دھم سے اس کے برابر بیٹھی تھی اور وہ سسکی تھی۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کو متفکرانہ نہ سمجھ آنے والے انداز میں دیکھا اور اسے پانی پلایا۔

”اب تم آرام سے کہو جو کہنا ہے۔“ رائیل نے نرمی سے کہا تھا اور ماہم نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کے دیکھنے پر مسکرا کر ساتھ ہونے کا اشارہ دیا تھا۔

پارسا خان کا تعلق اپریل کلاس سے تھا۔ والدین کی ہی نہیں ننھیال کی بھی اکلوتی اولاد تھی۔ پارسا کو اللہ نے دولت عزت چاہت اور حسن سے بے تحاشا نوازا ہوا تھا۔ سب کچھ ہونے کے باوجود اس میں غرور و تکبر نام کو نہیں تھا۔

دو ہی دوستیں پانچویں کلاس سے اس کے یونیورسٹی تک ساتھ تھیں جبکہ دونوں کا ہی تعلق ٹل کلاس فیملی سے تھا۔

پارسا کے تایا کے بیٹے کی شادی تھی جس میں شرکت کے لیے وہ اسلام آباد گئی تھی اور شادی سے ایک ماہ پہلے ہی چلی گئی تھی۔ پڑھائی کا حرج ہوا تھا وہ جانا بھی نہیں چاہ رہی تھی مگر تایا، تائی اسے خود لینے آئے تو اُسے جاتے ہی بنی۔

اسلام آباد میں رہتے ہوئے اس کا تیسرا دین تھا جب اس کی شجاعت مرتضیٰ سے ملاقات ہوئی تھی۔

شجاعت مرتضیٰ پارسا کے تایا کا پڑوسی تھا، اس کے علاوہ تایا زاد ویشان خان کے جگری دوست مسرت مرتضیٰ کا چھوٹا بھائی تھا۔ شجاعت کی شخصیت کافی سحر انگیز تھی اور یونیورسٹی و کالج میں مغرور لیلیٰ کے نام سے پہچانے جانے والی پارسا خان، شجاعت مرتضیٰ کو پہلی ہی نظر میں دل دے بیٹھی۔ شجاعت مرتضیٰ اپنی خوبصورتی سے

واقف تھا اور خوبصورتی کیش کروانے کا ماہر بھی۔ اس نے نامحسوس طریقے سے پارسا کی جانب پیش رفت کی تھی۔ سادہ سی معصوم پارسا خان اس کو سمجھ نہ سکی اور آتے جاتے چٹکوں کے بعد نامحسوس طریقے سے وہ اس کی باتوں کا جواب دینے لگی اور اسی لیے اس کا وہاں خوب دل لگ گیا تھا، وہ اُن دنوں بہت خوش تھی۔ وہ فون پر شجاعت سے بات کرنے لگی تھی، شادی میں اس کی گئی تعریف پر خود کو ہواؤں میں اڑتا محسوس کرتی، محبت نے اور مکر و فریب نے اپنے پُر پھیلا دیئے تھے، وہ اس کی طرف محبت سے اٹریکٹ ہو رہی تھی، نئے نئے خواب بن رہی تھی اور وہ جس نے اُس جیسی کتنی ہی لڑکیوں کو خواب دکھائے تھے وہ اس کے ساتھ محض وقت گزاری کر رہا تھا، باقی لڑکیوں کی طرح پارسا خان کے ساتھ بھی فلرٹ کر رہا تھا۔ پارسا اپنے جذبات، قول و فعل میں سچی تھی اس لئے اس نے اپنی مدد کو وہاں سے آتے ہی بتا دیا تھا اور انہوں نے ہی کہا تھا کہ وہ شجاعت سے کہے کہ اپنے پیرنٹس کو لے کر آئے کہ مسز خان نے شجاعت کی اور اس کی فیملی کی بابت کافی معلومات اکٹھی کر لی تھیں۔ کوئی کمی نہیں تھی، فیملی پڑھی لکھی، ہم پلہ تھی تو انہوں نے بیٹی کی حمایت میں کھڑے ہونے کا عہد یہ دے دیا تھا اور جب اس نے شجاعت سے بات کی تھی تو وہ کافی دیر تک ہنستا رہا تھا اور اس کا دل بیٹھنے لگا تھا اور وہ کچھ ہی دیر میں اُس کا دل وجود زلزلوں کی زد پر لے گیا۔

”واٹ ر بش پارٹی! ایک تو تم لڑکیاں چند دن ہنس کر بات کیا کر لو، نوبت شادی تک لے جانی ہو، شادی کو اتنا اہم کیوں سمجھتی ہو تم لڑکیاں؟“

”آپ کیا کہہ رہے ہیں مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا۔“ ”سیدھی سی بات ہے کہ میں تم سے شادی نہیں کرنے والا تو اپنے پیرنٹس کو تمہارے گھر کیوں بھیجوں؟ ضرورت ہی نہیں ہے مجھے اور ویسے بھی اگر جس سے بھی میں بات کرتا ہوں ان سب کے گھر میرے پیرنٹس جانے لگے تو صبح و شام بلاناغہ بھی جانا چاہیں تو نہ جاسکیں

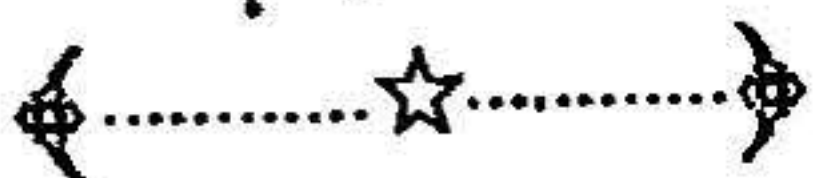
کہ میں اتنی ڈھیر ساری لڑکیوں سے بات کرتا ہوں۔“ وہ طنز یہ ہنسی کے ساتھ بولا تھا۔

”آ..... آ..... آپ.....“ اس سے کچھ کہا ہی نہیں گیا۔
 ”دیکھو پارٹی! میں تم سے محبت نہیں کرتا شادی بھی نہیں کروں گا کہ میں محض وقت گزارنے، زمانے کی ٹینشن بھلانے، خود کو ریلیکس کرنے کے لیے تم سے بات کرتا ہوں اور تم یہ شادی کی تیج نہ لگاؤ تو ساری عمر تم سے بات کر سکتا ہوں کہ مرد و عورت میں محض میاں بیوی کا رشتہ قائم نہیں ہوتا، ہم دوست بن کر رہیں گے، منظور ہے تو ٹھیک و گرنہ مجھے لڑکیوں کی کمی نہیں ہے کہ میں تو بات ہی اُس سے کرتا ہوں جو با آسانی خود ہی مجھ سے بات کر لیتی ہے کہ لڑکیوں کو پھنسانے، منانے میں مجھے نہ وقت ضائع کرنا پڑتا ہے نہ میں کرتا ہوں کہ میں جانتا ہوں کہ یہ ایک لڑکی بھاؤ دکھا رہی ہے تو مجھے اس جیسی دس مل جائیں گی اور میں کوئی یا گل ہوں کہ ایک کے پیچھے دس کو گنواؤں۔ سچ پارٹی! اگر تم میرے بڑھنے کا پوزیٹو رسپانس نہ دیتیں تو میں ہرگز بھی تم پر ٹائم برباد نہ کرتا، مگر مجھے افسوس ہے کہ تم محض ڈیڑھ ماہ میں نا جانے کیا کچھ سوچ بیٹھیں جبکہ میں تو ڈیڑھ سال سے لڑکیوں سے منسلک ہونے کے باوجود اس طرح نہ سوچ سکا۔ سچ کہتے ہیں لوگ کہ تم لڑکیاں بہت بے وقوف ہوتی ہو۔“ اس نے بے ذل و دماغ میں سائیں سائیں ہو رہی تھی اور وہ بہت کچھ کہنے کی چاہ میں ایک لفظ ادا نہیں کر سکی تھی۔ اس نے روتے سسکتے ہوئے ساری تفصیل ان دونوں کو بتادی تھی جسے سن کر وہ دونوں بھی انگشت بدنداں رہ گئی تھیں۔

”کیوں ہو امیرے ساتھ ایسا؟ میں نے تو کبھی کسی لڑکے سے بات نہیں کی تھی، اپنی طرف بڑھنے والوں کی حوصلہ افزائی نہ کی تھی تو کبھی ان کا دل بھی نہیں توڑا تھا، کبھی انہیں بے عزت نہیں کیا تھا کہ میں ریزرور ہتی تھی تو مجھے اس طرح کسی کی بے عزتی کرنے کا حق حاصل نہیں ہوگا، میں نے تو بس اپنے گرد حصار باندھا ہوا تھا مگر شجاعت مرتضیٰ کو دیکھتے ہی وہ حصار ٹوٹ گیا۔ کتنے دل

سے میں نے اسے چاہا، ہر نماز میں اُس کو مانگا، ماما کو سب کچھ بتایا کہ میں کسی کی نگاہ میں مجرم نہیں بننا چاہتی تھی، سچی پاکیزہ محبت کی تھی اور بس..... مگر اُس نے مجھے سب کی میری نظروں میں مجرم بنا دیا۔ وہ میرے ساتھ وقت گزاری کر رہا تھا اور اس کو یہ موقع میں نے خود دیا، میں اگر اس کی پیش رفت پر دھیان نہ دیتی تو وہ کبھی مجھ سے روابط نہ بڑھاتا، میں نے خود اسے اپنے جذبات سے کھیلنے کا موقع دیا، مگر میں تو محبت کر رہی تھی ماہی! اور وہ راہی! وہ میرے ساتھ فلرٹ کر رہا تھا۔ میں اس کی ان گنت دوستوں کی طرح محض ایک دوست تھی، ایک ایسی دوست جس سے دوستی کی آڑ میں وعدے وعید کیے جاتے ہیں، ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھائی جاتی ہیں لیکن شادی نہیں کی جاتی کہ اس کا ماننا ہے کہ مرد و عورت کے درمیان محض صرف میاں بیوی کا نہیں دوستی کا بھی رشتہ ہوتا ہے اور وہ میرا دوست ہے، دوست رہ سکتا ہے اگر میں اس کے ساتھ دوستی، دوستی، محبت، محبت کھیلتی رہوں، میں نے اپنے سچے دکھڑے جذبات اس پر لٹائے جو میرا کچھ نہ تھا، میں نے اپنے سچے دکھڑے جذبات اس سے شیر کیے جو میرا کچھ نہ تھا، نہ بن سکتا ہے کہ وہ محض وقت گزاری کر رہا تھا۔“ پارسا خان بے طرح سسک رہی تھی اور وہ دونوں آنسو بہاتی مہربان لب تھیں کہ کچھ کہہ نہیں سکتیں تھیں کہ ان کے پاس کچھ کہنے کو تھا ہی نہیں کہ چند بری خصلت لڑکیوں اور لڑکوں نے تمام لڑکیوں و لڑکوں کو مجرم بنا دیا ہے، کسی کے کیے کی سزا کسی اور کو ملتی ہے۔

وقت گزاری کرنے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ وہ گناہ کے مرتکب ہونے کے ساتھ دل شکنی کا بھی سبب بن رہے ہیں کہ پارسا خان کوئی بری لڑکی نہ تھی مگر اسے بروں کی صف میں کھڑا کر دیا گیا کہ اس زمانے میں محبت محض وقت گزاری بن کر رہ گئی ہے، سچی محبت اور جذبات کی قدر کرنے والے ہی نہیں ہیں اور ایک اور محبت وقت گزاری کی نذر ہو گئی ہے۔



شازیہ مصطفیٰ عمران

قسط نمبر 13

سلسلے وار ناول

انکسیرا عینہ ابی و فخر حلالی



”ایسا کریں آج آپ آرام کریں کل فریش موڈ کے ساتھ مجھے میسج کیجئے گا۔“
 ”عدین! تم کیا مجھے کچھ سمجھتے ہو؟ تم سے میں بہت بڑی ہوں۔“ اسے جھنجھلاہٹ ہونے لگی۔
 ”میں آپ کو کچھ نہیں سمجھ رہا، آپ کی ٹینشن کو کم کرنا چاہتا ہوں اس طرح رورو کے مجھ سے بات کریں گی تو مجھے کوفت ہوتی ہے۔“ وہ نرم سے لہجے میں اسے سمجھانے لگا۔
 ”جب تک تمہیں نہیں بتاؤں گی میرا دل ہلکا نہیں ہوگا۔“
 ”دل ہلکا ایسے بالکل نہیں ہوگا جو بھی بات ہے آپ کل کیجئے گا میں سب سنوں گا، مگر اس ٹائم نہیں کیونکہ آپ اتنا روئیں گی پھر مجھے غصہ آئے گا آپ جانتی ہیں مجھے۔“ وہ اسے پھر سمجھانے لگا۔
 ”اوکے کل بات ہوگی ذہن تو فریش کریں اور سونے کی کوشش کریں۔“
 ”ہاں جیسے مجھے بہت جلدی نیند آتی ہے۔“ وہ چڑ گئی۔
 ”مگر مجھے تو آ رہی ہے نیند۔“ وہ منہ بنانے لگا۔

”تم ہو ہی سونے کی دوکان اور تمہارا بھائی اجنبیت کی دیوار۔“ یہ کہہ کر سیل بند کر دیا، چہرہ چھپا کے روتی رہی، اتنا بڑا فیصلہ کر تو لیا تھا، مگر دل راضی نہیں تھا، حمدان کی جگہ وہ تیمور کو سوچ بھی کیسے سکتی تھی وہ مرنے والے تھے مگر تیمور کے حوالے خود کو نہیں کرے گی وہ چاچو، چاچی سب کی فطرت جانتی تھی، مگر ڈیڈی کو جیسے کچھ دکھائی ہی نہیں دے رہا تھا۔ مئی تک جانتی تھیں چاچو کی چالاک فطرت اور وہ تیمور کو بھی سمجھتی تھیں شادی کر کے اسے اس گھر میں قبضہ جمانا تھا، اریشماء کو آج اپنی بے بسی پر بہت رونا آ رہا تھا، حمدان نے اسے صاف جواب دے دیا تھا، کوئی راہ نہیں تھی ڈیڈی نے رشتہ پکا کر دیا تھا، کسی دن بھی منگنی بھی ہونے والی تھی اور وہ جانتی تھی ڈیڈی شاندار انداز میں فنکشن کریں گے۔



عدین نے امی اور مصباح کو بتا دیا تھا، اریشماء کی منگنی ہو رہی ہے اور وہ ذرا بھی خوش نہیں ہے، وہ بھائی جان کو پسند کرتی ہیں اس کا اظہار اس نے عدین سے کر دیا تھا۔

”بہت رور رہی تھیں۔“
 ”کیا تھا اگر ہم ایک دفعہ بات ہی کر لیتے؟“ مصباح کو ملال و دکھ ہو رہا تھا، اریشماء اسے بھی بہت اچھی لگتی تھی۔

”آہستہ بولوڈ رائنگ روم میں ہے ٹی وی دیکھ رہا ہے۔“ امی نے شہادت کی انگلی ہونٹوں پر رکھی، مگر اندر بیٹھا حمدان بھی جیسے الجھا ہوا تھا، وہ چیلن پر چیلن سرچ کر رہا تھا، اریشماء کا حسرت بھرا لہجہ اسے بار بار ڈسٹرب کر رہا تھا، اس کی نگاہوں میں جو بے چینی، دکھ، افسردگی تھی حمدان سے کچھ بھی مخفی نہیں تھا، مگر وہ اپنی حیثیت کی وجہ سے اس کی کوئی حوصلہ افزائی نہیں کرنا چاہتا تھا، پھر اس نے روجیل سکندر کی باتوں سے بھی اندازہ کر لیا تھا، وہ جیسے اریشماء کا رشتہ اس سے کبھی بھی نہیں کرنا چاہتے، بلکہ تیمور ہی ان کے لئے اہم ہے، کیونکہ وہ ان کا بھتیجا تھا اور پھر غیر پر بھروسہ کیسے کر سکتے تھے ان کی بیٹی آسائشوں کی عادی وہ کہاں یہاں ایڈجسٹ کر سکتی تھی۔ اس نے ریموٹ سے ٹی وی آف کر دیا، صوفے پر وہ ٹانگیں سیڑھی کر کے لیٹ گیا، دل کی دنیا میں بہت الجھن تھی۔

”اریشماء باجی! بہت رور رہی تھیں اور ہمارے بھائی جان پتہ نہیں کیوں اپنا دل اتنا پتھر کر کے بیٹھ گئے ہیں۔“
 عدین کو تو اریشماء کا چہرہ پریشان کر رہا تھا، جو بار بار رنگا ہوں میں آ رہا تھا۔

ڈیڈی کو خوشی دے کر وہ مغموں اور افسردہ ہو گئی تھی، مئی کے گلے لگ کے وہ بہت روئی تھی، پہلی دفعہ اس نے اپنی مرضی کے خلاف کوئی فیصلہ کیا تھا، پھر ڈیڈی بھی تو اس کی مرضی اور پسند کو اہمیت دیتے تھے اس دفعہ ڈیڈی نے جیسے صرف ایک فارمیٹی نبھائی تھی اس کی مرضی پر چھوڑا تو تھا مگر کچھ بھی اس کی مرضی اور پسند پر نہیں ہوسکا تھا، حمدان کی بے رخی، سرد مہری اور انکار نے اس کا دل مٹھی میں لے لیا تھا، وہ اسے چاہ کر بھی بھول نہیں سکتی تھی، وہ اس کے حواسوں پر چھایا ہوا تھا۔ دو دن سے اپنے بیدروم میں ہی بند تھی، آفس بھی جانے سے منع کر دیا تھا، سیل بھی پتہ نہیں کہاں ڈالا ہوا تھا، دو دن سے ہاتھ مٹس تک نہیں لیا، یکدم ہی خیال آیا سیل تلاش کیا، سائیڈ ٹیبل سے نیچے نہیں پیچھے کی سائیڈ پر گر گیا تھا، اٹھا کر چار جنگ پر لگایا، بیٹری بھی ختم تھی، بیدروم اس کا بے ترتیب پڑا تھا، صرف کھانے کے لئے روم سے مارے باندھے نکلتی تھی، ڈیڈی تو جیسے جان کے اس سے نگاہیں پڑا رہے تھے۔ موبائل کچھ چارج ہوا تو آن کیا، کچھ ہی منٹ میں اتنے ڈھیر سارے میسجز آئے، سیل مسلسل بجے جا رہا تھا، عدین کے بائیس میسج تھے، جس میں یہی تھا۔

”کہاں ہیں جواب کیوں نہیں دے رہی ہیں؟ باجی پلیز! کچھ تو بولیں۔“ اریشماء حیران رہ گئی، عدین نے مختلف ٹائم میں اتنے میسج کئے تھے جلدی جلدی اس نے عدین کو دو تین میسج کئے، مگر اس کا جواب نہیں آ رہا تھا، کیوں؟ وہ پریشان ہو گئی، کال کرنے کے لئے سیل چار جنگ سے باہر نکالا، سیل مسلسل جا رہی تھی، وہ کال پک نہیں کر رہا تھا، اسے یقین تھا عدین ناراض جب ہوتا ہے اسے غصہ بھی بہت آتا ہے اگر اس کے میسج کا کوئی جواب نہیں دیتا ہے، تین چار دفعہ وہ ٹرائی کر چکی تھی، تھک ہار کر سیل دوبارہ چار جنگ پر لگا دیا، اسی وقت میسج آیا، اریشماء نے چونک کر دیکھا، عدین کا ہی تھا۔

”پورا پورا دن غائب رہتی ہیں، کل سے کتنے میسج کئے ہیں، کال کی، مگر آپ کا سیل آف تھا اب میں بھی کال ریسیو نہیں کروں گا۔“ عدین کا ناراضی بھرا میسج تھا۔ اس نے میسج ٹائپ کیا اور سینڈ کر دیا، کچھ دیر میں کال کی جو اس نے بہت دیر میں ریسیو کی۔

”کیا بات ہے تم کال کیوں ریسیو نہیں کرتے ہو؟“ اریشماء کو اس پر غصہ آ گیا۔

”میں بڑی ہوں۔“ بے رخی سے جواب دیا۔
 ”میں کال بند کروں؟“ اسے پھر غصہ آیا۔
 ”مرضی ہے آپ کی۔“

”عدین! کیا ہو گیا ہے، میں کل سے کتنی ٹینشن میں ہوں، تمہیں اس کا اندازہ بھی نہیں ہوگا۔“ وہ تھکی تھکی روہا سی ہو کر گویا ہوئی، ناراضی بھی دکھا رہا تھا، کل سے دیسیوں میسج جو کر چکا تھا اور اریشماء کا کچھ اتنا پتہ نہیں چل رہا تھا۔
 ”تم تو ایسے نہیں بولو بھائی!“ اسے عدین کا ایسا انداز افسردہ کرنے لگا۔

”پھر کیسے بولوں، کل سے پاگلوں کی طرح آپ کو میسج کئے جا رہا ہوں اور آپ پتہ نہیں کیوں سیل آف کر کے بیٹھی ہوئی ہیں، وہ تو میں نے آپ کو کال کی تو پتہ چلا سیل آف ہے۔“
 ”میں بہت اُداس ہوں عدین!“ وہ رونے والی ہی ہونے لگی۔

”پلیز رونا نہیں، آپ کال آف کریں، میسج پر بات کریں۔“ عدین کو اندازہ ہو گیا وہ رونے کا بہانہ تلاش کرے گی اور اس سے رونا برداشت نہیں ہوتا تھا۔

”مجھ سے میسج پر بات نہیں ہوتی ہے۔“ وہ تیز لہجے میں گویا ہوئی۔

”حمداں! آپ بنا دیں گے مجھے نفسیاتی، پلیر ایک دفعہ میرے متعلق سوچئے تو میں نہیں رہ سکتی تیمور کے ساتھ میرا دم گھٹ جائے گا، مرجاؤں گی۔“ وہ تو روہا سی ہو گئی آواز بھی بھرا گئی۔

”آپ اس وقت آرام سے سوئے، ہم کل بات کریں گے کسی اچھی سی جگہ پر۔“ وہ تو گھبرا گیا۔

”آپ مجھے ٹال رہے ہیں۔“ وہ مشتعل ہو گئی۔

”آپ سمجھنے کی کوشش تو کریں۔“

”سمجھ آپ نہیں رہے ہیں، ٹھیک ہے آپ کو ضد ہے تو مجھے بھی ہو گئی، میں صرف آپ کے سپنے دیکھتی ہوں، اگر کوئی میرے جسم و جاں کا مالک ہے تو حمداں وہ آپ ہیں۔“

”شٹ اپ!....!“ وہ تو دھاڑ اٹھا۔ امی کے قدم چوکھٹ پر رک گئے، حمداں نے موبائل آف کیا اور تکیہ کے نیچے رکھ دیا، دماغ تو پہلے ہی بھاری تھا، اب تو دل پر گھبراہٹ ہو گئی، واش روم میں چلا گیا، امی نے ساری گفتگو سن لی تھی۔

وہ اتنی سمجھدار، ریزروسی تھی پتہ نہیں کہاں سے اس میں اتنی سرکشی اور ضد آ گئی تھی، وہ خود پر حیران تھی، یہ تو نہیں تھی اس کی شخصیت، سمجھ بوجھ رکھنے والی، ہر معاملے کو کتنے اچھے طریقے سے وہ ہینڈل کرتی تھی، حتیٰ کہ حمداں تک کو اس نے ہینڈل کر لیا تھا، جب وہ ڈیڈی کی گاڑی کے آگے آیا تھا، کتنی مشکل سے باتوں میں الجھا کے ہوسپٹل میں روکا، پھر اسے جاب پر بھی لگایا، وہ اتنی ڈیسنٹ طبیعت کی تھی، پھر وہ ایسی کیوں ہو گئی تھی؟ چہرہ تکیہ میں چھپا کے رونے لگی، اپنی شخصیت گم ہونے کا ملال بھی تھا اور اپنے جذباتیت بھرے انداز پر بھی دکھ تھا، ان سب کا ذمہ دار وہ حمداں کو ٹھہرا رہی تھی۔

”حمداں احمد! تم نے میری شخصیت بدل دی ہے، اور تم اپنی شخصیت کو سنبھالے بیٹھے ہو، میرا تو نقصان کر دیا، تمہاری نظروں میں گر تو میں گئی، کتنی سو بر میری سوچیں تھیں، سب تم نے بگاڑا ہے۔“ وہ لب چل رہی تھی، اتنا بڑا نقصان اس سے برداشت نہیں ہو رہا تھا، پھر تیمور کو جب جب سوچتی اسے اور بھی غصہ آتا، ڈیڈی اتنے خوش تھے ایک دفعہ بھی اس سے نہیں پوچھا، پھر دوبارہ اس نے یہ دل سے فیصلہ کیا ہے یا نہیں۔

”ڈیڈی! آپ نے مجھے لاڈ خروں میں پالا، اعلیٰ تعلیم دلوائی، ہر طرح کی آزادی دی، مگر جب جیون ساتھی کا فیصلہ کرنے کا وقت آیا، وہ آپ نے خود کر لیا۔“ اسے یہی دکھ غم احساس سب مارے ڈال رہا تھا۔

”ممی بے چاری، وہ تو میری طرف دیکھتے ہوئے ڈرتی ہیں۔“ اسی وقت دروازے پر ٹاک ہوئی، اریشما چوٹ گئی، جھٹ چہرہ صاف کیا، ضرور می ہوں گی اور وہ اسے دیکھ کر پریشان ہو جائیں گی۔

”اریشما بیٹا! آپ ابھی تک سوئی نہیں۔“ فوزیہ رو جیل اندر آ گئی تھیں۔

”ممی! مجھے نیند ہی نہیں آرہی۔“ وہ تکیہ درست کر کے پیچھے ہوئی، فوزیہ رو جیل نے اس کا چہرہ جانچ لیا تھا، وہ رو رہی تھی، اور ان کا دل تو پہلے ہی بے چین تھا۔

”حمداں سمجھتا ہے جب ہی وہ اس کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا اور پھر ٹھیک ہی تو کیا، ہم لوگ کہاں ان کے مقابلے کے ہیں۔“ امی نے ان دونوں کی ہی نفی کی اور سمجھایا، وہ یہ بھی نہیں چاہتی تھیں کہ دونوں بہن بھائی حمداں کو کچھ بولیں۔

”امی! اریشما تو اب یہاں آئیں گی، بھی نہیں۔“

”ایسا کچھ وہ نہیں کریں گی، آئیں گی وہ ضرور یہاں، اس گھر کے علاوہ وہ جاتی بھی کہاں ہیں؟“ عدین گویا ہوا۔

اسی وقت حمداں نے امی کے بیڈ روم میں دیکھا، وہ لوگ چپ ہو گئے، عدین نے اپنا سیل پاکٹ میں رکھ لیا، وہ چلتا ہوا اندر آ گیا۔

”امی! ایک کپ چائے بنا دیں، سر میں بہت بھاری پن ہو رہا ہے۔“ اس نے آہستگی سے کہا، مصباح اور عدین کی گہری نگاہیں اس پر تھیں، اتنا تو انہیں بھی اندازہ ہو رہا تھا، حمداں کے دل کی بے چینی کیسی ہے۔

”کوئی ٹیبلٹ وغیرہ لے لو، دودھ کے ساتھ چائے نہیں پیو۔“ انہیں رات میں چائے پینا پسند نہیں تھا۔

”آج چائے کا موڈ ہو رہا ہے۔“ وہ یہ کہہ کر روم سے نکل گیا، لہجے میں جھنجھلاہٹ سی تھی، تینوں ایک دوسرے کی جانب دیکھنے لگے، ڈھیلے اعصاب کر کے وہ دھڑ سے بیڈ پر لیٹا، آفس سے جب سے آیا تھا، الجھا ہوا تھا، نیکسٹ فرائیڈے کو اریشما کی انجینٹ تھی، رو جیل سکندر نے ساری ذمہ داری اس پر ڈال دی تھی اور حمداں نے سعادت مندی سے یہ سب قبول کر لیا تھا، وہ ایسا تاثر نہیں دینا چاہتا تھا کہ وہ خوش نہیں ہے۔ سیل کی بیپ نے اسے چونکا دیا، اریشما کی کال تھی، کافی دیر تک سیل کو دیکھتا رہا، شاید بند ہو جائے مگر اریشما بھی مستقل مزاج تھی، بار بار ڈرائی کیا۔

”یس!“ گھمبیر اور سرد آواز میں گویا ہوا۔

”آپ جاگ رہے تھے۔“ وہ خوش ہو گئی۔

”سونے کی تیاری تھی، کیسے کیا کام ہے؟“ وہ آواز اور لہجے کو نرم بنا کے گویا ہوا، تاکہ وہ مشتعل نہ ہو جائے۔

”کچھ دیر مجھ سے بات کر سکتے ہیں؟“ وہ اتنی انفریڈ اور دھیمی ہو رہی تھی، حمداں نے آنکھیں بند کر کے اسے محسوس کیا، وہ اتنی نرم و نازک، کالج کی طرح تھی، بالکل صاف شفاف، جو دل میں ہوتا وہی اس کے لب و لہجے میں بھی واضح ہوتا۔

”اس وقت بات.... نا تم دیکھئے بارہ بجنے والے ہیں۔“ اس نے فہمائشی لہجے میں اس کی توجہ نا تم پر مبذول کروائی۔

”اچھی باتیں کرنے کے لئے کوئی بھی نا تم ہو سکتا ہے۔“ لہجہ ذومعنی اور حسرت بھرا تھا۔

”اریشما! لگتا ہے آپ ابھی تک نارل نہیں ہوئی ہیں۔“

”ہوں.... بالکل ٹھیک کہا حمداں! آپ نے تو۔“ وہ پھسکی ہنسی کے ساتھ استہزائیہ لہجے میں گویا ہوئی۔

”میں اگر ایب نارل ہو گئی تو یاد رکھیے گا، اس کے ذمہ دار آپ ہوں گے۔“ وہ اپنے دل کی بھڑاس کسی طرح بھی اس پر نکالنا چاہتی تھی۔

”اریشما! آپ نفسیاتی باتیں نہیں کریں۔“ وہ تو حواس باختہ ہو گیا، پہلو بدل کر بیٹھ گیا، اس وقت اریشما کو سمجھانا اور وہ بھی کال پر سمجھانا بڑا مشکل تھا، وہ اس کی کیفیت سمجھ رہا تھا، وہ بار بار اس کی جانب رخ کر رہی تھی، اور اسے اسی بات کا ڈر تھا، اگر تیمور کے سامنے کوئی ایسی ویسی جذباتی حرکت کر دی تو وہ تو رو جیل سکندر کی نظروں میں

بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگیں، اریشماء کی آنکھیں بھرا گئیں۔

”مجھے بتاؤ گی کون تھا جسے میرے بیٹی نے پسند کیا تھا؟“ اریشماء نے کروٹ لی، دل میں جو بسا ہوا تھا وہ اسے چاہ کر بھی بھلا نہیں سکتی تھی، حمدان کی باتیں، رویہ اسے ہرٹ کر رہا تھا۔

”اریشماء بیٹا! مجھے بھی تو بتاؤ کون ہے وہ؟“

”مئی! کوئی فائدہ نہیں بتانے کا۔“ آواز بھرا گئی۔

”کہتے ہیں دل کی باتیں کر لینے سے دل میں جو بوجھ ہوتا ہے وہ کم ہو جاتا ہے، میں اندازہ کر سکتی ہوں میری بیٹی کے دل پر اس وقت کیا گزر رہی ہے، وہ اتنی مجبور ہو گئی ہے اپنے باپ کے آگے، کمزور پڑ گئی ہے، ضرور کوئی ایسی بات ہے جو تم نے اتنا بڑا فیصلہ اپنی مرضی کے خلاف کیا ہے۔“ مسز روچیل کی بھی آنکھوں میں نمی آ گئی، وہ ماں تھیں اور ان کی ایک ہی تو اولاد تھی، اس کی خوشی نہیں پوری ہو رہی تھی، تکلیف انہیں ہی ہو رہی تھی، کتنی دفعہ روچیل سکندر سے بھی بات کرنا چاہی، مگر وہ اپنے بھتیجے کی محبت میں جیسے کچھ سننا ہی نہیں چاہتے تھے، وہ سمجھ رہے تھے ان کی بیٹی کے لئے ان کا بھتیجا ہی بیسٹ رہے گا، جبکہ وہ تیمور کی فطرت کو سمجھتی تھیں، اسے اریشماء سے محبت وغیرہ کچھ نہیں تھی، وہ گھر اور آفس پر قبضہ جمانا چاہتا تھا۔

”جب وہ مجھے مل ہی نہیں سکتا، دل کی باتیں کرنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں۔“ کچھ دیر پہلے حمدان کی باتوں نے اسے اور اُداس اور غمگین کر دیا تھا۔

”کیا پتہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے اسے ہی رکھا ہو، کیونکہ جب محبت میں شدت زیادہ ہوتی ہے اللہ تعالیٰ بھی ناممکن کو ممکن بنا دیتا ہے۔“ وہ اس کے دل میں امیدیں باندھ رہی تھیں، اریشماء حیرانگی سے چونک کر اٹھ کر بیٹھ گئی، مئی اور ایسی باتیں.... وہ تو سمجھی تھی مئی اسے یہی کہیں گی تم بھول جاؤ، وہ تو اس کی محبت کو اور ہی آگے تک لے جانے کی بات کر رہی تھیں۔

”مئی! آپ کیا کہہ رہی ہیں؟“

”میں بالکل ٹھیک کہہ رہی ہوں، کیونکہ میں چاہتی ہوں میری بیٹی جسے چاہتی ہے، اگر وہ بہت اچھا ہے تو اسے تمہارا نصیب بنا دے۔“ انہوں نے اریشماء کا ماتھا چوم لیا، وہ مئی کے گلے سے لگ گئی، اسے نہیں پتہ تھا مئی اس کے دل کے درد کو اتنی گہرائی سے سمجھیں گی۔

”جلدی سے بتاؤ کون ہے وہ خوش نصیب جس کے لئے میری بیٹی اتنی اُداس ہے؟ اپنی خوبصورتی کو بھی خراب کرنے پر تلی ہوئی ہے، رو رو کے۔“ لہجے میں بٹاشٹ رکھ کر اسے دیکھا۔ اریشماء جھینپ گئی، جب بھی اس ستم گر کے بارے میں سوچتی اور بے چین ہو جاتی۔

”حمدان احمد! نگاہ نیچی رکھی ہوئی تھی۔“

”حمدان!... حیران تو وہ ذرا بھی نہیں ہوئی تھیں بلکہ مسکرا رہی تھیں۔“

”مجھے تو بہت پہلے پتہ تھا۔“

”کیا... مئی آپ! اریشماء حیران ہوئی۔“

”ہاں مجھے سب خبر تھی، مگر پہلے میں پسند نہیں کر رہی تھی، مگر میں نے تمہارا جھکاؤ شروع سے حمدان کی طرف دیکھا ہے۔“ مسز روچیل نے ذرا بھی اچنبھا اور حیرانگی ظاہر نہیں کی تھی۔

”تم نے حمدان سے بات کی کیا کہتا ہے؟“

”وہ پتہ نہیں مئی! میری طرف توجہ ہی نہیں دیتا، مجھے ہرٹ کر کے رکھا ہوا ہے۔“ اس نے آہستہ آہستہ سب کچھ بتا دیا۔ مسز روچیل گہری سوچ میں پڑ گئیں، وہ اسے اپنے گلے سے لگا کر تھکی دیے، لگیں، ان کی جان تھی، وہ اس کی خوشی کے لئے کچھ تو کریں گی، پھر حمدان جیسا خود دار، نو جوان اس زمانے میں بہت مشکل سے ملتا ہے۔

☆.....

خود کو سنبھالنے میں اس نے تین دن لگائے، رو رو کے وہ آدھی ہو گئی تھی، مگر رونے سے ٹینشن اس کی ختم نہیں ہوئی تھی، وہ وہی تھی، ڈیڈی بہت خوش تھے، وہ جیسے اس سے پوچھنے کی دوبارہ غلطی بھول کے بھی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اریشماء نے خود کو مضبوط بنانے کی پوری کوشش کی، ہوئی تھی، حمدان کے سامنے خود کو کمزور نہیں کرنا چاہتی تھی، آفس تو چھوڑ ہی رہی تھی، مگر مئی نے سمجھایا تو آنے پر راضی ہو گئی، خود کو مصروف بھی رکھنا چاہتی تھی۔ لیسن کلر کے پرنڈل شرٹ اور دوپٹہ اور پلین ٹراؤزر میں وہ شاٹ کٹ بالوں کو کچر میں مقید کئے خاصی سنجیدہ اور خاموش لگ رہی تھی، حمدان اس کی خاموشی نوٹ کر رہا تھا، جو اس کی جانب دیکھنے سے گریز کر رہی تھی، روچیل سکندر سے وہ کسی بات پر ڈسکس کر رہی تھی، اور وہ دونوں کی گفتگو سن رہا تھا۔

”حمدان! آپ وہاں کا وزٹ کر لیں، دیکھ لیں کام ٹھیک طرح تو ہو رہا ہے یا نہیں؟“ روچیل سکندر اپنی گفتگو سے فارغ ہو کر مخاطب ہوئے۔

”سر! آپ مس اریشماء کو بھیج دیں، یہ بھی دیکھیں وہاں ان کے ڈیزائن کئے پروجیکٹ پر کیسا کام ہو رہا ہے۔“ حمدان نے انہیں یاد دلایا۔

”مجھے جب دیکھنا ہوگا میں دیکھ لوں گی، آپ کو ٹینشن لینے کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ اگلی پچھلی تمام باتوں کا بدلہ لینا چاہتی تھی، اسے بھی غصہ آ گیا تھا، حمدان کو تنبیہ کرتی رہے گی، وہ اگر اسے اگنور کر رہا ہے تو وہ اسے ٹینشن دیتی رہے گی۔ حمدان سے ایسا سرد رویہ اتنی ناگواریت وہ سمجھ تو رہے تھے، حمدان نے اسے ہرٹ کیا ہے، اور وہ جوابی طور پر غصہ ہی دکھا رہی ہے۔

”اریشماء بیٹا! آپ حمدان کی بات کا غلط مطلب لے رہی ہیں۔“ انہیں حمدان پر جیسے ترس آیا۔

”سر! کوئی بات نہیں، میڈم کی مرضی جب بھی دل کرے یہ چلی جائیں۔“ وہ اکثر اسے کبھی میڈم اوز مس کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔

”ڈیڈی! میں جو بہتر سمجھتی ہوں وہ کہا ہے، انہیں پریشان ہونے کی قطعی ضرورت نہیں ہے، یہ اپنے کام سے کام رکھیں۔“ وہ حمدان کے سر پر ہاتھ پڑتے چہرے کو دیکھنے لگی، مگر وہ پھر بھی تحمل کا مظاہرہ ہی کر رہا تھا، اچھٹی نگاہ اس پر ڈالی جو آج اتنی سادگی میں بھی دلکش لگ رہی تھی، سرخ و سپید رنگت، غازوں کی سرخی، گلاب کی پگھڑی ہونٹ، حسن سے تو وہ مالا مال تھی، حمدان نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی دلکشی میں کھو گیا تھا، کتنے دنوں سے وہ بھی دل کی عدالت میں کھڑا تھا، وہ پرانی ہونے جارہی تھی، اور اس کے دل و دماغ میں ہلچل مچی ہوئی تھی، اتنی سنجیدہ طبیعت کا تھا اس پر بھی کسی صنف نازک نے اپنا قبضہ کر لیا تھا۔

”اوکے۔“ وہ سر اٹھا کے گویا ہوا۔

”حمدان بیٹا! آپ کل سے اپنے کام پر لگ جائیے، تین دن بعد اریشماء کی انیجمنٹ ہے، ساری ذمہ داریاں آپ نے سنبھالنی ہیں، کیونکہ مجھے آپ پر پورا بھروسہ ہے۔“

”آپ بے فکر رہئے، تمام کام بہت اچھے طریقے سے انجام دوں گا۔“ وہ کھڑا ہو گیا۔

”ڈیڈی! آپ انگلیج منٹ کے فنکشن کا کوئی کام ان سے نہیں کروائیے۔“ یکدم ہی وہ گویا ہوئی وہ دونوں ہی چونک کر دیکھنے لگے حمدان تو سمجھتا تھا وہ کبھی بھی نہیں چاہے گی میں ایسا کوئی کام کروں، کونسا حمدان کا بھی دل تھا وہ کچھ کرے وہ تو اس کی انگلیج منٹ میں بھی نہیں جانا چاہتا تھا، مگر پھر یہ سوچا کہ اگر نہیں جائے گا تو اریشما سوچے گی وہ اسے پسند کرتا ہے، جب ہی کسی اور کے ساتھ نہیں دیکھ سکتا ایسی خوش فہمی میں اسے ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔

”کیوں....؟“ وہ گویا ہوئے۔

”انہیں پروجیکٹ کو دیکھنے دیں، میں بھی نہیں جاسکتی، آپ کی بھی مصروفیت ہے۔“ اریشما نے خود ہی ریزن بھی دیا اور بات کو سنبھالا وہ خود بھی چاہتی تھی حمدان یہ سب نہیں کرے اور اگر وہ انگلیج منٹ میں آئے گا تو وہ کہیں خود پر کنٹرول نہ کھودے اور ڈیڈی کی سب کے سامنے انسٹ ہو جائے، مگر تیمور کو حمدان کی جگہ دینا کتنا مشکل ہے۔

”ہوں.... یہ بھی ٹھیک ہے۔“ روچیل سکندر کی بھی سمجھ میں آ گیا۔ حمدان ان سے اجازت لے کر روم سے نکل گیا، مگر ذہن منتشر ہو گیا، اریشما کا ایسا رویہ جانے کیوں دل کو دکھ اور افسوس کیوں ہو رہا تھا، جبکہ وہ تو یہی چاہتا تھا، پھر اب جبکہ اریشما نے خود ایسا کہا تو پھر کیوں مضطرب ہو رہا تھا؟ چیئر پر بیٹھ گیا تھا، مانیٹر اسکرین آن تھی، حالانکہ بہت کام تھا اور اسے اریشما سے ڈسکس بھی کرنا تھا، ذہن کو جھٹکا اور اپنے کام میں لگ گیا، لُنج تک وہ بہت بڑی رہا، جب اریشما ناک کر کے روم میں آئی تو اس نے سرسری نگاہ اٹھائی، اس کی مخصوص مہک حمدان کے اطراف میں پھیل گئی، وہ اور ڈسٹرب ہو گیا، اریشما اس کی پشت کے پیچھے آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

”حمدان! آپ خود کو بہت مضبوط سمجھتے ہیں؟“ طنزیہ انداز میں پوچھا۔

”میں اس وقت آپ کی کسی بات کا جواب نہیں دے سکتا۔“ لہجہ سپاٹ اور ناگوار تھا۔

”کیوں نہیں دے سکتے؟ سچ نکل جائے گا آپ کے منہ سے۔“ وہ سینے پر بازو دلیپٹ کے اس کے سامنے آ گئی، نگاہوں میں تنقید تھی، وہ ایک نظر ڈال کر رہ گیا۔

”جو سچ تھا میں آپ کو دس ہزار مرتبہ سمجھا چکا ہوں، مجھے آپ کی ذات سے ذرا بھی دلچسپی نہیں ہے، آپ خواہ خواہ خود کو میری نظروں میں گرا کر بے وقعت کر رہی ہیں۔“ لہجہ تیز اور درشت ہو گیا۔

”محبت کا اظہار کرنا خود کو گرا کر رہنا ہوتا ہے؟“

”پلیز اسٹاپ! وہ زہن بچ ہو گیا، روز کی انہی باتوں سے وہ چڑنے لگا تھا۔

”اگر آپ کا دل صاف ہے، تو مجھ سے بات کریں، سچ کیوں رہے ہیں؟“ اریشما جزبزی ہو گئی۔

”سچ نہیں رہا، آپ غلط سوچتی ہیں، ہمیشہ میرے متعلق۔“ نرم لہجے میں گویا ہوا۔

”میں تو ہمیشہ اچھا ہی سوچتی ہوں آپ کے متعلق، مگر شاید آپ مجھے غلط سمجھتے اور سوچتے ہیں۔“ لہجے میں خروبی حسرت اور افسردگی سب ہی عیاں تھی، حمدان پہلو بدل کر رہ گیا، اریشما بالکل سادہ بات کرتی تھی، اسے اس کی یہی سادگی اور دلکش بنائے ہوئے تھے۔

”میں آپ کی بہت عزت کرتا ہوں، اور آپ میری باس ہیں، اور میں آپ کے متعلق ایسا دیا غلط سوچنے کی جرأت کر بھی نہیں سکتا۔“ اس نے جواب میں یہ کہا۔ اریشما لب بھینچ کر رہ گئی، آنکھیں چھلکنے کو تیار ہو رہی تھیں، مگر وہ رورو کے خود کو بے وقعت نہیں کرے گی، بہت آنسو بہا لئے، اب اسے سب برداشت کرنا ہے، جب سے ممی نے اس کی امیدیں بڑھائی تھیں اسے گونا گوں سکون مل گیا تھا۔

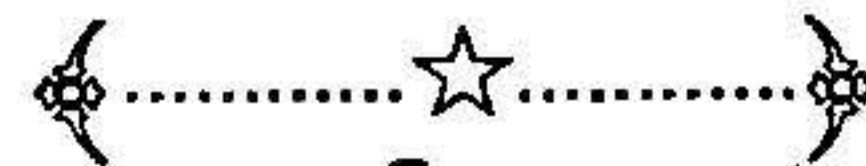
”پھر آپ کو میں نظر کیوں نہیں آتی؟“

”مجھے آپ سے زیادہ بہت کچھ ایسا نظر آ رہا ہے جو شاید آپ کو ابھی نظر نہیں آ رہا ہے۔“ حمدان نے ذومعنی لہجے میں اسے بتایا۔

”میں سب سمجھتی اور جانتی ہوں، اگر آپ میرا ساتھ دیتے تو جو کچھ آپ کو نظر آ رہا ہے اس کا ہم مل کر مقابلہ کرتے۔“

”مس اریشما! ایسی باتوں کا اب کوئی فائدہ نہیں، آپ نئی زندگی شروع کرنے جا رہی ہیں، سچے دل سے تیمور کو قبول کریں، صرف تیمور کو سوچئے، آپ کے ذہن میں پھر آس پاس کی چیزوں کا خیال تک نہیں آئے گا۔“ اس نے مدبرانہ انداز میں اسے سمجھانے کی پھر کوشش کی۔

”کسی کو مشورہ دینا بہت آسان ہوتا ہے اور جب عمل کرنے کی خود کی باری آتی ہے، سب سے کٹھن اور مشکل ترین مرحلہ ہوتا ہے، سوچئے گا میری بات کو آپ کیا مجھے بھول سکیں گے؟ مجھے تیمور کے ساتھ دیکھ سکیں گے؟“ وہ بولتی جا رہی تھی اور حمدان گنگ سا اس کی سنے گیا، وہ ہر بات کتنی آسانی سے کہہ دیتی تھی جبکہ وہ ناپ ناپ کے گفتگو کرنے والا شخص تھا اسے تو آگے کی فکر تھی، اگر اریشما نے جذبات میں آ کر کچھ الٹا سیدھا کر دیا تو یہ تو حمدان کے لئے بھی شرمندگی کی بات ہوگی، اسے اریشما کو نارمل کرنا تھا۔



اس نے شبیا کا ایڈمیشن کروا دیا تھا، شہران کو اس نے اچھی طرح سنا کے اس سے پیسے بھی لے لئے تھے، وہ پتہ نہیں کیوں حرام سے دب گیا تھا، یہی سب کے لئے حیران کن تبدیلی بھی تھی، پہلے گھر میں الگ ڈرے سہرے رہتے تھے، شہران جب بھی گھر میں ہوتا، بہنیں ڈری ہوئی رہتی تھیں، مگر بسمہ پھر بھی شہران سے فری تھی، اسے تڑتڑ جواب دے کر لا جواب کر دیتی تھی، شہران واحد بسمہ کو کچھ نہیں کہتا تھا، یا اب حرام جب سے اس گھر میں آئی تھی وہ ادب و لحاظ میں رہنے لگا تھا، چیخ و پکار کچھ کم ہو گئی تھی، مگر محمد احمد سے اس کی طنزیہ تکرار چلتی ہی رہتی تھی، کب سے وہ کچن میں تھی اور وہ روم میں تھا، آج بہت خوش بھی تھا۔ اسے مقامی کالج میں لیکچرار کی جاب مل گئی تھی، تنخواہ بھی ٹھیک ٹھاک تھی، حرام کو وہ یہ خبر سنانا چاہتا تھا مگر وہ ایسی مصروف تھی کہ ایک دفعہ بھی روم میں نہیں آئی تھی۔

”بسمہ.... بسمہ!“ اس نے صحن میں گزرتی بسمہ کو آواز دی۔

”جی بھائی جان!“ وہ دوڑ کے اندر آئی۔

”اپنی بھابی کو اندر بھیجو۔“ اسے یوں بلانا بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا، مگر جب صبر نہیں ہوا تو بلانا پڑا۔ وہ سر ہلاتی ہوئی چلی گئی، وہ وارڈ روم کھول کے کپڑے نکالنے لگا، آج حرام نے وہ بھی نہیں نکالے تھے، کچھ ہی دیر میں اورنج پرنٹڈ کٹن کے کپڑوں میں ملبوس تھکی تھکی اندر آئی، اپنا حلیہ اس نے بالکل گھریلو سا بنالیا تھا، ذرا بھی خود پر توجہ نہیں دیتی تھی، پھر ذیشان بھی خود نہیں بولتا تھا، کیونکہ ابھی وہ برسر روزگار نہیں ہوا تھا، اسے خود سے کوئی شاپنگ بھی نہیں کر دائی تھی، حمیرا بیگم نکاح پر جو چند سوٹ لے کے گئی تھیں، وہی وہ پہنتی تھی یا پھر گھر سے رخصت ہوتے وقت اس کی امی نے ایک سوٹ کیس دیا تھا، جس میں اس کے کپڑے اور ضرورت کی چند چیزیں تھیں۔

”سوری میں کچن میں ہی لگی رہی، آپ کے کپڑے نکالنا بھول گئی۔“ حرام کو شرمندگی ہوئی۔

”کچھ وقت مل سکتا ہے آپ کے اس مظلوم شوہر کو؟“ لہجے میں شوخی دارنگی سموئے اسے میٹھی میٹھی نظروں سے دیکھا۔

(جاری ہے)

شنا خان صنعا

مکمل ناول

بھاری گلابی دلوں میں

پہلے نیچے گرتا اس پر چھینا جھپٹی کرتے فضا میں نٹ کھٹ سا شور بیدار کرتے تو پرندے کیوں پیچھے رہتے وہ بھی اپنے اپنے راگ الاپنے میں سب سے آگے آگے تھے وہیں مہیرہ بھی جاگنگ کرتی اس ماحول میں خود کو فٹ کئے ہاتھ میں رجسٹر تھامے رٹے لگانے میں منہمک تھی ایک نظر رجسٹر پر ڈالتی پھر چہرہ دوسری سمت کر کے اسے ریٹ کرتی پارک میں موجود تقریباً سبھی لوگ اس کی طرف متوجہ تھے کہ محترمہ میں سکون نام کی کوئی چیز کیوں نہیں؟ کبھی اس حصے میں جاتی جہاں اپنی شیٹ بچھا کے فروٹس جو سبز بکس رکھے ہوئے تھے وہاں جا کے سیب اٹھاتی پھر بھاگتی ہوئی رٹا لگانے میں محو ہو جاتی تو کبھی رجسٹر کے جوس پیئے بیٹھ جاتی کبھی بچوں کو دیکھتی ان کی شرارتوں پر مسکراتی کچھ یاد آنے پر پھر سے بکس پر واری صدقے جاتی اور خود کو کتنا کیڑا ظاہر کرتی۔

”گڈ مارننگ مہیرہ ہاؤ آر یو.....؟“ انھی وہ جوس کا دوسرا گلاس اٹھا کے پیئے ہی لگی تھی جب اپنے قریب اسے عمیمہ کی پھولی پھولی سانس میں قدرے بھاری سی آواز سنائی دی تو مہیرہ نے اپنے عنابی لبوں پر دھیمی سی مسکان سجائے فائن کہتے ہوئے اپنے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا تو وہ اس کے پاس دھم سے بیٹھ گئی اور سیب کھانے لگی۔

پارک میں صبح صبح کا دل کش سا نظارہ ماحول کی رعنائی کو بڑھاتا تھا جہاں کچھ عورتیں واک کر رہی تھیں تو کچھ بزرگ ہاتھوں میں تسبیح تھامے محو گفتگو تھے وہیں کچھ شریر سے بچے باغ میں لگے امرود کے درخت پر پتھر مارتے اور جو



ہم نوید کے دس فون آچکے ہیں وہ صرف میری وجہ سے رکے ہوئے ہیں ورنہ کب کے نکل جاتے، تم آغا جان کو سمجھاؤ کہ روئیل کی شادی کر دیں، مجھے کافی ٹائم بھی لگ سکتا ہے آنے میں۔ گل کو تفصیل بتاتے ہوئے وہ اٹھ کے دراز سے کچھ ڈھونڈنے لگا۔

”اور تم کشمیر جہاد کرنے ماں باپ کی بناء اجازت کے جاؤ گے.....؟“ گل نے حیرت سے فضیل کو دیکھا جو جلدی جلدی سے ڈائری میں کچھ لکھنے میں مصروف تھا۔

”یا گل ہوں ناں میں کہ انہیں انفارم کر دوں اور وہ تو جیسے مجھے بخوشی بھیج دیں گے تف ہے تم پر مس گل لالہ! اور ویسے بھی ابھی تو ٹریننگ ہے جب مکمل سیکھ لی تو اجازت سے ہی جاؤں گا اب آیا اس تربوز میں۔“ پہلے تو اس پر کف ملتے کہا پھر اس کا سر پکڑ کے ہنسی دباتے استفسار کیا تو وہ اس کا ہاتھ جھٹک کے چادر درست کرنے لگی، مگر لب خاموش ہی تھے۔

”اچھا اب لاسٹ والی پکی سوری کہ میں تربوز کے بجائے اس کا کوئی اور ڈسینٹ سامان رکھ دوں گا مگر تم وعدہ کرو کہ آغا جان سے بات کرو گی۔“ فضیل نے ڈائری سائیڈ پر رکھی جس میں وہ نمبر فیڈ کر رہا تھا اور گل کے سامنے آتے ہی اپنی ہتھیلی اس کے سامنے کی تو گل نے جھٹ سے سامنے ریک میں رکھی اپنی سینڈل اٹھا کر اس کے ہاتھ پر رکھی اور بھاگ گئی فضیل نے پہلے سینڈل کو گھورا پھر اسے دوسری طرف اچھال کے بیڈ پر رکھی ڈائری اٹھالی۔



”مام ابھی ایگزٹام سے فارغ ہوئی ہوں پلیز جانے دیں ناں ٹرپ پر مجھے۔“ مہیرہ چہرے پر دنیا جہان کی مسکینیت طاری کرتے ہوئے سراپا التجا بنی ندا بیگم کو ان کے ارادے میں ناکام بنا رہی تھی کیونکہ وہ بھیجنا نہیں چاہتی تھیں اور یہ رکنا نہیں چاہتی تھی۔

”جانو پلیز تنگ مت کرو آپ کے پاپا بھی ایڑیاں ہو جائیں گے اور میں خود بھی اچھا ایسا کرتے ہیں کہ ہم تینوں چلتے ہیں کیسا.....؟“ ایپرن باندھتے ہوئے انہوں نے تجویز دی جو کہ مہیرہ کو ذرا نہ بھائی کیونکہ پاپا کی میٹنگز ہی ختم نہیں ہو رہی تھیں اور وہ اپنے کالج گروپ کے ساتھ جانا چاہتی تھی۔

”مام! ہم بھی چلیں گے لیکن مجھے کالج ٹرپ کے ساتھ جانا ہے یہ تو موقع بار بار نہیں ملے گا اور پھر حنا طے آپی ہیں ناں آپ ان سے کانٹیکٹ میں رہیں گی تو بوریت آپ کو دور سے دیکھتی بھاگ جائے گی۔“ وہ شیلف پر بیٹھی ابلے ہوئے چنے کھا رہی تھی۔ مام کے جواب پر کھسکتے ہوئے ان کے قریب آ کے اس نے پوچھا تو ان سے اس کا لاچار اور اتر چہرہ دیکھنا گیا۔

”اچھا بابا جاؤ تیاری پکڑو میں تمہارے پاپا سے بات کر لوں گی خوش۔“

”وہ مارا۔“ فضا میں مکالہراتے ہوئے چٹا چٹ مام کے رخساروں کو چومتی وہ پل میں غائب کچن سے۔



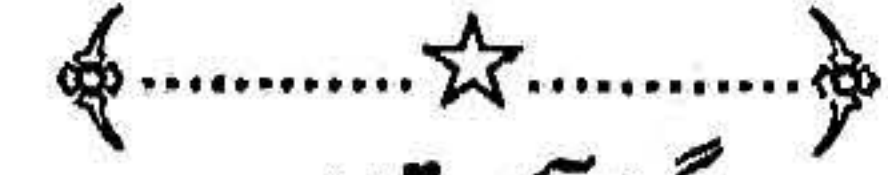
”سو گریش..... عمیمہ کتنے جاذب نظر دل میں اتر جانے والے مناظر ہیں میرا دل کر رہا ہے گاڑی رکوالیں یہاں۔“ مہیرہ مسحور کن احساس میں ڈوبی دونوں ہاتھوں کی انگلیاں پھنسائے کھڑکی سے ناک چپکائے بیٹھی تھی۔ پورا گروپ بہت خوش تھا کچھ لڑکیاں مہندی لگا کے دوران سفر اسے یادگار بنا رہی تھیں تو کچھ موویز بنانے میں مشغول تھیں صاف ستھری سڑک کے اطراف میں لگے درخت جو کہ ہوا سے لہراتے ہوئے بہت خوبصورت لگ رہے تھے وہیں نیلے گگن پر اکا دکا انگلیاں کرتیں چند بدلیاں بری بھری اوپر نیچے آتی ڈھلوان سطح جس پر کچھ پرندے مختصر قیام کے لئے

”پیسپر کی تیاری کیسی رہی.....؟“ مہیرہ نے تھرماس میں سے اس کے لئے جوس نکالتے ہوئے پوچھا جو سب کھاتے ہوئے رجسٹر چیک کر رہی تھی۔

”فٹنا سنگ یار! تمہیں پتہ تو ہے کہ میں اپنی ٹائم کچھ نہیں کرتی تمہاری طرح۔“ عمیمہ نے مسکراتی آنکھوں سے کہتے ہوئے مہیرہ کو چھیڑا مگر وہ اس کی بات ناک پر بیٹھی کبھی کی طرح اڑا گئی۔

”اور تمہیں یہ بھی پتہ ہے کہ تم چاہے چار ماہ پہلے تیاری شروع کرو مگر مہیرہ عدیل نہیں بن سکتیں کیونکہ میں رسک لیتی ہوں اور ہمیشہ کامیاب رہتی ہوں انڈر اسٹینڈ مائی فرینڈ۔“ بائیں آئی برو کو اوپر اٹھاتی وہ اک ادا سے چہرہ اونچا کئے عمیمہ کو خوشی سے دیکھنے لگی۔

”یس جی آئی نو چلو اب جلدی سے گھر کی راہ لیں ریڈی ہو کے کالج بھی نکلنا ہے۔“ عمیمہ نے جلد ہی اس سے ایگری ہو کے سامان سمیٹنا شروع کر دیا ایک تو آج پہلا پیسپر تھا دوسرا مہیرہ سے بحث میں کوئی جیت نہیں سکتا تھا۔



”مگر تمہاری بات اس مرتبہ نہیں مانی جائے گی سمجھے تم۔“ سردار جہانداد ملک نے سختی سے اپنے سامنے بیٹھے سپوت کو ڈپٹا۔

”لیکن آغا جان! اس میں حرج ہی کیا ہے آپ خواخواہ بات کو انا کا مسئلہ بنا رہے ہیں۔“ فضیل ملک نے جھنجھلا کر کرسی کے ہتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا مگر مقابل اس کے والد تھے۔

”فضیل کی ماں! اسے کہو یہاں سے چلا جائے ورنہ.....“ سردار صاحب نے کھر درے لہجے میں اپنی زوجہ سے کہا جو یاس بیٹی ان کی تکرار سن تو رہی تھیں مگر اس ماحول سے انجان بنی بیٹھی تھیں۔

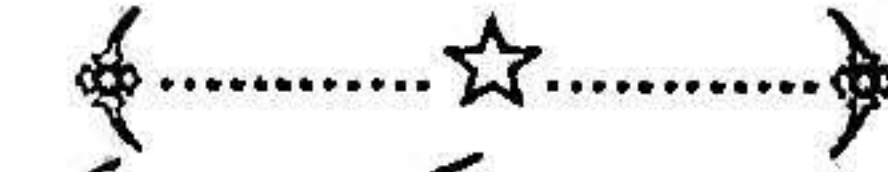
”فضیل پتر! ابھی تم باہر جاؤ پھر بات ہوگی شاباش۔“ انہوں نے آنکھوں سے اسے سمجھاتے ہوئے پچکارتے ہوئے کہا تو وہ چپ کر کے باہر نکل گیا۔

”سردار صاحب! یہ اب بچہ نہیں ہے سنبھالیں خود کو اس طرح تو آپ خود اسے ضدی بنا رہے ہیں تسلی رکھیں۔“ ریٹا بیگم نے انہیں پانی پلایا اور سمجھانے لگیں۔

”مگر وہ نالائق پیار سے مانتا بھی تو نہیں ہے۔“ اپنی چادر کا کونہ جھٹک کر پھر سے کندھے پر ڈالا۔

”مان جائے گا مجھے تھوڑا ٹائم دیں ویسے اس کی بات بھی غلط نہیں اور نہ ہی ناجائز اگر ہم پہلے.....“

”خاموش اب ایک لفظ نہیں اگر اس کی ضد ہے تو پھر یاد رکھے وہ کہ ہم اس کے باپ ہیں بات سمجھے.....“ ریٹا بیگم کے مزید کچھ کہنے سے پہلے انہوں نے غصے سے دھاڑ کے انہیں خاموش کروادیا اور خود کمرے سے نکل گئے تو ریٹا بیگم سر جھٹکتے ہوئے سوچ میں ڈوب گئیں کہ کیا کریں.....؟



”دیکھو! اس میں مضائقہ کیا ہے فضیل آغا جان جو کہتے ہیں وہ کر لو پھر روئیل تم سے دو سال چھوٹا ہے اس طرح تو.....“

”اپنے یہ چینی کے بھاؤ جتنے مہنگے مشورے دماغ کی کسی سیف لاکر میں لاک کر کے رکھو کبھی تمہارے اپنے کسی کام آئیں گے ہونہ..... روئیل چھوٹا ہے۔“ فضیل نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکا اور تنگ کے بات کے آخر میں اس کی نقل اتاری تو گل نے منہ پھلا کر دوسری طرف کر لیا۔

”گل پلیز..... ٹرائی ٹو انڈر اسٹینڈ یار میں ابھی اپنے گروپ کے ساتھ کشمیر جانا چاہتا ہوں وہاں جہاد کریں گے

”شہوار بیٹا! جلدی کرو پھر فیصل نے بھی جانا ہے۔“ رینا بیگم نے اپنی بیٹی سے کہا جو فائل تیار کر رہی تھی۔
 ”چلیں مہاجی! میں ریڈی ہوں! اسامہ کہاں ہے.....؟“ کان میں جھکا ڈالتی وہ پورچ تک آئی۔
 ”ہاں وہ فیصل کے پاس ہے بے فکر رہو۔“ سارا سامان چیک کرتے ہوئے انہوں نے ڈرائیور سے چلنے کو کہا۔

پھر گل کو انگوٹھی پہنائی گئی خوب ہنگامہ برپا کیا، پھر شہوار گل کو زبردستی اپنے ساتھ لے آئی۔
 ”اچھا بیٹا! اپنا خیال رکھنا یاد سے فون کرتے رہنا۔“ رینا بیگم نے دھاگہ اس کے دائیں بازو پر باندھتے ہوئے رقت بھرے لہجے میں کہا پھر اس کی پیشانی چومتے ہوئے کافی دعائیں پڑھ کے اس پر پھونکیں ماریں گاڑی تک جاتے جاتے فیصل نے بیلوں کی اوٹ میں کھڑی گل کی آنکھ سے آنسو اپنی پور پہ سمیٹا تو وہ شپٹا سی گئی۔
 ”مجھے آنسوؤں کی نہیں دعاؤں کی ضرورت ہے سمجھیں، چلو جلدی سے آنسو صاف کرو اور مسکراؤ۔“ گل کے رخسار کو تھپتھپاتے ہوئے شوخ ہوا تو گل نے اسے بری طرح گھورا۔
 ”بدتمیز پیچھے ہٹو آغا جان دیکھ رہے ہیں۔“ تو وہ ہنس پڑا پھر سب سے ملتے ہوئے وہ گاڑی میں جا بیٹھا۔ گل بے دھیانی میں کافی دیر ہاتھ ہلاتی رہی حتیٰ کہ وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔
 ”گل جی! وہ جا چکا ہے آپ واپس آ جائیں مراقبہ سے۔“ شہوار نے اس کی کیفیت سمجھتے ہوئے اس کے سامنے چٹکی بجائی تو وہ برستی آنکھوں سے شہوار کو کہنے لگی۔

”وہ جلدی آ جائے گا ناں.....؟“

”اوں ہوں..... ٹینس نہیں یاد دعا کرو کہ وہ کامیاب رہے اور خیریت سے پہنچے۔“ اس کے آنسو پونچھتے گلے سے لگائے وہ خود بھی اندر سے افسردہ تھی۔



کشمیر پوائنٹ پر گھومتے ہوئے وہ سب نے حد خوش تھے پھر آگے جا کے انہوں نے آزاد کشمیر میں اسٹے کیا وہاں کی خوبصورتی جتنی سنی تھی اس سے بڑھ کے دیکھی، بہتی ٹھنڈی آبشاریں تازہ پھلوں کے باغات دور تک نظر آتی ہریالی، کھٹا کھٹ سب کے کمرے اور موبائل ان مناظر کو ساکت قید کرنے میں مصروف تھے کوئی ٹھنڈی آبشاروں سے کھیلے ہوئے پانی اک دو بے پروا لے لگے تو کوئی پہاڑیوں پر چڑھ کے دور میں سے نظارے لیتے محظوظ ہو رہے تھے مہیرہ بھی سب کی موویز بنا رہی تھی۔ پھر وہ پہاڑی سلسلوں کی سمت آگئی وہاں اس نے اپنی خود کی مووی بنائی پھر بادام کے درختوں سے بادام توڑے وہیں اس نے ایک قریبی ہوٹل پر تندور میں روٹی لگاتے پٹھانوں کی بھی مووی بنائی، یکدم اس کی نگاہ ایک قدرت کے شاہکار پر جم سی گئی جہاں اک چھوٹی سی ندی پہاڑیوں کے درمیان سے بہہ رہی تھی اس کے دونوں اطراف بہت شوخ رنگ کے پھول کھلے تھے جن پر رنگ برنگی تتلیاں اڑتی ہوئی یوں محسوس کروا رہی تھیں جسے پکڑن پکڑائی کھیل رہی ہوں وہ ارد گرد سے بے خبر کیمرا تھامے لبوں پر دلفریب سی مسکان لئے آنکھوں میں الوہی سی چمک پیدا کئے وہ آگے کو بڑھی دفعتاً اس کی سینڈل پاؤں سے سلپ ہوئی تو ایک نسوانی چیخ چاروں اور گونج اٹھی جس جگہ مہیرہ تھی وہاں اکاڈ کالوگ تھے انہوں نے آواز کا تعین کرنا چاہا مگر نہ کر سکے۔
 ”مقصود بھائی! آپ نے نسوانی چیخ سنی۔“

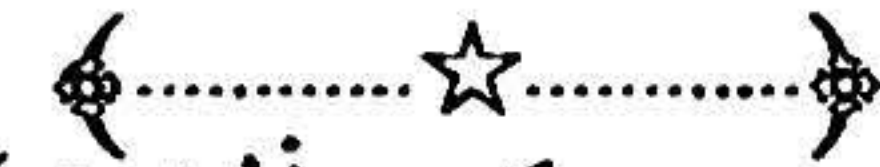
”ہاں یار سنی تو ہے مگر گونج چاروں طرف سے آئی ہے ایسا کرو دو دو لڑکوں کا گروپ بنا کے اس پہاڑی کے چاروں طرف جاؤ میں یہاں سے جاتا ہوں کم آن۔“ مقصود نے تین دو لڑکوں کی ٹولیاں بنا کر چاروں طرف بھیج دیں

بیٹھے وہاں کی رونق بڑھ رہی تھی۔ پھر ایک خوبصورت سے پبلک پوائنٹ پر وہ اترے وہاں خوب انجوائے کیا کھایا مہیرہ منہ دھونے واش روم جانے لگی تو اس کے کلاس فیلو آ ذرنے اسے روکا۔

”مہیرہ! ایک منٹ بات سنو۔“ اور وہ رک کر اسے دیکھنے لگی وہ کمال پھرتی سے واش روم میں جا گھسا پھر دروازے سے منہ نکال کے بولا۔

”تم ایک منٹ واسق کی کوئی بھی بات سنو میں آیا۔“ چٹکی بجاتے شرارت سے دروازہ بند کر گیا تو عمیمہ واسق اور مہیرہ اس کی چالاکی پہ ہنس پڑے۔

”چلو بچوں جلدی سے واپسی کی تیاری کرو۔“ میڈم کی پکار پر سب نے لبیک کہا اور گاڑی میں بیٹھنے لگے۔
 ”گاڑی تک جاتے ہوئے موبائل کا ٹارچ جلا لو اور روشنی مجھ پر اور واسق پر رکھنا مہیرہ!“ عمیمہ ”نشاط، عزیز آ ذر“ واسق اور مہیرہ بس میں جانے لگے تو آ ذر کی بات پر پرس سے چیونگم نکالتی مہیرہ نے الجھتی نظروں سے آ ذر کو دیکھا۔
 ”اصل میں رات کافی ہو گئی ہے اور میرا واسق کا رنگ بھی کالا ہے سو مجھے ڈر ہے کہین ہم اندھیرے میں گم ہو جائیں اور تم ہمیں یہیں بھول جاؤ۔“ شرارت سے چمکتی آنکھیں مگر لہجے میں بھولپن لاتے ہوئے وہ سب کو پسینے مچے مجبور کر گیا، کیونکہ آ ذر کا رنگ صاف تھا واسق کا سانولا واسق کو چڑ بھی بہت تھی کہ کوئی اسے کالا نہ کہے مگر آ ذر کے سامنے بے بس سا ہو جاتا جیسے ابھی ہوا تھا۔



”میں نے کہہ دیا اب کچھ کہا تو مجھ سے بات مت کرنا۔“ فیصل کے کپڑوں کی تہہ لگاتے ہوئے رینا بیگم نے تنبیہ کی تو کچھ کہنے کے لئے اٹھتا فیصل واپس بیٹھ گیا۔

”ٹھیک ہے جو آپ کی مرضی۔“ بالآخر وہ ہتھیار پھینک کے ہونٹ بھیج گیا۔
 ”جیتے رہو! خدا ہر قدم پر کامیابی دے میرے بیٹے کو۔“ رینا بیگم نے بیگ کی زپ بند کرتے ہوئے دعاؤں کے پھول فیصل پر نچھاور کئے اور کمرے سے باہر آتے ہوئے وہ ملازمہ کو آواز دیے لگیں۔

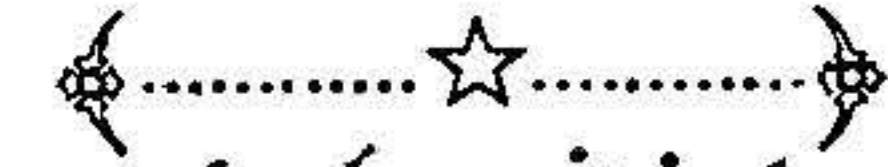
”رافعہ اری اور رافعہ! کہاں مر گئی جلدی آ۔“ خود اپنا دوپٹہ ٹھیک کرتیں وہ سردار صاحب کے پاس آ بیٹھیں جو ٹانگوں تک کمبل اوڑھے ٹی وی دیکھ رہے تھے۔

”جی وڈیری حکم کریں۔“ گھر کی ڈسٹنگ کرتی رافعہ بی بی ہانپتی کانپتی وارد ہوئی اور مودب ہو کر پوچھنے لگی۔
 ”ایسا کرو ابھی سردار شجاعت کے گھر جاؤ اور انہیں پیغام دو کہ ہم کچھ دیر میں گل بی بی کی رسم ادا کرنے آرہے ہیں۔“ ان کی آمد پر کوئی نوٹس نہ لینے والے سردار جہاندار ملک نے ان کی بات سن کر منہ میں پھنسنے نہیں دیکھا اور ٹی وی آف کر دیا تو رینا بیگم انہیں حیران دیکھ کر مسکرائیں۔
 ”جی سردار صاحب! اپنا فیصل مان گیا منگنی کے لئے۔“

”ارے واہ نیک بخت! بلاؤ ذرا اس گدھے کو خواخواہ میرا بلڈ پریش ہائی کئے ہوئے تھا۔“ خوشی سے ان کی آواز بھیگ گئی کیونکہ سردار شجاعت ان کے چھوٹے بھائی تھے جن کی پانچ بیٹیاں تھیں اور ایک سب سے چھوٹا بیٹا جو کہ 9th کا اسٹوڈنٹ تھا ان کی بڑی خواہش تھی کہ دو بھتیجیاں ان کی بہو بنیں ان کے تین بیٹے ایک بیٹی بھی جسے وہ بیاہ چکے تھے۔

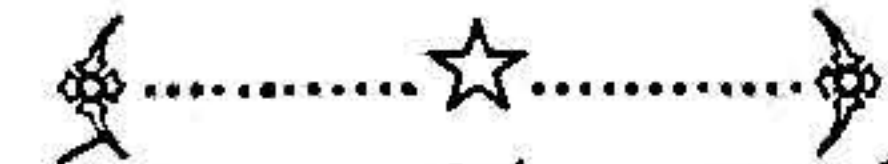
”جی آغا جان! آپ نے یاد کیا۔“ فیصل ان کے سامنے آکھڑا ہوا تو انہوں نے اپنی بائیں پھیلا دیں وہ بھی ننھے بچے کی طرح ان میں سما گیا۔

اور خود بھی گہرائی میں اترنے لگے۔



”میڈم! مہیرہ کہاں ہے.....؟ ایک گھنٹہ ہو گیا نظر نہیں آئی۔“ عیمہ پریشان سی میڈم عذرا کے پاس آئی۔
 ”یہاں قریبی ایک ہوٹل ہے جس کے پاس پہاڑی آبشاریں ہیں وہاں تک کا کہہ کر گئی تھی کمال ہے ابھی تک آئی نہیں چلو آؤ پتہ کریں۔“ میڈم سراغ باز کے پاس آئیں تو وہ بھی گھبرا گئیں۔
 ”کہاں جاسکتی ہے اکیلی بچی شام کے سائے بھی گہرے ہو رہے ہیں اللہ رحم کرنا ہم پر کسی کی امانت ہے سب لڑکوں سے کہو اسے ڈھونڈیں اور ہاں اس کے موبائل پر رٹائی کیا.....؟“ سراغ باز کے کہنے پر وہاں ایک کھلبلی سی بچی گئی سب ادھر ادھر بھاگنے لگے، مگر 4 گھنٹے کی تک دو کے بعد بھی وہ کوئی سراغ نہ لگا سکے کیونکہ رات کافی گہری ہو گئی تھی اور صبح انہیں نکلنا تھا، تمام گروپ اداس اور سہا سہا تھا، عیمہ تو رورو کے بلکان ہو گئی سب نے بہت سی دعائیں مانگیں صبح پھر تلاش میں نکلے مگر بے سود کیونکہ وہاں پہاڑیوں کے اطراف میں اتنی گہرائی تھی کہ دیکھتے ہی چکر آنے لگتے اور انہیں معلوم بھی نہ تھا کہ وہ کس طرف گئی ہے، ملول سے وہ سب واپس ہوئے، میڈم اور سراغ باز کی ہوائیاں اس وقت اڑ گئیں جب نڈائیگم یہ سن کر کہ ”مہیرہ کہیں کھائی میں گر گئی کہاں گری یا گئی معلوم نہیں“ ہم نے بہت تلاش کیا مگر..... وہ بے ہوش ہو گئیں حظلہ اور حناطہ نے رورو کر اسپتال سر پر اٹھا لیا وہ کل ہی دوپٹی سے آئیں تھیں کہ مہیرہ کو سر پر اتر دیں گے مگر انہیں کیا پتہ تھا کہ خدا نے ان کے لئے ایک اذیت ناک سر پر اتر رقم کر رکھا ہے، پنا خود میں حوصلہ پیدا کئے وہاں پہاڑیوں پر جانکے۔

دس دن کی تلاش بسیار کے بعد بھی کوئی سراغ نہ ملا تو وہ حوصلہ ہارنے لگے، نڈائیگم کا تڑپنا بیٹیوں کا سسکنا ان سے دیکھنا نہ جاتا، وہ بھی دن رات دعا کرتے۔
 ”اے خدا اگر وہ کہیں گر کے مر گئی تو اس کی باڈی ہی مل جائے کم سے کم ہمیں سکون تو مل جائے۔“ مگر ان کی دعا ابھی قبولیت کے شرف سے محروم تھی۔



”سنو گڑیا! یہ لو پانی پیو شہاباش آنکھیں کھولو۔“ مہیرہ کو محسوس ہوا کہ کہیں دور سے اسے آواز آرہی ہے اس کے رخساروں کو کوئی ہولے ہولے تھپتھپا رہا ہے، وہ آنکھیں کھولنے کی کوششیں کرتی مگر اس کی آنکھیں روشنی سے چند ہیاری تھیں پوٹے اتنے بھاری ہو گئے تھے سوزش کی وجہ سے کہ اٹھانا محال لگ رہا تھا، صرف پلکیں تھیں جو جنبش کر رہی تھیں۔ مقصود بھائی نے شکر کا سانس لیا اور چیخ کی مدد سے پانی اس کے منہ میں ڈالا وہ تقریباً چار گھنٹوں بعد ہوش میں آئی تھی اس کے دائیں بازو میں اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ حرکت نہ کر سکے گا، گردن میں بھی بری طرح اکڑاؤ آ گیا تھا، پورے جسم میں درد اس قدر شدید تھا کہ وہ ضبط کے باوجود بند آنکھوں سے آنسوؤں کے جھرنے کو بہنے سے نہ روک پائی۔

”مام..... مام.....“ بالکل بے آواز اس کے ہونٹوں نے جنبش کی اور درد میں ماں کو پکارا مگر اس کی آواز کوئی نہ سن سکا۔

”سسر! آنکھیں کھولو ہمیں بتاؤ آپ کون ہو آپ کا نام کیا ہے ہم آپ کو آپ کے گھر چھوڑ کے آئیں۔“ اس نے ہزار ہمتیں مجتمع کر کے اپنی آنکھیں کھولیں وہاں موجود مقصود بھائی کے ہمراہ کھڑے فضیل کا دل اس کی بڑی بڑی سنہری آنکھیں دیکھ کر ڈانوا ڈول ہوا، حقیقتاً فضیل نے اتنی بڑی اور پرکشش آنکھیں نہیں دیکھی تھیں۔

”میں..... کہاں..... ہوں.....؟“ درد کو دبائے دقت سے اس نے پوچھا۔
 ”گڑیا آپ اس وقت کشمیر کے ایک گاؤں میں ہو جلدی سے کوئی نمبر اور گھر کا ایڈریس بتاؤ۔“ مقصود بھائی نے پانی سائیڈ پر رکھ کر نرم لہجے میں پوچھا۔

”نمبر..... ایڈریس.....؟“ غائب دماغی سے انہیں دیکھتے ہوئے اس نے الجھ کر پوچھا تو اس کے انداز پر دونوں ٹھٹھک گئے۔

”جلدی بتائیں محترمہ! کون ہیں آپ آپ کا نام کیا ہے.....؟“ اب کے فضیل نے روکھے اور کرخت انداز میں دریافت کیا تو مہیرہ سہم سی گئی۔

”مجھے..... نہیں..... پتہ میں..... کون ہوں.....؟“ وحشت زدہ چہرہ لئے وہ بے بسی سے بولتی رو پڑی تو فضیل اور مقصود بھائی نے ایک دوجے کو دیکھا۔

”سنیں سسر! آپ ہمیں ایک کھائی سے ملی ہیں اور ہم مجاہد ہیں یہاں سے گزر رہے ہیں آپ بے ہوش ملیں ابھی آپ ایسا کریں کہ میرے گھر چلیں یہ ہمارے ایک دوست کا گھر ہے جو نزدیک تھا تو یہیں آپ کو لے آئے“ میرے گھر میں ایک آپ جیسی بہن ہے اور ماں ہے ابھی وہیں لے کے چلتے ہیں آپ کو۔“ مقصود بھائی نے اپنے مخصوص نرم سے لہجے میں تمام روداد اسے سنائی مگر اس کی سنہری آنکھوں میں ابھی تک ایک انجانہ سا خوف کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔

”آپ مجھے میرے گھر..... پہنچا دیں گے۔“ رندھے لہجے میں کہتی وہ فضیل کو بے چین سا کر رہی تھی وہ اپنی اس نئی اور پریشان کن کیفیت پر خود کو بار بار ڈپٹ رہا تھا۔

”ہمارے پاس آسمان سے وحی نہیں اتری جو آپ کو آپ کے گھر پہنچا دیں، نام تک یاد نہیں تو کہاں چھوڑ کے آئیں جو مقصود بھائی نے کہا ہے وہ کر لیں۔“ اپنی کیفیت کو سختی کے پردے میں چھپائے وہ مہیرہ پر برستا مقصود بھائی کو حیران اور مہیرہ کو پشیمان کر گیا۔
 ”کول ڈاؤن یار۔“

”اٹھو سسر! تھوڑا سا چلو پھر گاڑی میں بیٹھتے ہیں یہاں کا رستہ ٹھیک نہیں تو گاڑی نہیں آسکتی۔“ وہ میکانیکی انداز میں اٹھی مگر دوسرے لمحے آہ کہہ کر پھر سے بیٹھ گئی۔

”فضیل یار! ایک طرف سے تم سہارا دو اسے۔“ مقصود بھائی کے اس نئے آڈر پر وہ آف کر کے رہ گیا، پھر مہیرہ کا بازو اپنے شانے پر رکھے وہ دانت پر دانت جمائے سختی سے لب بھینچے چلنے لگا پھر جلد ہی وہ گاڑی تک پہنچ گئے۔

”کیا.....؟ اچھا تم فکر مت کرو نوید سے کہنا میں ابھی نکلتا ہوں پیچھے کی پرواہ مت کرو تم خدا حافظ۔“ مقصود بھائی کے موبائل پر دانیال کی کال آئی، ان کے چند مجاہد شہید ہو گئے تھے جو اب ان لوگوں نے بھی ان کے کمپ پر حملہ کیا مگر اسلحہ کم بڑنے کی صورت میں نوید نے مقصود بھائی کو بلایا جو ان سب مجاہدوں کے سردار تھے۔

”فضیل! تم اسے لے کر گھر جاؤ مجھے نوید کے پاس جانا ہے، میں رات تک تمہیں کال کر کے بتا دوں گا کیا صورتحال ہے اللہ نگہبان۔“ گاڑی رکوا کر وہ اتر گئے تو فضیل نے سر ہلا دیا۔ پھر گاڑی گھر سے چند قدم کے فاصلے پر رک گئی، فضیل نے سہارا دے کر اسے گاڑی سے نکالا تو اس وقت صبح معنوں میں اس کا دل کانوں میں دھڑکنے لگا، نجانے کون سی کشش تھی جو اسے مہیرہ کی طرف متوجہ کر رہی تھی، حالانکہ وہ اور گل بچپن سے ایک دوجے کو چاہتے تھے دو دن پہلے وہ ہر طرح سے مطمئن تھا اپنی زندگی سے مگر اب.....

”مجھ سے نہیں چلا جا رہا اب۔“ گاڑی سے نکل کر دو قدم ہی چلی تھی جب تھک کر وہ فیصل کے کندھے پر سر ٹکا گئی فیصل ساکن رہ گیا۔

”بس ہمت کرو اب تو وہ بنائے ہے گھر۔“ فیصل نے اسے خود سے دور کرتے متوازن لہجے میں کہا تو مہیرہ بخار درد کی شدت کی تاب نہ لا سکی اور ٹوٹی ہوئی شاخ کی مانند فیصل کے سینے سے جا لگی اس نے گھبرا کر مہیرہ کا چہرہ اونچا کیا مگر وہ بے سدھ تھی اس نے بنا کچھ سوچے اسے بانہوں میں اٹھایا اور گھر کی جانب چل پڑا۔

☆.....☆.....☆

دروازہ کھلا ہی تھا جب وہ مہیرہ کو لئے اندر داخل ہوا، کشمالہ گندم صاف کر رہی تھی اور بی جان صاف ہوئی گندم بور یوں میں بھر رہی تھیں، فیصل کو دیکھا تو جلدی سے اس کے پیچھے آئیں وہ اسے بیڈ پر لیٹا کر سیدھا ہو ہی رہا تھا کہ وہیں رک گیا کشمالہ نے دیکھا کہ مہیرہ کے بال اس کے ٹخن میں پھنس چکے ہیں، فیصل نے بہت چاہا کہ نرمی سے نکل جائیں مگر وہ نہ نکلے تو کشمالہ نے پیچھی سے ذرا سا کٹ لگا دیا۔

”یہ کون ہیں بھیا.....؟“ وہ بغور لڑکی کا جائزہ لینے لگی، جس کے مہرون گولڈن بال کندھوں تک تھے، ستواں ناک، بند آنکھیں اور باریک سے ہونٹ، بخار کی شدت سے سرخ پڑتا چہرہ بہت پیارا لگ رہا تھا۔

”مجھے تو خود نہیں پتہ کون ہے، ہم راستے سے آ رہے تھے جب یہ ایک کھائی میں گری ملی، مقصود بھائی نے گھر بھیج دیا مجھے لگتا ہے یادداشت چلی گئی ہے اس کی۔“ اپنے کالر کو درست کرتے اس نے کشمالہ سے کہا تو اس کے ہاتھ میں باریک نفس سا گولڈن کالر۔ سیلیٹ آ گیا، اس نے وہ ہتھیلی پر رکھا تو چین کے دونوں طرف انگش میں مہیرہ لکھا ہوا تھا جو چو کو رسالا کٹ تھا، گھڑی نما فیصل نے یونہی چیک کیا، تو لاک کھل گیا، اس میں ہنستی مسکراتی مہیرہ کی تصویر آویزاں تھی، پھر جلدی سے وہ بریسیلیٹ اس نے پاکٹ میں ڈالا اور برآمدے میں بی جان کے پاس آ گیا۔

”فیصل پتر! کس کی بچی ہے کہاں سے لا رہے ہو.....؟“ چھانچ ایک طرف رکھ کے انہوں نے بھی سوال پوچھا تو اس نے وہی تفصیل انہیں بتادی بی جان اپنی ٹھوڑی پکڑے سر کو دائیں بائیں ہلانے لگیں۔

”نجانے کس کے جگر کا ٹکڑا ہے کیا بیت رہی ہوگی اس کی ماں پر گھر والوں پر یا خدا یا رحم فرما۔“ اس نے ڈاکٹر صبیحہ کو دیکھا تھا وہ اپنے کلینک پر بیٹھی تھیں۔

”میں انہیں بلا کر لاتا ہوں۔“ فیصل اٹھ کر چلا گیا تو وہ کمرے میں آگئیں جہاں کشمالہ اس کے پاس بیٹھی تھی، تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر آگئی، چیک اپ کیا پھر دوائی دی۔

”صبح میرے کلینک لائیں لگتا ہے دماغ میں گہری چوٹ آئی ہے۔“ ڈاکٹر کہہ کر چلی گئیں۔

☆.....☆.....☆

”پاپا آپ اوصاف اور معصب سے کہہ دیں کہ ہم ابھی نہیں آسکتے، ماما کی حالت بھی ٹھیک نہیں۔“ حناطہ نے ندا بیگم کی چادر اچھی طرح ان پر پھیلاتے ہوئے عدیل صاحب سے کہا تو وہ سوچ میں پڑ گئے۔

”بیٹا! ایسا نہ ہو وہ برامان جائیں دو ماہ ہو گئے۔“ پاپا کے کہنے پر حناطہ ان کے سینے سے لگی رونے لگی۔

”مہیرہ کہاں ہوگی.....؟ کس حال میں ہوگی.....؟ یہ بات مجھے سونے نہیں دیتی تو پاپا آپ کی اور ماما کی کیا حالت ہوگی، مجھے بہت فکر ہے آپ کی اور ماما کی۔“ حناطہ کی بات نے ان کے دل پہ برجھی جلائی تھی مگر وہ اپنا دکھ بیٹیوں پر عیاں نہ کرتے۔

”بس چپ کر جاؤ میری جان! دعا کرو کہ اگر وہ زندہ ہے تو محفوظ ماتھوں میں ہو اور اگر.....“ اس کے بعد پاپا

خاموش ہو کے آنسو پینے لگے۔

☆.....☆.....☆

رپورٹ کے مطابق مہیرہ کی ایک وین ڈیوٹی ہو گئی تھی جس کی وجہ سے وہ ماضی بھول گئی تھی۔

”ہرے..... زیادہ اسماٹ بننے کی کوششیں کی تو مجھ سے برا کوئی نہیں سمجھے.....؟“ مہیرہ نے چھکا مارا مگر بد قسمتی سے وہ کیچ ہو گیا، لیکن وہ آؤٹ ہونے کو تیار نہ تھی سو غصے سے بیٹ زمین پر دبے مارا۔

”واقعی دیدی آپ سے برا کوئی ہو بھی نہیں سکتا کب سے کھیل رہی ہو مگر چار مرتبہ بھی آؤٹ ہونے پر ناٹ آؤٹ کہلوادیتی ہو مجھے نہیں کھیلتا۔“ ننھے کیلاش نے بال زبردستی اپنی پینٹ کی جیب میں گھساتے ہوئے ناراضی سے کہا تو کشمالہ ہنس پڑی۔

”مالا دیدی آپ تو آؤٹ ہو جاتی ہو مگر مہیرہ آپ کیوں نہیں مانتی بھلا یہ کوئی تک ہے۔“ کیلاش کے برابر کھڑے سورج نے بھی تنک کے کہا۔

”او جلدی سے بھاگو بھیا آگئے۔“ بناء اپنی باری کھیلے پسینے اور تھکن سے بے حال فاطمہ نے انہیں خبردار کیا اور دوڑ لگا دی تو کشمالہ نے بھی اپنا دوپٹہ درست کیا اور مہیرہ کا دوپٹہ مضبوط گرہ کی وجہ سے کھل نہیں رہا تھا کمر سے۔

”کیسی ہیں ہماری بہنا.....؟“ مقصود بھائی نے صحن سے بچوں کو فو چکر ہوتے دیکھا تو چلتے ہوئے ان کے پاس آ کر کے پھر دونوں کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

”ہم ٹھیک ہیں بھیا! بی جان آپ کو بہت یاد کرتی تھیں، ہم بھی کرتے تھے مگر وہ تو بہت کرتی تھیں۔“ بالا خر گرہ کھل گئی تو دوپٹہ سر پر الٹا سیدھا ڈال کے مہیرہ نے جواب۔

”ہم ہم..... جی جی تو ہم آگئے ویسے جن بچوں کے ساتھ یہاں کرکٹ کھیلی جارہی تھی ان میں سے کچھ ہندو بھی تھے.....؟“ مقصود بھائی کے سوال پر فیصل نے بھی دونوں کو دیکھا، کشمالہ سٹپٹا گئی وہ مطمئن کھڑی تھی۔

”جی بھیا! کیلاش اور سورج تھے ہمارے ساتھ، دونوں بہت معصوم اور پیار کرنے والے بچے ہیں۔“ کشمالہ کی نسبت اس نے بنا جھجکتے جواب دیا۔

”اؤکے مگر آئندہ ان کے ساتھ زیادہ فری نہیں ہونا نہ ہی وہ گھر آئیں گے۔“ فیصل نے دو ٹوک کہا، مہیرہ کے لب کھلتے دیکھ کر کشمالہ اس کا ہاتھ تھامے کچن میں گھس گئی۔

”چھوڑو میرا ہاتھ، مالا یہ کیا بات ہوئی وہ تو معصوم ہیں گر ہندو ہیں تو ان کا کیا قصور ہیں تو بچے۔“ اسی معصومیت کا فائدہ اٹھاتے ہیں وہ درندے، کسی بھی کرکٹ بال یا فروٹ باسکٹ میں بم فٹ کروا کے ان کے ہاتھ مسلمانوں کے گھر بھجواتے ہیں پھر چند لمحوں بعد بلاسٹ کر دیتے ہیں ایسے واقعات تین مرتبہ رونما ہو چکے ہیں کشمیر کے اس حصے میں اب یقیناً سمجھ آگئی ہوگی۔“ فیصل کو معلوم تھا وہ کچن میں ضرور کچھ نہ کچھ کہے گی اسی لئے مقصود بھائی کو کمرے میں بھیج کر وہ کچن میں آ گیا۔

”کک..... کیا..... بھیا.....؟“ کشمالہ نے دہل کر سینے پر ہاتھ رکھا چہرے کا رنگ مہیرہ کا بھی بدلاجے فیصل نے فوراً محسوس کیا۔

”ایسا ہی ہے آئندہ احتیاط کرنا اب اچھی سی چائے پلوادو کشمیری.....“ کشمالہ کا دھیان چائے پر لگا کے وہ ایک چور نظر مہیرہ پر ڈالے باہر نکل گیا۔

”گل پتر! کتنا عرصہ ہو گیا فضیل کا کوئی فون آیا نہ کوئی خبر تمہیں کچھ معلوم ہے.....؟“ رینا بیگم نے اداس سے لہجے میں گل کو مخاطب کیا جو خود بھی اندر سے عجیب ویرانی محسوس کر رہی تھی۔
”آٹھ ماہ ہو گئے تھے اسے گئے گنتی کے چند فون کئے آخری مرتبہ دو مہینے پہلے کال آئی تھی سرسری سی نہ آنے کی کوئی بات نہ اور کچھ خاص۔“

”نہیں بڑی امی! میرے پاس بھی کوئی فون نہیں آیا۔“ نظریں جھکائے وہ دھیمے سے گویا ہوئی۔
”اگر تم لوگ مجھے بتا دیتیں کہ وہ کس جگہ کس مقصد کے لئے جا رہا ہے میں کبھی اسے نہ جانے دیتی۔“ آنسو صاف کرتے وہ خود پر کف ملنے لگیں۔
”بڑی امی! اس نے مجھے اور شہوار کو اپنی قسم دی تھی اگر اس دن بھی آپ سن نہ لیتیں تو کبھی نہ بتا پاتی۔“ وہ بھی رونے لگی تو بڑی امی نے اسے ساتھ لگا لیا۔
”بس دعا کرو وہ جلد خیر و عافیت سے لوٹ آئے۔“ گل نے بلند آواز میں آمین کہا۔

”کیا چھپا رہی ہو مہیرہ بی بی.....؟“ کشمالہ چائے لے کر کمرے میں آئی تو مہیرہ نے سرعت سے کچھ چھپانا چاہا جسے کشمالہ تار گئی۔
”چھوڑ دیا! کچھ نہیں شکر ہے تم چائے لے آئیں۔“ مہیرہ نے بات آئی گئی کرنا چاہی کہ کمال چالاکی سے کشمالہ نے وہ چیز اس کے ہاتھ سے اچک لی۔
”اوتے ہوئے.....“ کشمالہ نے معنی خیزی سے وہ تصویر دیکھی اور وسل کی شپ میں لب سکوڑے مہیرہ مسکراتے ہوئے بیڈ پر بیٹھ کر دائیں پاؤں کا انگوٹھا پکڑے جھولنے لگی۔
”کتنی گھنی ہو سچی شکل سے دنیا جہاں کی معصوم اور بے خبر لگتی ہو مگر اندر سے پوری ہو۔“ اس کے برابر بیٹھتے ہوئے کشمالہ نے شرارت سے کہا تو مہیرہ بنا کہے اس کے کندھے پر سر رکھنے لگی۔
”ماشاء اللہ آج تو بہت خوش ہیں میری سسرز۔“ بنا آہٹ کئے مقصود بھائی ان کے کمرے میں آئے اور مٹھائی کا ڈبہ بیڈ پر رکھ دیا جو ساتھ لائے تھے۔ کشمالہ کے ہاتھ سے تصویر جھپٹ کے مہیرہ نے اپنی مٹھی میں دبائی اور دوپٹہ اوڑھ لیا۔
”مالا کہہ رہی تھی کہ جلد ہی مقصود بھیا کی شادی ہے تو ہم پلان کرتے ہوئے خوش ہو رہے تھے۔“ تصویر والے ہاتھ کو مزید دوپٹے میں چھپاتے ہوئے وہ مقصود بھائی سے مذاق کرنے لگی۔
”میری شادی.....؟“ حیرت سے اپنی طرف انگلی کئے انہوں نے کہا۔
”نہیں جی تو کیا آپ شادی نہیں کریں گے.....؟ ہمارے بھی کچھ ارمان ہیں ان کا کیا ہوگا۔“ کشمالہ نے لاڈ سے اپنا سر ان کے بازو پر رکھ دیا۔

”اچھا جی یہ بعد کی بات ہے پہلے تم یہ مٹھائی کھاؤ ہمارا دوسرا بڑا مشن بھی کامیاب رہا جس میں سب سے زیادہ ہاتھ فضیل کا تھا وہ بے حد دلیر اور نڈر جوان ہے بلکہ اب تو وہ ہمارے گروپ کا حوصلہ ہے آئی ایم پراؤڈ آف مائی برادر۔“ ایک جوش سے وہ فضیل کا تذکرہ کرنے لگے پھر مٹھائی ان کے منہ میں ڈالی۔
”دعا کرنا تیرا مشن بھی کامیاب ہو جائے پھر کافی تسلی رہے گی اس جگہ میں رہتے ہوئے مسلمانوں کو اس کے بعد تم دونوں چڑیوں کو اپنے اپنے آشیانے پر پہنچا کر شہادت کی آرزو کریں۔“ غنہ کے حضور۔“ دونوں کو بازوؤں میں سجائے اس کے سر کو چومنا اور ڈھیروں دعا میں دیں۔

”بی جان! میری ماں بھی مجھے ایسے ہی پیار کرتی ہوگی.....؟“ ان کے جھریوں بھرے ہاتھ اپنے گالوں پر رکھے وہ کھوئے سے انداز میں بڑبڑائی تو واش روم سے فریش ہو کر نکلتا فضیل برآمدے میں رک کر اچھپنے سے دیکھنے لگا۔
”ہاں بچے! مجھ سے کہیں زیادہ تم سوچو تو سہی اپنے والد کا نام والدہ کا نام یا گھر کا پتہ ہم تمہیں بھیجا دیں گے ان کے پاس بچے۔“ بی جان نے پیار سے اسے سوچنے پر اکسایا کہ وہ کچھ سوچے تو وہ بھی کسی کے جگر کا ٹکڑا ان کے ہنچا دیں۔

”مگر کیوں فضیل.....؟ میں میں پوری زندگی انتظار کر سکتی ہوں تمہارا خدا کے واسطے ایسا مت کہو تمہارے کشمیر چلے جانے کا سن کر آغا جان اسی دن سے بیمار اور چپ چپ سے ہیں بڑی امی بھی ہر وقت اداس رہتی ہیں اور مجھے بھی کیا اپنے ماضی میں دفن کر دیا بولو فضیل مجھے جواب دو کیا تمہیں ہماری یاد نہیں تڑپانی ماں باپ سے دوری برداشت کر لی تم تو چند ماہ کا کہہ گئے تھے ناں پھر کیوں.....؟“ ایک دم اپنے اندر کا غبار لفظوں کی صورت باہر نکالتے ہوئے گل ہانپ سی گئی شد و مد سے روتے ہوئے وہ بے قراری سے پھٹ پڑی۔ فضیل کے دل نے پلٹا کھایا اسے اپنے ماں باپ یاد آنے لگے مگر منظر بدلا اور ہندو فوجی اس کی نظروں کے سامنے جوان لڑکیوں کی چادر کھینچتے نو جوان لڑکوں کو اذیت دیتے نظر آنے لگے تو جہاد کے جنون نے اس کے اندر جڑیں مضبوط کر لیں۔

”غور سے سنو گل! مجھے شادی کرنی ہی نہیں کیونکہ ہتھیار اب میرا جیون ساتھی ہے اگر تم سے میری شادی ہو بھی جاتی ہے تو کیا معلوم بہت جلد میں مرجاؤں تو پھر کیوں میں تم جیسی اچھی لڑکی کو انتظار کی سولی پر لٹکاؤں مجھے پتہ ہے اس وقت تمہارے ذہن میں شدید طیش ابھر رہا ہوگا میری باتوں سے جب ٹھنڈے دل سے سوچو گی تو سب ٹھیک لگے گا ہاں اس وقت فراڈ یا دھوکے باز اور بہت کچھ سمجھ رہی ہوگی بس ایک گزارش ہے کسی بھی اچھے انسان سے تم شادی کر لینا زندگی تنہا نہیں گزاری جاتی اور امی جان آغا جی سے کہنا مجھے معاف کر کے صرف دعاؤں میں یاد رکھیں خدا حافظ۔“ اپنی بات کہہ کر لائن کاٹ دی تو گل موبائل دور پھینک کر ہندیانی سی ہو گئی انگوٹھی اتار کے پھینک دی فضیل کے تمام گفتگوں اور سوٹ غصے میں پھینک دیئے کپڑے وارڈروب سے نکال کر کمرے سے باہر پھینک دیئے پھر وہیں زمین پر بیٹھی چلانے لگی کمرے میں پھیلی اشیاء کی طرح وہ بھی بکھر گئی تھی۔

”بی جان! ہماری گلی کے آخر میں جو اسکول ہے میں وہاں ایڈمیشن لے لوں.....؟ میرا دل کرتا ہے پینٹنگ سیکھنے کو پھر وہاں اور بھی بہت سے کورسز ہیں۔“ چاول چنتے ہوئے وہ سیڑھیوں سے اٹھ کر بی جان کے برابر آ کے براجمان ہو گئی جو مہیرہ کے لئے ایک فراق پر کڑھائی کر رہی تھیں۔
”لے لو بچے! مجھے کیا اعتراض ہے اچھا ہے کچھ سیکھ جاؤ گی تو آگے کام آئے گا تمہارے۔“ انہوں نے گھٹنوں پر پھیلا فراق سمیٹا تو مہیرہ خوش ہو گئی ان کے اتنی جلدی راضی ہونے پر۔
”یوگریت بی جان.....“ چاول ایک طرف رکھے وہ ان کے گلے کا ہار بن گئی تو بی جان نے نرم سی مسکان لبوں پر سجائے اس کے سر کو چومنا اور ڈھیروں دعا میں دیں۔

”بی جان! میری ماں بھی مجھے ایسے ہی پیار کرتی ہوگی.....؟“ ان کے جھریوں بھرے ہاتھ اپنے گالوں پر رکھے وہ کھوئے سے انداز میں بڑبڑائی تو واش روم سے فریش ہو کر نکلتا فضیل برآمدے میں رک کر اچھپنے سے دیکھنے لگا۔
”ہاں بچے! مجھ سے کہیں زیادہ تم سوچو تو سہی اپنے والد کا نام والدہ کا نام یا گھر کا پتہ ہم تمہیں بھیجا دیں گے ان کے پاس بچے۔“ بی جان نے پیار سے اسے سوچنے پر اکسایا کہ وہ کچھ سوچے تو وہ بھی کسی کے جگر کا ٹکڑا ان کے ہنچا دیں۔

”بی جان! میری ماں بھی مجھے ایسے ہی پیار کرتی ہوگی.....؟“ ان کے جھریوں بھرے ہاتھ اپنے گالوں پر رکھے وہ کھوئے سے انداز میں بڑبڑائی تو واش روم سے فریش ہو کر نکلتا فضیل برآمدے میں رک کر اچھپنے سے دیکھنے لگا۔
”ہاں بچے! مجھ سے کہیں زیادہ تم سوچو تو سہی اپنے والد کا نام والدہ کا نام یا گھر کا پتہ ہم تمہیں بھیجا دیں گے ان کے پاس بچے۔“ بی جان نے پیار سے اسے سوچنے پر اکسایا کہ وہ کچھ سوچے تو وہ بھی کسی کے جگر کا ٹکڑا ان کے ہنچا دیں۔

جھوٹ بولا۔

”ویسے اتنی دوپہر کو تم گئی کہاں تھیں.....؟“ مقصود نے علی کو اندر بھیجا بیٹھک میں انہیں بغور دیکھ کر سوال پوچھا۔
لین اور ریڈش براؤن ایک جیسے کپڑے کانوں میں آویزے اور نیچرل بی لپ اسٹک لگائے وہ دونوں گڑیا سی لگ رہی تھیں۔

”بتایا تو تھا آپ کو رات کہ اسماء کی شادی ہے رات میں کوئی فنکشن نہیں آج مہندی تھی۔“ مہیرہ نے تیسری انگلی میں ڈالی انگلی کو اتارتے چڑھاتے جواب دیا تو مقصود بھائی نے انہیں جانے کا اشارہ کیا مہیرہ اپنی دھن میں ایک دم مڑی تو پاؤں مڑنے کی وجہ سے فضیل پر آگری اس نے جلدی سے تھام کر گرنے سے بچایا، مہیرہ بھی گرنے کے خوف سے اس کا سر دبوچے کھڑی تھی پھر اس سے الگ ہوتی مارے شرمندگی کے جلدی سے کمرے میں آئی تو دوسری سینڈل وہیں رہ گئی۔

”مہیرہ گڑیا! زیادہ چوٹ آئی ہے تو ڈاکٹر کے پاس.....“ مقصود بھائی جیسے ہی کمرے میں آ کر پوچھنے لگے وہ پہلے ہی زور و شور سے رونے میں مصروف دونوں ہاتھوں میں پاؤں تھامے بیٹھی تھی تو بات درمیان میں چھوڑ کر اس کے پاس آ بیٹھے جیسے ہی پاؤں چیک کرنے کو ہاتھ بڑھایا وہ چلا اٹھی۔

”بھیا! ہاتھ مت لگا میں بہت درد ہے پاؤں میں۔“ روتے ہوئے بچوں کی طرح اس نے اپنا پاؤں دور کیا اس حرکت پر فضیل کے لبوں نے بھولی بسری مسکان چھوٹا گلے پل پھر سے سنجیدگی کی چادر اوڑھ گئے۔

”اچھا بابا نہیں لگاتا ہاتھ مگر چوٹ دکھاؤ تو سہی۔“ مقصود بھائی نے ہاتھ پیچھے کرتے دلار سے پوچھا اس نے سوں سوں کرتے بہت احتیاط سے پاؤں دکھایا جہاں ایڑی اور ٹخنہ نیلے ہو کر سوچ گئے تھے۔

”یہ دودھ پیو پھر بی جان تمہارے پاؤں پر نکور کریں گی تیل وہ بنا چیکو دوائی ڈال کے۔“ کشمالہ نے دودھ میں ہلدی ڈال کر بھرا گلاس اسے دیا وہ سسکیاں لیتی گھونٹ بھرتی رہی پھر بی جان کے نکور کرنے پر وہ کبھی چپتی کبھی ہونٹ کچلتی مساج کروانے لگی۔

☆.....☆.....☆

رات کو مقصود بھائی اس کی دوائی لائے تھے جیسے ہی کھانا کھایا تو کشمالہ اسے دوائی کھلا کر چلی گئی اور یہ بھی جلد ہی سو گئی بی جان کا بی بی رات کو ہائی ہو گیا تو کشمالہ ان کے پاس سو گئی تھی رات کے دوسرے پہر فضیل بے چین سا پانی پینے اٹھا مہیرہ کے کمرے سے کراہنے کی آوازیں آئیں اس نے تیزی سے مہیرہ کے کمرے کا رخ کیا وہ درد سے دوسرا پاؤں اودھرا دھر کر رہی تھی۔

”مہیرہ! بہت درد ہو رہا ہے.....؟“ اس کے قریب بیٹھ کر پیار سے پوچھا مہیرہ گولیاں کھانے کی وجہ سے سوئی جا گی کیفیت میں تھی اسے پتہ نہ چلا کہ فضیل ہے۔

”بی جان! بہت درد ہے پاؤں میں آہ.....“ درد سے بے حال مہیرہ نے لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ فضیل نے پانی گلاس میں ڈالا پاس رکھی ٹیبلٹ میں سے بخار کی ٹیبلٹ اسے کھلائی پھر اس کا سر دبائے لگا بخار کی گرماہٹ اسے دور سے محسوس ہو رہی تھی آنکھیں رونے سے سوچ گئی تھیں آہستہ آہستہ وہ ریلیکس ہو کر سانس گہرے لینے لگی تو فضیل اس پر چادر ٹھیک کرتا باہر آ گیا۔

☆.....☆.....☆

چھن سے آواز ابھری اور پوری گندم صحن میں بکھر گئی بی جان ٹھہر کر چار پائی پر ڈھسے گئیں۔

”میں جب بھی کچھ سوچنے لگتی ہوں تو میرے دماغ میں چیونٹیاں سی ریگنے لگتی ہیں آنکھوں کے آگے اندھیرا چڑھ جاتا ہے مجھے کیوں بتایا آپ لوگوں نے کہ میں کہیں سے ملی ہوں مجھے بے خبر ہی رکھتے آپ لوگ کبھی کبھی مجھے نہیں کیا ہو جاتا ہے دل کرتا ہے اڑ کر اپنے ماں باپ کے پاس جاؤں وہ کیسے ہوں گے میرے بہن بھائی سب مجھے یاد کرتے ہوں گے۔“ آنسوؤں کا گولہ اس کے حلق میں اٹک گیا اور ایک نہ رکنے والا پانی کا سمندر آنکھوں سے ڈھلک کر مڑگانوں پر رواں ہو گیا سامنے کھڑے فضیل کی حالت پھر بے اختیار سی ہو گئی وہ اسے اپنے کندھے سے لگا کر حوصلہ دینا چاہتا تھا مٹھیاں بند کئے وہیں ایسا وہ سوائے سوچ کے وہ غم پیرا نہ ہو سکتا تھا اپنی سوچ پر۔

”مہیرہ کو کیا ہوا لالہ.....؟“ بی جان کی کمزور اور ناتواں گرفت میں روتی مچلتی مہیرہ کی آوازیں کرکبوتروں کو دانہ ڈالتی کشمالہ بھی وہیں آ کر فضیل سے پوچھنے لگی۔ جو یک ٹک برآمدے کی دہلیز پر کھڑی مہیرہ کو دیکھ رہا تھا۔ کشمالہ کی بات سن کے کندھے اچکائے اور رخ موڑے کمرے میں جا گھسا تو وہ مہیرہ کو بی جان کی گود سے اٹھا کر اپنی طرف رخ کئے پوچھنے لگی۔

”دیکھو چپ کر جاؤ ورنہ میں شروع ہو جاؤں گی اور مجھے تو کوئی جلدی جلدی چپ بھی نہیں کروا سکتا۔“ اپنے دوپٹے سے اس کے آنسو صاف کئے تو بی جان نے اسے وجہ بتائی وہ اپنا ماتھا پیٹ کے رہ گئی۔

”آپ کا بھی جواب نہیں جب رکھ ہی لیا ہے تو کیا تک بنتی ہے ماضی کریدوانے کی اس طرح ذہن پر زور ڈالنا نقصان دہ ہے اس کے لئے ڈاکٹر نے کہا بھی تھا ویسے بھی یہ ہمارے پاس خدا کی مرضی سے آئی ہے ورنہ اپنے ماں باپ کو چھوڑ کے وہ یہاں کیسے ہوتی بی جان! خدا نے جو کیا ہے اس میں مہیرہ کی بہتری شامل ہے اور اگر تم نے بھی آج کے بعد اس چھوٹے سے دماغ پر زور دیا تو مجھ سے اچھا کوئی نہیں۔“ آخری دھمکی پر مہیرہ کے ہونٹوں کی کلیاں کھل اٹھیں تو وہ ہتھیلیوں سے آنکھیں رگڑتی بہت پیاری لگی۔

”تم واقعی اچھی ہو اس بات پر غور کروں گی کہ کتنی اچھی ہو۔“

”جلدی کرو مقصود بھائی آنے والے ہیں آج وہ تمہارے ہاتھ کی بیسی روٹی کھائیں گے اور تم ملکہ جذبات بنی نہیں جم گئی اٹھو۔“ مہیرہ کو اٹھاتے وہ برآمدے سے صحن میں آئی تو اپنا چہرہ سامنے لگے شیشے میں دیکھ کر مسکرا کر رہ گئی۔

☆.....☆.....☆

”میرا دل کر رہا ہے چلو تھوڑے سے توڑتے ہیں۔“ دس بھرے مالے دیکھ کر مہیرہ کی رال ٹپک پڑی۔
”نہیں اگر کوئی آ گیا تو شور ہوگا بھیا غصہ کریں گے اگر انہیں بھٹک بھی پڑ گئی ہم بازار سے منگوا کر کھائیں گے۔“ کشمالہ نے اسے ڈرا دیا جو بیکار رہا۔

”کچھ بھی نہیں ہوگا اگر خطرہ محسوس ہوا تو ہم بھاگ نکلیں گے تم بس ڈرو نہیں پلینز.....“
”واٹ آبیوٹی.....“ مہیرہ کشمالہ کو قائل کر رہی تھی جب ایک فوجی خباثت سے مسکراتے ہوئے بولا کشمالہ تو کشمالہ اب تو مہیرہ بھی سہم گئی اور اٹنے قدم ہوتے ہوتے مہیرہ نے کشمالہ کی کلائی تھامی پھر ایک دم بھاگ پڑیں اور گھر کے دروازے پر آ کر سانس بحال کیں۔

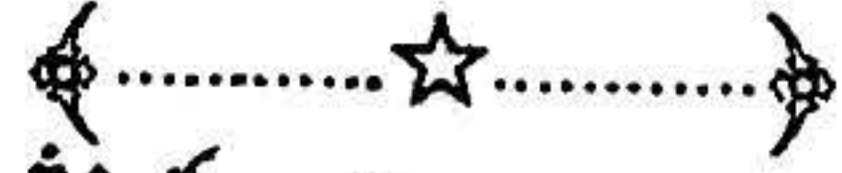
”اف کتنی کمینگی سے دیکھ رہا تھا۔“ مہیرہ نے ناویدہ پسینہ صاف کیا کشمالہ اس فوجی کو کونسنے لگی۔
”کون تھا کیا ہوا خیریت تو ہے.....؟“ ان کی پچھلی طرف سے مقصود فضیل اور علی آ گئے تھے تو چند لفظ فضیل کی سماعت ہوئے۔

”جی لالہ! وہاں یہ اتنا بڑا کتا تھا جان بچا کے آئے ہیں۔“ اس سے پہلے کہ مہیرہ سچ بولتی کشمالہ نے فرما دیا۔

”اچھا ہم چلتے ہیں مگر ہوشیاری نہیں کرنا سمجھیں۔“ دروازے کو زوردار ٹھوکر رسید کرتے وہ خشکیوں سے وارن کرتے چلے گئے۔ مہیرہ جلدی سے آئی اور انہیں اٹھا کر کشمالہ کے سہارے چارپائی پر ڈال دیا۔

”مہیرہ! احمد سے کہو کہ فضیل کو میرا پیغام دے کہ جلد سے جلد مجھ سے ملے وہ۔“ مہیرہ کے ہاتھ پر گرفت مضبوط کئے وہ اسے دیکھنے لگیں۔

”جی میں کہلاتی ہوں۔“



”وہ تو ٹھیک ہے بی جان! احمد بھی تو مجاہد ہے اور اس وقت وہ بھی مشن پر ہے۔“ جیسے ہی اسے پیغام ملا وہ فوراً آیا انہوں نے فوجیوں کی بات اور واقعہ گول کر کے کشمالہ کے رشتے کا کہا جو مقصود اپنی خوشی سے کر گیا تھا اب بی جان کی بات سن کر وہ شش و پنج میں پڑ گیا تھا۔

”تم احمد سے کہو جتنی جلدی ہو سکے اپنی امانت لے جائے میں اب مزید حفاظت نہیں کر سکتی، مقصود تھا تو اور بات تھی پھر مجھے مہیرہ کا بھی سوچنا ہے۔“ تھکے سے انداز میں کہتیں وہ فضیل کو افسردہ کر گئیں۔

”بی جان! تو کیا آپ مجھے اپنا بیٹا نہیں سمجھتیں.....؟“ ان کے ہاتھوں کو تھامے وہ ناراضی سے گویا ہوا۔

”نکلا ہے تو جھلا اگر بیٹا نہ سمجھتی تو ہر بات ہر دکھ تجھ سے کہتی.....؟ میرے دو بیٹے ہیں بڑے کا مقام ذرا الگ ہوتا ہے پھر تم دو تھے یعنی گیارہ کے برابر اب تم ایک ہو میں تمہیں اتنی جلدی کھونا نہیں چاہتی، حوصلہ ختم ہوتا جا رہا ہے مجھ میں۔“ شکستہ لہجہ فضیل کو مزید دکھی کر گیا حالانکہ وہ مضبوط اعصاب کی ایک دلیر عورت تھیں مگر تھیں تو ایک عورت ہی۔

”ٹھیک ہے بی جان! میں شام تک احمد کے ہمراہ آتا ہوں۔“ کرسی دھکیلتے وہ اٹھ کر ان کے سامنے جھکا انہوں نے بہت سی دعاؤں کے ہمراہ اسے رخصت کیا جاتے جاتے اچانک سے اس کے دل میں ایک خواہش نے انگڑائی لی کہ ایک نظر مہیرہ کو دیکھے کافی دن ہوئے اس سے سامنا نہ ہوا تھا، کشمالہ کپڑوں کی سینگ کر رہی تھی تو وہ سمجھ گیا مہیرہ چھت پر ہوگی، چھت پر بائیں جانب منڈیر کی طرف رخ کئے وہ یقیناً مہیرہ بھی دبے قدموں وہ اس کے پیچھے جا کھڑا ہوا اگلے پل حیرت سے ساکت رہ گیا، پھر طیش کے عالم میں وہ تمام تصویریں جو مہیرہ کے ہاتھ میں تھیں لے کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیں مہیرہ اپنے پر کیف سے خیالوں کی وادیوں میں غوطہ زن بہت دور نکلی ہوئی تھی اس اچانک افتاد پر ہراساں ہو کر پکٹی اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے فضیل کو تنکے لگی جو ایک جنوں کی کیفیت میں تصویریں پھاڑ رہا تھا۔

”اسٹاپ اٹ..... چھوڑو یہ کیا کر رہے ہو تم.....؟ تم ہوتے کون ہو میری ذاتیات میں انٹرفیر کرنے والے.....؟“ حواس ٹھکانے آتے ہی مہیرہ نے پھر کر اس سے تصویریں جھپٹنا چاہیں مگر بجلی کی سی تیزی سے وہ فضیل نے اس کی پہنچ سے دور کر لیں۔

”یوشٹ اپ..... بند کرو یہ بکواس کس کی اجازت سے تم میرے کمرے سے یہ تصویریں لائیں بولو.....؟ تمہیں شرم نہیں آئی، میرا خیال بھی آج کے بعد تمہارے ذہن میں نہ آئے انڈر اسٹینڈ۔“ مہیرہ پہلے تو دم سادھے رہی پھر تپتی سردی آواز میں فضیل سے مخاطب ہوئی۔

”زیادہ خوش فہم ہونے کی ضرورت نہیں آپ نے کب نوٹ کیا کہ میں آپ میں انٹرسڈ ہوں کون سی بے ہودہ حرکتیں کی ہیں میں نے، کون سے لو لیٹر پکڑے گئے ایسی کوئی واہیات ادا کیں آپ کو دکھائی ہیں جو مجھے شرم آئے مجھے پتہ ہے میں آپ کو کبھی بھی اچھی نہیں لگی مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ جو منہ میں آئے آپ کہہ دیں شرم تو آپ کو آتی چاہئے۔“

”بی جان.....“ بکھری گندم پر ایک نظر ڈال کر کشمالہ نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا دل ایک دم بیٹھ سا گیا تھا۔

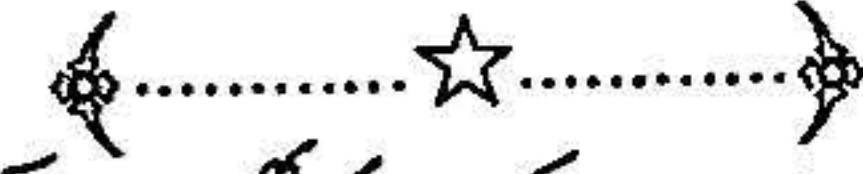
”میرے مقصود پر خدا مہربان ہو گیا وہ شہید ہو گیا۔“ ایک بے لگام آنسو ان کی آنکھ سے ٹپک کر دامن میں جذب ہو گیا، کشمالہ منہ پر ہاتھ رکھے سرنگی میں ہلانے لگی۔

”رونا نہیں گڑیا! وہ بہت خوش ہیں جہاں وہ ہیں اگر ہم روئیں گے تو انہیں تکلیف ہوگی۔“ اپنی سرخ آنکھوں کو ان سے چھپائے وہ کشمالہ کو تسلی دینے لگا، پھر مقصود بھائی کی ڈیڈ باڈی کو ان کی آخری آرام گاہ تک پہنچا کر وہ گھر آیا سامنے صحن کے وسط میں دونوں ہاتھوں میں چہرہ لئے متورم سی وہ اس حد تک سوچ میں گم تھی کہ اسے فضیل کے آنے کی کوئی خبر نہ ہوئی۔

”اندر چلو سردی ہو رہی ہے بیمار پڑ جاؤ گی۔“ اس کے پیچھے کھڑے ہو کر فضیل نے بلند آواز میں کہا تو اس کا ارتکا زٹوٹا۔

”کچھ دیر میں چلی جاؤں گی۔“ بھیگی سی آواز میں کہتی وہ چہرہ گھٹنوں پر رکھے نچلے ہونٹ کا کنارہ چبانے لگی، فضیل نے محسوس کیا خنکی کافی بڑھ گئی ہے وہ شمال اور سوئٹر کے بغیر بیٹھی تھی۔

”بے وقوفی مت کرو اور خبردار جو مقصود بھائی کے لئے روئیں وہ زندہ ہیں اور زندہ لوگوں کو رو دیا نہیں جاتا چلو اٹھو کمرے میں جاؤ۔“ اکھڑ انداز میں گھر کر وہ اسے اٹھانے لگا تو اس کے غصے کو دیکھتے ہوئے اپنا بازو اس کے آہنی شکنجے سے آزاد کرواتی وہ اندر بڑھ گئی، فضیل ہونٹوں پر مٹھی ٹکائے اسے جاتے دیکھ رہا تھا۔



”بی جان! آج نوروز کی شادی ہے آپ مہیرہ اور کشمالہ کو بھیج دیں کچھ بھل جائیں گی۔“ پڑوس میں رہتی پشینہ نے کشمیری طرز کے بنے فراک میں پر مژدہ سی بی جان سے کہا۔

”لے جاؤ مگر جلدی آنا۔“ انہیں جواب دے کر وہ پھر سے ڈھیلی چارپائی کسے لگیں کہ دروازہ بہت بری طرح سے دھڑ دھڑایا گیا، پشینہ کو مہیرہ اور کشمالہ کے پاس بھیج کر وہ دروازہ کھولنے آئیں۔

”کون ہے.....؟“

”دروازہ کھولو مائی! یہاں کوئی فضیل رہتا ہے اس سے کچھ کام ہے ہمیں، بلاؤ اس کو۔“ دروازہ کھلتے ہی ایک بھارتی فوجی نے درشتگی سے کہتے ہوئے دروازے کو ٹھوکر سے کھولنے کہا۔ تین مسلح افراد ان کے صحن میں کھڑے تھے۔

”یہاں کوئی فضیل نہیں رہتا، میرا ایک ہی بیٹا تھا وہ دو ماہ پہلے شہید ہو گیا فضیل کہیں اور.....“

”چٹاخ۔“ ان کی بات جاری ہی تھی کہ ایک فوجی نے اٹے ہاتھ کا تھپڑ انہیں رسید کیا وہ تو پہلے ہی ناتواں سی تھیں تھپڑ سہار نہ سکیں اور فرش پر جا گریں۔

”زیادہ چالاکی نہ دکھا مائی! یہ فضیل تیرے بیٹے کا ساتھی ہے ہمیں پکی خبر ملی ہے بتا کہاں ہے۔“ تیسرے درمیانے قد کے ایک فوجی نے بگڑتے تیوروں سے کہا۔

”تم..... تم لوگ تلاشی لے لو میرے گھر کی بے شک پیہرے دار بٹھا دو مگر یہاں فضیل نہیں رہتا یقین کرو میرا۔“ خوف کو چھپائے وہ پھنسی پھنسی آواز میں یقین دلائے لگیں۔

”اگر ہمیں پتہ چلا کہ وہ یہاں آیا ہے تو پھر ہم سے برا کوئی نہیں ہوگا۔“ لے سے فوجی نے کہا۔

دروازہ بند تھا جلدی سے شوکیس وہیں سیٹ کیا اور مہیرہ کو لئے بھاگنے لگا اسی بھاگ دوڑ میں مہیرہ کا دوپٹہ پھولوں کی بازو میں پھنسا دیا رہ گیا۔ مہیرہ ذرا دیر کو رکنے لگی کہ دوپٹہ پکڑ لائے۔

”دفع کرو دوپٹہ اب فوجی ہمارے گھر میں داخل ہو چکے ہیں بہت کم وقت ہے وہ ہم تک پہنچ سکتے ہیں ہری اب۔“ اس کے ہاتھ پر گرفت سخت کئے وہ تیز تیز بھاگ رہا تھا مہیرہ کی سانسیں پھولنے لگیں مگر رکنے کا وقت نہیں تھا بھاگتے بھاگتے فضیل اسے لئے ایک چھوٹی سی کھائی میں اتر گیا تو دانیال نے جلدی سے وہاں ایک خستہ تخت اور گھاس ڈال کے کھائی کو بند کر دیا مہیرہ کی سانسیں رکنے لگی۔ دانی اور علی اسی کھائی کے قریب ایک درخت پر چڑھ کے چھپ گئے کھائی اس قدر چھوٹی تھی کہ وہ دونوں بمشکل ہی بیٹھ پائے مہیرہ کا بے دم ہونا وجود فضیل کی آغوش میں تھا وہ کھل کر سانس لینا چاہتی تھی وہ فضیل کی آغوش سے نکل کر ریلیکس ہونا چاہتی تھی لیکن کھائی چھوٹی ہونے کی وجہ سے وہ پھر بھی وہیں رہی۔

”پپ..... پپ..... پانی۔“

”شش.....“ حلق میں چھتے کانٹوں کے درمیان وہ بمشکل کہہ پائی جب فضیل نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر خاموش کر دیا۔

”آواز مت نکالو اگر فوجی یہاں تک آگئے تو ہماری بوٹیاں کر کے کتوں کے آگے ڈال دیں گے سو تھوڑا سا صبر کرو۔“ اس کے کان میں بے حد ہلکی سرگوشی کرتے فضیل نے اسے خاموشی کا کہا تو وہ آنکھیں بند کئے اپنی اٹھل پٹھل ہوتی سینے کی دھڑکن کو کنٹرول کرنے لگی جو اپنے چہرے پر فضیل کی گرم سانسیں محسوس کئے بے لگام ہو رہی تھیں پیاس گھٹن تنگی جگہ نے مہیرہ کی آنکھوں سے آب رواں کر دیا وہ فضیل کے سینے سے لگی گھٹی گھٹی رونے لگی پھر اسی طرح آٹھ گھنٹوں بعد صبح پانچ بجے کے قریب دانیال نے انہیں باہر نکالا مہیرہ روتے روتے سو گئی تھی جب فضیل نے اس کا کندھا ہلایا تو وہ مندی مندی آنکھیں داکئے اسے دیکھنے لگی۔

”چلو مہیرہ! یہاں سے نکل کر ہم کسی محفوظ مقام پر چلتے ہیں ہمت کرو۔“ اسے کھائی سے نکال کر ہلکی آواز میں فضیل نے کہا مگر وہ بے جان سی ہو گئی تھی۔

”مجھ سے ایک قدم نہیں چلا جائے گا“ مجھے یہیں چھوڑ دیں آپ لوگ جائیں۔“ اتنی سی بات کہہ کر وہ وہیں ڈھس گئی۔

”بیگ مجھے دو انہیں کندھے پر اٹھاؤ جلدی کرو۔“ علی نے بیگ اس سے لے کر مشورہ دیا جو اس حالت میں سو دمنہ تھا۔

☆.....☆.....☆

”فضیل! اب یہی آخری حل ہے۔“ دانیال نے اس کے کندھے پر دباؤ ڈالا حاشر حاذق علی بھی دانیال کی بات سے متفق نظر آ رہے تھے مگر وہ خاموش ہی رہا۔

”دیکھ یار! ہمارے گھر دور ہیں اور ابھی کسی پہ بھروسہ بھی نہیں کر سکتے کیونکہ پرسوں ایک اور آپریشن ہے بہتر ہے تو ٹھنڈے دماغ سے سوچ یہ قدرت کا فیصلہ ہے۔“ علی نے چائے کا گلاس کے سامنے رکھتے ہوئے دانیال کی بات کو جاری رکھا فضیل ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کرسی کی پشت پر ہاتھ رکھے ان پر سر نکا گیا۔

”علی! مہیرہ نے کچھ کھایا.....؟“ فضیل کے سوال پر علی گھور کے رہ گیا سوال پھر جواب اینٹ۔

”نہیں بس پانی پیا ہے ابھی سو رہی ہیں وہ۔“ علی نے اسے دیکھا۔

”چناخ.....“ تھپڑ کی آواز بڑی زوردار تھی مہیرہ دھکتے گال پر ہاتھ رکھے ٹکڑ ٹکڑ فضیل کو دیکھنے لگی۔

”یو ایڈ بیٹ! مجھ پر ہاتھ کیوں اٹھایا.....؟“ وہ غصے سے پاگل ہو کر فضیل پر چڑھ پڑی پھر اس کے ماتنوں سے فضیل کے چہرے پر کافی خراشیں آئیں فضیل اس حملے کے لئے تیار نہ تھا پہلے تو وہ بچاؤ نہ کر سکا اس کا پھر ایک جھکے سے اسے دور کرتے کندھوں پر شال درست کرنے لگا۔

”مہیرہ..... فضیل لالہ..... یہ سب کیا ہے.....؟“ ہانپتی کانپتی کشمالہ شور کی آواز سن کر اوپر دوڑی آئی سامنے کے منظر نے اسے وحشت زدہ کر دیا۔

”اسے سمجھاؤ مالا! اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔“ کشمالہ سے کہتا وہ سائیڈ سے گزر گیا مہیرہ انہی ٹکڑوں کے پاس بیٹھ کے بے آواز رونے لگی۔

☆.....☆.....☆

شام کو کشمالہ کا نکاح ہوا اور ساتھ ہی رخصتی بھی کر دی گئی مہیرہ بی جان کے پاس آئی جو اپنی آنکھیں پونچھ رہی تھیں جلتی آنکھوں بوجھل قدموں کے ساتھ ہولے ہولے چلتی وہ ان کے پاس زمین پر بیٹھ گئی انہوں نے اس کا سر اپنی گود میں رکھ کر اپنا چہرہ اس پر رکھ لیا۔

”ابھی تو مالا گئی ہے تو تمہارا آسرا ہے جب تمہیں رخصت کروں گی نجانے میرا کیا حال ہوگا.....؟“ بی جان کی بات سن کر ایک ویران بختری کیفیت اس کی روح میں اتر گئی۔

”میں آپ کو چھوڑ کے کہیں نہیں جانے والی۔“ ان کی گود میں مزید سر رکھے وہ اٹل لہجے میں بولی۔

”اچھا بابا ٹھیک ہے جیسے تم خوش.....“ بی جان نے ہنس کر اس کا سر جو مگر اتنی جلدی مکمل خوشی ابھی کا تب تقدیر نے ان کی قسمت میں نہ رکھی تھی۔

کبوتروں اور پرندوں کو دانہ پانی ڈال کر بی جان سیڑھیاں اتر رہی تھیں کہ پہلی سیڑھی سے وہ پھسلتی ہوئی فرش پر آ گریں اور گرتے ہی ٹھنڈی پڑ گئیں مہیرہ گھر میں اکیلی تھی اس کی سانسیں بھی بی جان کے ساتھ ہی سینے میں اٹک گئیں اس کا دم گھٹ رہا تھا وہ چیخا رونا چاہتی تھی مگر آواز قید ہو کر رہ گئی تھی وہ اپنے گلے پر ہاتھ رکھے بی جان سے لپٹ کر وہیں آنکھیں موند گئی۔

☆.....☆.....☆

جب اسے پتہ چلا کہ کشمالہ دوسرے شہر چلی گئی ہے اور نہ ہی اسے بی جان کی موت کا بتایا وہ بری طرح بھڑکتے ہوئے فضیل کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

”مالا کو بی جان کا کیوں نہیں بتایا.....؟“ وہ فضیل کے روبرو تن کے کھڑی تھی۔ وہ ضرورت کی چند اشیاء اور کپڑے جلدی جلدی سے بیگ میں رکھ رہا تھا سب چھوڑ کے اس کی طرف متوجہ ہوا۔

”میں کیا پوچھ رہی ہوں جواب دیں.....؟“ اس کی تیز ہوتی آواز کو فضیل نے ہاتھ اٹھا کر ناگواری سے روکا۔

”آہستہ آواز میں بات کرو اور ابھی میرے پاس ٹائم نہیں ہے پھر کبھی جواب دوں گا۔“ باقی اشیاء بھی بیگ میں رکھ کر ایک طائرانہ نگاہ کمرے پر ڈالی جہاں اس کی بھی بہت سی یادیں وابستہ تھیں سر جھٹک کر وہ بیگ کی زپ بند کرنے لگا مہیرہ کی نگاہ اب اس کی حرکات و سکنات پر پڑیں تو وہ چونکے بغیر نہ رہ سکی۔

”ہیلو دانی! ہاں بولو کیا..... ٹھیک ہے تم بیٹھک کے دروازے کی طرف آؤ میں ابھی نکلتا ہوں۔“ دانیال کا فون سن کر فضیل نے بیگ کندھے پر لٹکایا اور مہیرہ کی کلائی پکڑے سامنے رکھا شوکیس پیچھے کیا جہاں باہر کی طرف کھلتا

”اچھا پھر میں دیکھتا ہوں اسے۔“ اپنا چائے گائگ ہاتھ میں لئے وہ برابر والے کمرے میں آ گیا، یہ ایک چھوٹا سا کائج تھا جہاں حاشر حاذق پہلے سے موجود تھے یہ ان کے لئے فی الحال محفوظ ترین پناہ گاہ تھی۔ اپنے سر پر محسوس ہوتے لمس پر اس نے بلیکس بمشکل کھول کر سامنے بیٹھے وجود کو دیکھا۔

”تم ٹھیک ہو اب مہیرہ۔“ اس نے ہاتھ پیچھے کرتے نرمی سے پوچھا اس نے صرف سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

”چلو ایسا کرو پہلے شاور لے کر کپڑے چھینچ کر دُست بہت خراب حالت ہو رہی ہے پھر کچھ کھالینا۔“ مہیرہ کی سوالیہ نظریں اٹھیں۔

”میں نے بیگ میں تمہاری ضرورت کی اشیاء اور کپڑے رکھے تھے اس وقت تم میری کوئی بات نہ مانتی لہذا میں نے خود ہی پیننگ کی تھی۔“ فیصل نے جواب دیتے ہوئے بیگ سے ایک سوٹ نکال کر بیڈ پر رکھا۔

”ابھی مجھے بھوک نہیں ہے اور نہ ہی شاور لینے کو دل چاہ رہا ہے۔“ کہنی کے بل اٹھ کر بیٹھتی وہ آہستگی سے بولی۔

فیصل کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر فیصلہ کن انداز میں اس سے ذرا فاصلے پر بیڈ پر بیٹھ گیا۔

”جیسے حالات آج کل چل رہے ہیں ان میں تمہیں کسی کے پاس چھوڑ کے نہیں جاسکتا، وجہ یہ کہ ہمارا مستقل کوئی ٹھکانہ نہیں، بی جان کی بھی یہی خواہش تھی، مقصود بھائی بھی مجھے کہتے تھے کہ تم اپنے گھر کی ہو جاؤ اب میں سوچ رہا ہوں ان کی خواہش پوری کر دوں اگر تمہیں اعتراض نہ ہو.....؟“ نظریں اس پر مرکوز کئے وہ اس سے رائے مانگ رہا تھا جو بیڈ شیٹ کے ڈیزائن کو بڑی محویت سے دیکھ رہی تھی۔

”مجھے شادی نہیں کرنی میں بی جان سے کہہ چکی تھی۔“ مدھم آواز میں جواب ملا۔

”اب بی جان نہیں ہیں دنیا میں۔“ اپنے ایک ایک لفظ پر زور دیا فیصل نے۔

”مجھے شادی نہیں کرنی چلے جائیں یہاں سے۔“ سخت مگر دھیمہ لہجہ اپنائے اس نے سختی سے آنکھیں میچ لیں اور دو آنسو عارض پہ ڈھل گئے فیصل بے چین سا ہو گیا۔

”مہیرہ! ٹرائی ٹو انڈر اسٹینڈ اس طرح بغیر کسی رشتے یا بھروسے کے میں تمہیں کہاں رکھوں.....؟ میری ذمہ داری ہو تم، حشر کے دن میں مقصود بھائی اور بی جان کو کیا منہ دکھاؤ لگا.....؟“ بے بسی ہی بے بسی تھی کہ وہ اپنے منہ سے اسے دل یو میری ہی نہیں کہہ سکتا تھا اور کسی اور کی مہیرہ کو ہوتے دیکھنا سو ہاں روح تھا۔

”مت لیں میری ٹینشن میں ان کا خون نہیں ہوں کہیں سے گری ہوئی چیز کی مانند راستے میں پڑی ملی ہوں کسی کی ذمہ داری نہیں ہوں میں اگر وہ مجھے اپنی ذمہ داری سمجھتے تو کیا بیچ راستے میں چھوڑ کے جاتے مجھے.....؟ کیوں چلے گئے سب مجھے چھوڑ کے.....؟ بی جان، مقصود بھائی اور مالا بھی میری کسی کو پرواہ نہیں، آپ بھی جائیں جن کو دنیا داری نبھا کر میری فکر کرنی تھی جب وہی نہ رہے تو آپ کیوں کسی کا وعدہ نبھا رہے ہیں کیوں وقت ضائع کر رہے ہیں میرا کوئی نہیں رہا..... کوئی نہیں۔“ وہ آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑی ناگواری اور خود ترسی نے اسے ہسٹرکل بنا دیا تھا۔

”مہیرہ.....“ فیصل نے اسے پکارا جو گھٹنوں میں سر دیئے سسک رہی تھی۔

”مہیرہ! میں ہوں صرف تمہارا، صرف تمہارا مہیرہ۔“ جذبول سے بھر پور گھمبیری آواز میں وہ ایک بار پھر اسے پکارنے لگا۔

”تمہیں شاید یقین نہ آئے مگر خدا نے تمہیں میری ذمہ داری ہی بنایا ہے تمام عمر کے لئے یہ دیکھو۔“ مہیرہ تو پہلے ہی اس کے منہ سے ہوتے منکشف راز پہ منجمد سی ہو گئی، سر اٹھا کر اس کی ہتھیلی کو دیکھا جہاں ایک نفیس سا بریسلیٹ رکھا

تھا وہ نا سمجھی سے اسے دیکھنے لگی۔

”یہ مجھے اس وقت ملا تھا جب تم ہمیں کھائی سے ملی تھیں اس میں تمہاری تصویر تھی اسی پر تمہارا نام درج تھا، تم مجھے ایک نظر میں بہت اپنی لگی تھیں مگر میں اپنے آپ سے ڈر گیا تھا وہ اس لئے کہ میں یہاں جہاد کرنے آیا تھا لڑکی پسند کرنے نہیں لیکن دل باغی ہو گیا میں نے بہت چاہا کہ یہ بات دل کے نہال خانوں میں دبائے رکھوں لیکن جب بھی تمہیں دیکھتا ہوں اس معطل ہو جاتے تھے پھر میں نے سوچا کہ عورت اپنی طرف اٹھتی پیار کی نگاہ فوراً بھانپ لیتی ہے تو میں نے اپنے جذبات کو منہ سے رکھنے کے لئے خود پر بیگانگی کا روپ دھار لیا جب میں یہاں آیا تو تین دن پہلے میری منگنی ہوئی اپنی چچا زاد سے، بس میں گل کے ساتھ دھوکہ نہ کر سکا۔“ فیصل نے مہیرہ کو دیکھا وہ یقیناً بے یقینی کی کیفیت سے گزر رہی تھی تو وقف بعد پھر گویا ہوا۔

”میں نے گل سے منگنی توڑ دی کہ اگر مہیرہ نہیں تو گل بھی نہیں، بس میں ساری عمر جہاد کروں گا، شادی کا لفظ میں نے اپنی زندگی سے مٹا دیا تھا، اور جب مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ تم مجھے چاہتی ہو یقیناً کرو مجھے بہت دکھ ہوا پتہ ہے کیوں.....؟“ فیصل کے پوچھنے پر بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

”کیوں.....؟“

”کیونکہ میں اپنی یکطرفہ محبت کو تھپک تھپک کے سلاچکا تھا جب معلوم ہوا کہ تم بھی مجھے چاہتی ہو تو میرے دل نے ہمک ہمک کر تمہاری آرزو کی میں تمہیں ڈانٹ ڈپٹ کے آتو گیا مگر روح میں اتنا درد محسوس ہوا میں خود سے شرمندہ ہی رہا، پھر میں یہ بھی سوچتا کہ میرا کوئی بھروسہ نہیں ایک گولی مجھے ابدی نیند سلا سکتی ہے تو تمہارا کیا ہوگا.....؟ یہی سوچ تمہارے قریب نہ آنے دیتی، لیکن حالات نے آج وہ سب مجھ سے اگلوادیا جو میں بھی نہ کہنے کی قسم کھا چکا تھا، اب خیال آتا ہے کہ تمہارا میری زندگی میں آنا کاتب تقدیر بہت پہلے سے طے کر چکا تھا، ہماری ساری تدبیریں دھری کی دھری رہ گئیں اب یہ جو سب میں نے کہا ہے تم یہ مت سمجھنا تم پر ترس کھایا ہے اگر دل یقین کرے تو دل یو میری می.....؟“ کھڑے ہوتے فیصل نے دونوں ہاتھ کمر کی پشت پر باندھے منتظر نظروں سے مہیرہ کو دیکھا جو یقین کے مراحل سے گزر کر آمادہ سی نظر آئی فطری جھجک سے رخ موڑ گئی، فیصل سمجھ تو گیا تھا مگر اس کے منہ سے ہاں سننا چاہتا تھا۔

”اگر تمہیں یقین نہیں آیا تو ڈونٹ دری میں.....“

”نہیں..... ایسا تو کچھ نہیں وہ.....“ پلکوں کی جھلک عارض پر گھبراہٹ اور شرم سے لرزے لگی تو فیصل دیکشی سے مسکرانے لگا۔



”آپ بس مجھے اپنے گھر لے کر چلیں، وہاں آغا جان اور امی جان ہوں گے، آپ کے بہن بھائی بس مجھے جانا ہے اسلام آباد۔“ بیڈ پر لیٹے فیصل کے سینے پر لاڈ سے ہاتھ مرتے مہیرہ نے ضد کی، فیصل نے شرارت سے اسے جھٹکا دیا وہ سنبھلتی سنبھلتی بھی اس کے کندھے سے آ گئی۔

”او کے مائے لائف اور حکم.....“ اس کے گلے میں بازو ڈالے اپنا چہرہ اس کے بالوں سے لگاتے

رضا مندی دی۔

”کتنا مزہ آئے گا ناں ایک بھرا پر اگھر۔“ آنکھیں میچے کھٹکتی آواز میں کہتی وہ فیصل کو گستاخی پر مجبور کر گئی۔

”فیصل! چھوڑیں مجھے ناشتہ بنانا ہے۔“ شرم سے گلنار ہوتے وہ دہائی دینے لگی۔

”او کے جاؤ اور فنافٹ سے میرا نشتر پڑی کرو“۔ فضیل نے اس پر رحم کھاتے ہوئے اپنی قید سے رہا کیا لیکن مہیرہ کی ٹھوڈی کے بائیں طرف وہ بھورا سا تل جو فضیل کی کمزوری تھا اسے نرمی سے لبوں سے چھوا مہیرہ خفگی سے دیکھنے لگی۔ ”نو کپڑے“، ”نونا شتہ مجھے تنگ کیا ہے ناں..... اب آپ کی سزا ہے سب خود کریں میں چلی“۔ اس کے بال بگاڑتی وہ زبان باہر نکالے ناک نیچے ہانے لگی تو فضیل ایک جست میں اس کی جانب لپکا مگر وہ پھر سے اڑتی تیلی کی طرح کمرے سے باہر نکلی، فضیل پھر سے اوندھا لیٹ گیا۔

”فضیل بھائی! آپ.....“ رومیل نے فضیل کو دیکھ کر خوشی سے نعرہ لگایا اور پھر اس سے بغلیں ہو گیا گھر کے باقی افراد بھی رومیل کی تیز آواز سن کر لان میں جمع ہو گئے تو وہ باری باری سب سے ملا خود بھی رویا اور سب کو رلایا اور آ کے ماں جی آغا جان کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

”کیا آپ دونوں مجھے معاف کریں گے.....؟ میں نے بہت دل دکھایا ہے آپ کا میں بہت گناہ گار ہوں“۔ وہ ان کے قدموں میں سر رکھے پھر سے رو پڑا تو آغا جان اور ماں جی نے اسے اٹھا کر سینے سے لگایا، ان کا لخت جگر تھا وہ کیسے اتنے عرصے بعد اسے روتا بلکتا برداشت کرتے۔

”تو جھلا ہے ماں باپ کبھی اتنا سخت ناراض نہیں ہوتے“ بچوں سے غلطیاں ہو ہی جاتی ہیں یہی بہت ہے کہ تو اپنوں میں لوٹ آیا۔ اس کے بال سہلاتے امی جان نے رنجیدگی اور خوشی کے ملے جلے تاثرات سے کہا۔

”اے کڑی کون اے پتر.....؟“ اسے اپنے پاس بٹھا کر ان کی نظر فیروز کی کاٹن کے لیمبر اڈری سوٹ میں ملبوس مہیرہ پر اٹھی تو لان میں موجود سب کی نگاہیں بیک وقت خوبصورت سی مہیرہ پر پڑیں، فضیل نے آنکھیں صاف کرتے مہیرہ کو دیکھا جو آنکھوں میں نمی لئے لب چل رہی تھی۔

”یہ آپ کی بہو ہے مہیرہ اور مہیرہ یہ ہے میری فیملی یہ آغا جان یہ امی جان یہ مجھ سے چھوٹا رومیل پھر رومیس یہ رومیس کی مسرتانیہ..... ارے رومیل کی بیوی کہاں ہے.....؟“ سب کا تعارف کراتے فضیل نے امی سے کہا۔

”وہ اپنے میکے گئی ہے آنے والی ہوگی اور تم یہاں میرے پاس آؤ بیٹا“۔ بانہیں پھیلا کر انہوں نے بلایا تو وہ جھکتی ان کے سینے سے آگئی وہ بھی جو آنکھوں کے گیلے فرش پر تیر رہی تھی بند توڑ گئی۔ کافی دیر سب سے باتیں کرنے کے بعد تانیہ اپنے روم میں چھوڑ گئی اور فضیل نے اپنی فیملی کو بتایا کہ وہ اس کے دوست کی بہن ہے۔

”بھیا! کھانا لگ گیا یا راجلدی آئیں پہلے ہی تانیہ بی بی سبحان اللہ کھانا بناتی ہیں“۔ رومس نے دروازہ بجا کر ہانک لگائی تو تانیہ نے خفگی سے پلیٹ زور سے ٹیبل پر پٹی۔

”مہیرہ.....“ عمیمہ کے لب بے وہ ایک ٹرانس کی حالت میں سیڑھیاں اترتی مہیرہ کو دیکھنے لگی۔

”تم مہیرہ ہونا.....؟“ چلتے چلتے وہ اس کے رو برو آئی، مہیرہ لبوں پر پر خلوص سی مسکال سجائے اس کے پاس آئی، عمیمہ نے غور کیا مگر اس کی آنکھوں میں شناسائی کی ہلکی سی رمت بھی نہ تھی۔

”تم مہیرہ! تم کہاں چلی گئی تھیں.....؟“ ایک خواب کی سی کیفیت میں چلتی آئی عمیمہ اور سب کو ششدر کر گئی۔

”آپ مجھے کیسے جانتی ہیں.....؟ جبکہ میں تو کہیں گئی ہی نہیں“۔ مسکراہٹ اس کے لبوں سے غائب ہو گئی، آنکھوں میں سوال چہرے پر ابھرنے لگا۔ مہیرہ کے بالکل پیچھے کھڑے فضیل نے عمیمہ کو کچھ بھی کہنے سے روکا تو وہ چپ ہو گئی۔

”میرا مطلب تھا کہ فضیل بھائی سے سنا تھا ان کی مسز کا نام مہیرہ ہے اس لئے کہا کہ آپ اتنی لیٹ کیوں آئیں آپ کو تو چاہئے تھا ہمیں ویکم کرتیں، بھئی بڑی بہو ہی اپنی دیورانی کو گھڑلاتی ہے ناں“۔ جبراً چہرے پر مسکراہٹ لانا کتنا دشوار ہے یہ کوئی اس لمحے عمیمہ سے پوچھتا جو اپنی آنکھوں سے چھلکتی نمی پر بند باندھے مسکرا رہی تھی، مہیرہ بھی ریلیکس ہوئی۔

”اتنے عرصے بعد سسرال کی یاد آگئی آپ کو اچھا یہ تو بتائیں چٹکو منکو کہاں ہیں.....؟“ اپنے تاثرات کمپوز کر کے اس نے مہیرہ کو نگلے سے لگا کر سوال جڑ دیئے، مہیرہ کا چہرہ گلابی سا ہو گیا وہ سر جھکا کر ٹیبل تک آئی جہاں سب کے چہروں پر مبہمی مسکراہٹ چھلک رہی تھی۔

”لعل سسٹر اینڈ بھابی! ابھی ہماری شادی کو اونٹنی ایک دیک ہوا ہے تو چٹکو منکو کس کے ساتھ لاتے“۔ فضیل نے ہنستے ہوئے جواب دیا اب پڑل ہونے کی باری عمیمہ کی تھی۔

سوں..... سوں آنکھیں اور ناک صاف کرتی عمیمہ کے گرد اس وقت ساری فیملی براجمان تھی اور دنگ بھی کہ آج دو بڑے انکشاف ہوئے فضیل کی واپسی بمعدہ لہن اور لہن عمیمہ کی کھوئی دوست۔

”جب یہ گم ہوئی آنٹی مینٹلی بیمار رہنے لگیں تو انکل نے مجبوراً کسی کی لغش پر مہیرہ کا نام لے کر آنٹی کو یقین دلایا تو وہ کوسے میں چلی گئیں۔ پھر انکل نے دبی جانے کا فیصلہ کیا وہ وہیں شفٹ ہو گئے دکھ سب سے زیادہ اس بات کا ہے کہ وہ ماضی بھول گئی اسے زندہ سلامت دیکھ کر مجھے اپنی بصارت پر یقین کرنا مشکل ہو گیا تھا“۔ ہچکیاں لیتی عمیمہ نے چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا سب لوگ سوچوں کے کھنور میں جکڑے ہوئے تھے۔

”ارے واہ یہاں تو لیٹ ٹائٹ محفل جمی ہے“۔ مہیرہ کھانے کے بعد سو گئی تھی جب اس کی آنکھ کھلی تو فضیل کمرے میں نہ تھا اس نے بالوں کا ڈھیلا سا جوڑا بنایا اور پیروں میں سلیپر پھنسائے باہر آگئی، لان میں سب کو دیکھا شانوں پر دوپٹہ ٹھیک کرتی وہیں چلی آئی۔

”بسمہ اللہ آؤ بیٹا یہاں میرے پاس بیٹھو اصل میں تم خور ہی تھیں ورنہ جگا لیتے تمہیں خدا خیر کرے اب تو تم یہیں ہو محفلیں جمتی رہیں گی“۔ رینا بیگم نے سب سے پہلے لب کشائی کی اور اپنے برابر مہیرہ کو جگہ دی، فضیل پر نظر گئی تو اس نے بائیں آنکھ دبا کر مہیرہ کو کھلا کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

”کیسی ہو حظلہ.....؟“ عمیمہ نے اگلے دن حظلہ کو فون کیا۔

”میں ٹھیک ہوں“ تم کیسی ہو“ سسرال کیسا ہے تمہارا.....؟“ حظلہ کے ادا سی بھرے لہجے کو عمیمہ نے جھٹ فیل کیا۔

”انکل آنٹی ٹھیک تو ہیں تمہارا لہجہ اتنا ملول سا کیوں عمیمہ کے تشویش سے پوچھنے پر حظلہ کی سسکی ابھری۔

”جب تم جانتی ہو عمیمہ کہ مہیرہ کے بعد خوشیاں روٹھ سی گئی ہیں پنا اندر ہی اندر گھلتے رہے سوچ سوچ کر برین ٹیومر کا مرض لاحق ہو گیا انہیں تین ماہ پہلے وہ مہیرہ کے پاس جا پہنچے مٹی بھی کوسے میں ہیں ڈاکٹر نے ایک ہفتہ کہا ہے کہ.....“ آنسو بھری آواز پر عمیمہ نے اپنے لب چل لئے۔

”اگر اسے کہو کہ ماضی پر دھیان دو تو یہ ذہنی مریضہ بن سکتی ہے اسے اس کے حال پر رہنے دو ہو سکتا ہے خود ہی اس کو یاد آ جائے ہو سکتا ہے کبھی نہ آئے تو کیا فائدہ ہم اس کے والدین کو لائیں اور یہ نہ پہچانے پھر پیچھے سوچے گی بس تم دعا کرو اس کی یادداشت خود ہی ٹھیک ہو جائے میں خود لے کر جاؤں گا مہیرہ کو اس کے والدین کے پاس“۔ اس دن

عشق ریب ماہ نامہ ایم ریلڈ آرہا ہے

ایم ریلڈ میں پراسرار سچی کہانیاں اور ایک ایسا سلسلہ جس میں ہر قاری شامل ہو سکتا ہے یعنی ایک سچا، چھوٹا سا پراسرار واقعہ آپ بھی لکھتے

اور بہت کچھ

ڈینٹل نیوز، ہیلتھ نیوز، بیوٹی ٹپس، نیو باورچی خانہ

روحانی آیات علاج

اور وہ کچھ جو اس سے پہلے آپ نے نہیں پڑھا

تمام ایجنٹس اپنی کاپی بک کروائیں پہلا آرڈر آنے پر 5 کاپی فری

صرف ایک بار پھر بار بار

ماہ نامہ ایم ریلڈ کی خط و کتابت کا پتہ

129D. Block II Pechs Karachi Phone: 02134535726

فضیل کے جواب پر وہ منجھدی ہو گئی تھی جیسے اب حظلہ سے یہ سن کر کہ انکل آئی ہوں۔
”او خدا..... آپ حوصلہ کریں میری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں مجھے بے حد دکھ ہوا اچھا پھر بات کروں گی بائے۔“ حظلہ کو تسلی دے کر فون بند کر دیا۔

”سو بیوٹی فل۔“ سر سبز چھوٹی سی وادی میں ذرا اونچائی پر کھڑی وہ فرط سرت سے گول گول گھومتی دونوں ہاتھ آپس میں بھیجنے بہت خوش لگی فضیل کو۔
”ہاں مگر تم سے کم۔“ فضیل نے محبت سے اسے اپنی پرحدت آغوش میں بیٹھے مدہوش سرگوشی میں کہا، مہیرہ کا پورا جسم سننا اٹھا۔

فضیل آج اسے اپنی پسندیدہ جگہ پر لایا تھا، کشمیر بھی بے حد حسین تھا مگر یہ حصہ مہیرہ کی قربت سے بے تحاشا حسین لگا جہاں ہر طرف پیار کرنے والے خود میں مگن تھے یہ بھی پیار کی گلابی وادی لگی جیسی گلابی وادیاں فضیل نے مہیرہ کے سنگ کشمیر میں دیکھی تھیں۔ فضیل کے سیل نے بیپ دی وہ بے مزہ ماہو گیا۔
”ہیلو..... دانیال اچھا یار ٹھیک ہے آ جاؤں گا اوکے۔“ اس کی باتیں سن کر مہیرہ کے لبوں سے ہنسی غائب ہو گئی۔
”کہاں جانا ہے.....؟“ کسی اندیشے کے تحت مہیرہ نے سوال کیا۔

”کشمیر دعا کرو کا میا بی ملے۔“ فضیل نے کہا۔
”میری جان کیا ہوا خاموش کیوں ہو گئیں۔“ فضیل نے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر چہرہ اونچا کیا۔
”آپ کشمیر مت جائیں پلیز.....“ مہیرہ نے رقت آمیز لہجے میں کہا۔
”مہیرہ تم جانتی ہو مہیرہ جہاد کرنا میرا.....“

”پلیز فضیل! آپ نے اللہ کی راہ میں کام کرنا ہے ناں.....؟ اس کے اور بھی بہت سے طریقے ہیں جہاد بھی چار سال کیا ہے آپ نے پھر ماں باپ کو چھوڑ کے جائیں گے وہ آپ کو کبھی اجازت نہیں دیں گے اور مجھے چھوڑ کے جائیں گے.....؟“ مہیرہ نے کہا۔
”اگر وہاں جاتے ہی آپ کو شہادت مل جائے تو تو میرا کیا ہوگا.....؟“ ابھی تو بہت سی خوشیاں آپ کے سنگ دیکھنی ہیں ابھی تو پیار کی ان گلابی وادیوں میں میں نے آپ سے بہت سے وعدے لینے ہیں پلیز کوئی ٹرسٹ ٹھکڑا لیں اللہ کی راہ میں سو طریقے ہیں جہاد کرنے کے یہ پہلی اور آخری بات آپ مانیں وعدہ ہمیشہ آپ کی ہر بات مانوں گی۔“ معصومیت سے کہتی وہ فضیل کا ارادہ ڈالنا ڈول کر گئی ایک یاسیت اس کی کشادہ آنکھوں میں پھیلی نظر آئی۔

”کی بات ہے مگر تو نہیں جاؤ گی۔“ اس کا چہرہ ہاتھوں کے پیالے میں لئے استفسار کیا۔
”نہیں مگر تو وعدہ بالکل پکا ایلفی سے جڑا۔“ ایک دم جوش سے کہتی وہ فضیل سے لمحے میں فیصلہ کروا گئی اچانک ایک نٹ کھٹ بدلی آ کر ان پر برسے لگی وہ فضیل کے سینے سے لگی فضیل کے جذبات اکسانے لگی۔
”فضیل! ہم پبلک پوائنٹ پر ہیں گھر چلیں مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“ فضیل کی جھار توں پر وہ چھوٹی موٹی بن گئی مگر تیز ہوا بارش نے اسے خوف میں مبتلا کر دیا۔

”ابھی تو کہا تھا ہر بات مانوں گی.....؟“ اس کے گداز بازو کو پکڑ کر اپنے سامنے کیا وہ کپکپا رہی تھی، فضیل نے اس کے اوپر اپنا کوٹ ڈال دیا اور لب اس کی مانگ پر رکھ دیئے۔

عائشہ ذوالفقار

ناولٹ

میری سیدھا سدا



گر میاں اپنے پورے جوہن پر تھیں، جولائی کے دن تھے صبح کو چٹیلی دھوپ نہ ہوتی تو جس ہوجاتا دوپہر کو سورج آگ برستا، شام کو دھوپ کی شدت کم ہوتی اور ہوا چلتی تو سکون ملتا، اب بھی شام ہوتے ہی روحاء نے چھڑکاؤ کیا اور چار پائیاں نکال دیں۔ بڑی امی نے مشین لگائی تھی، سالم نے اپنے کاغذات لے کر باہر آ بیٹھا، فرزام اندر کمپیوٹر کے آگے بیٹھا تھا، شہرام کہیں باہر گیا ہوا تھا، چھوٹے بابا کی طبیعت خراب تھی وہ اندر سو رہے تھے، روحاء کپڑے نتھار رہی تھی، تبھی بیرونی دروازہ کھلا، سب نے نظریں اٹھائیں بڑے بابا اندر آئے تھے۔ سب نے دوبارہ نظریں جھکالیں لیکن متوجہ کر لینے والی وہ لڑکی تھی جو بڑے بابا کے پیچھے اندر داخل ہوئی تھی۔ سالم دوبارہ کاغذات پر نہ جھک سکا۔ بڑی امی بے خیالی میں مشین کا بٹن الٹا گھما گئیں۔ روحاء بھی حیران ہوئی۔ بڑے بابا اندر آ چکے تھے۔

”سعدیہ! رشید کونے کر میرے کمرے میں آؤ اور روحاء بیٹا! چائے بناؤ، ساتھ میں کچھ اور بھی بنالینا۔“

بڑے بابا کہہ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھے تھے۔ سعدیہ نے سوالیہ نظروں سے روحاء کی طرف دیکھا، وہ کندھے اچکا گئی۔

”یہ مشین کیوں نہیں چل رہی.....؟“ بڑی امی جھلا گئیں۔

”سیدھا گھمائیں تو چلے گی نا۔“ سالم نے اٹھ کر

بٹن سیدھا گھمایا۔ بڑی امی اندر چلی گئیں، روحاء چائے بنانے چلی گئی، سالم نے بھی کاغذات سمیٹے اور کمرے میں گھس گیا۔ روحاء نے چائے کا پانی پڑھایا اور کباب تلنے لگی، بھی فرزام آ گیا۔

”کون آیا ہے.....؟“ وہ دروازے میں کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

”پتہ نہیں سب بڑے بابا کے کمرے میں اکٹھے ہیں۔“ شہرام کی نگاہیں کباب کی پلیٹ پر پڑیں، روحاء نے کبابوں کی پلیٹ عائب کی اور پھر چائے لے کر کمرے میں آ گئی۔

”روحاء بیٹا! باقی سب کو بھی بلاؤ۔“ انہوں نے کہا۔ روحاء سر ہلا کر باہر آ گئی، وہ دونوں ابھی تک کچن میں کھڑے آدھے کباب پر لڑ رہے تھے۔

”بڑے بابا بلا رہے ہیں۔“ وہ اونچی آواز میں بولی۔ تینوں کمرے کے دروازے پر آ گئے۔

”بچو! یہ اسماء ہے، میرے ایک بہت اچھے دوست کی بیٹی ہے، اس کے والدین فوت ہو چکے ہیں، اب یہ ہمارے ساتھ رہے گی، روحاء بیٹا! بہن کو اپنے کمرے میں لے جاؤ۔“ انہوں نے آخر میں روحاء سے کہا۔

”آؤ.....“ وہ اسماء کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔ روحاء اسماء کو اپنے کمرے میں لے گئی، تھوڑی دیر بعد تینوں ایک ایک کر کے اس کے کمرے میں آ گئے۔

”یار! یہ کچھ عجیب طرح سے نہیں شرمارہی ہے۔“

بات پر چلا اٹھتا تھا۔ اسماء تو اس دن سے کمرے میں ہی بند ہو گئی تھی۔ اتنے گنبد معاملے میں تو ساریہ بھی ان کے ساتھ تھی۔

”شہرام تو میرے لئے قربانی نہیں دے سکتا۔“

فرزام اب شہرام کی منتوں پر اتر آیا۔

”ہاں میری بہن کی خوشیاں برباد کر۔“ سالم کوتاؤ آ گیا۔

”تو پھر تو قربان ہو جانا۔“ وہ اب کے سالم کی طرف مڑا۔

”ہاں تاکہ امیمہ مرجائے۔“ ہر راستہ بند ہو گیا تھا۔ تیسرا دن بھی گزر گیا۔ صبح اس کا نکاح تھا۔ صبح بڑے بابا کو کسی کام سے جانا تھا اور ظہر کے وقت نکاح رکھا گیا تھا۔ حاریہ کی جان نکلی جا رہی تھی۔ وہ سب فرزام کے کمرے میں جمع تھے۔ رات آہستہ آہستہ گزر رہی تھی۔

صبح قیامت آ جاتی تھی۔

”فرزام! اب کیا ہوگا.....؟“ حاریہ ہر دو منٹ بعد اس کا بازو پکڑ کر آنسوؤں بھری آنکھوں سے پوچھتی تو وہ بس دیکھتا رہتا۔

”ایک آئیڈیا آیا ہے میرے ذہن میں مگر خطرہ بہت ہے اور کامیابی کے چانسز صرف 20 فیصد ہیں۔“

ساریہ بولی تو دونوں ایکدم اس کی طرف مڑے۔

”جلدی بتاؤ۔“ تم لوگ کسی طرح فرزام کا کسی اور لڑکے کے ساتھ افیئر اسماء کو اس کی آنکھوں سے دکھاؤ

ساتھ تھوڑا مہینہ لگا دو ایک دو افیئر کی داستانیں سناؤ آخر وہ بھی عورت ہی ہے شاید فرزام کو قبول کرنے سے خود ہی انکار کر دے کیونکہ جیسا شخص وہ اس کو سمجھتی ہے اس روپ میں فرزام کو قبول کیسے کرے گی۔“ سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

”اور یہ افیئر اسے کہاں دکھایا جائے۔“ حاریہ بولی۔

”کسی ہوٹل میں۔“ ساریہ نے جواب دیا۔

”لڑکی کون ہوگی؟“ فرزام بولا۔

”حاریہ نہیں ہوگی کیونکہ اسے اسماء جانتی ہے کوئی ایسی لڑکی جسے وہ نہ جانتی ہو۔“ ساریہ انگلی اٹھا کر بولی تھی

اب پھر سب سوچ میں پڑ گئے۔

”سالم تم امیمہ سے کہو ناپلیز۔“ حاریہ ایکدم بولی

سالم چونک گیا۔

”ہاں سالم ڈرامہ ہی تو کرنا ہے پلیز یا اب تو کر دے میری مدد پڑے۔“ فرزام رو ہانسا ہو گیا۔

”میں تو مان جاؤں گا مگر امیمہ.....“

”تم اسے بلاؤ میں خود منالوں گی۔“ حاریہ بولی۔

”مگر جو کرنا ہے جلدی کرو صرف ایک بجے تک کا وقت ہے تم لوگوں کے پاس۔“ ساریہ بولی تھی۔ سالم اسی وقت امیمہ کو لینے چل دیا اور وہ سب حاریہ کی طرف آ گئے کہ امیمہ کو وہیں آنا تھا۔

☆.....☆.....☆

”سالم.....“ ساری بات سن کر وہ شکوہ کناں نظروں سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔

”میری بات سنو امیمہ.....“ وہ بولا مگر امیمہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

”تم میرے بارے میں ایسا سوچو گے مجھے اندازہ نہیں تھا۔“ وہ بہت ہرٹ ہوئی تھی۔

”میری بات سنو امیمہ.....“ وہ ایکدم بولا مگر امیمہ نے اس کی طرف دیکھا۔

”کیا بات سنو میں تمہاری۔“

”سنو امیمہ.....“ سالم نے اسے ایکدم کندھوں سے تھام سب خاموش ہو گئے تھے۔

”میری طرف دیکھو امیمہ۔“ وہ بولا۔ امیمہ نے اس کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھیں پانیوں سے بھری ہوئی تھیں۔

”کیا میری اور تمہاری محبت اتنی کمزور ہے کہ ایک فرضی ڈرامے سے ٹوٹ جائے گی۔“ امیمہ نے منہ پھیر لیا۔ سالم نے اس کا چہرہ اپنی طرف موڑا۔

”اتنا بے غیرت نہیں ہوں میں کہ کوئی تمہارے

ساتھ افیئر چلانے کا سوچے اور میں چپ رہوں اعتبار ہے ناں مجھ پر.....؟“ وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے پوچھ رہا تھا امیمہ کچھ بول نہ سکی۔

”بولو امیمہ! اعتبار ہے نا۔“ امیمہ کا سر اثبات میں ہل گیا۔ سالم مسکرا دیا یہ جانے بغیر کہ کسی کے دل پر کیا گزر گئی۔ پھر پلان تیار کیا گیا۔

☆.....☆.....☆

اگلی صبح تقریباً دس بجے امیمہ اور فرزام ہوٹل پہنچ گئے کچھ دیر بعد شہرام آ گیا۔

”امیمہ تمہیں سالم کی محبت کا واسطہ میری محبت کو آج بچالینا۔“ فرزام اس کے آگے ہاتھ جوڑ کر بولا

امیمہ نے اثبات میں سر ہلادیا۔

اسماء کو سب سے چھپا کر اور بہانے وغیرہ بنا کر گھر سے نکالتے نکالتے ان دونوں کو 12 بج گئے۔

ہوٹل میں وہ ایسی جگہ بیٹھے کہ فرزام اور امیمہ انہیں صاف نظر آئیں۔

”اسماء! کچھ کھالیں پھر چلتے ہیں۔“ دونوں اسے شاپنگ کا بہانہ بنا کر لائے تھے ارے سالم بھائی یہ

فرزام بھائی ہیں نا.....؟“ شہرام نے فرزام کو اشارہ کر دیا تھا سالم نے بھی ان دونوں کی طرف دیکھا۔

”ہاں مگر اس کے ساتھ حاریہ تو نہیں ہے۔“ اسماء نے بھی چونک کر دیکھا۔

”حاریہ سے تو کب کی ٹوٹ گئی ان کی اب یہ ہوتی ہیں۔“ روحاء اسماء کی طرف دیکھ کر بولی۔ جبکہ اسماء کی نظریں فرزام کی بولتی آنکھوں اور لڑکی کی شرمیلی مسکراہٹ پر تھیں۔

”وہ اسماء! بڑے بابا تمہارے ساتھ جو بھی کر رہے ہیں مگر فرزام بھائی فیصل سے کم نہیں ہیں چار دن بعد ان کے ساتھ نئی لڑکی ہوتی ہے کل حاریہ آج یہ

اور کل کوئی اور..... ڈرنک بھی کرتے ہیں ایسے لوگ شادی کے بعد بھی نہیں بدلتے ان کی بیویاں تو ساری عمر روتی ہیں۔“ اب کے فرزام نے امیمہ کا ہاتھ تھاما

تھا اسماء پلکیں جھپکنا بھول گئی، فرزام اور حاریہ کے تعلق کے بارے میں وہ جانتی تھی مگر اب یہ نئی لڑکی.....؟ روحاء نے اور مصالحو لگایا۔ فرزام امیمہ کے ہاتھ کو ہونٹوں تک لے گیا۔

”کم بخت اب زیادہ ہی اوور ہو رہا ہے۔“ سالم نے سوچا اور شہرام کی نظر سیڑھیوں سے اترتے بڑے بابا اور سار پر پڑی۔ بڑے بابا کی نظر سیدھی فرزام کی ٹیبل تک گئیں کیونکہ وہ سامنے تھی۔ شہرام اب صرف اسماء والی پارٹی کو ہی بچا سکتا تھا۔

”سالم بھائی! ابو..... بھاگیں۔“ اس کے پاس سے کہتے ہوئے وہ گزرا۔ دونوں ایکدم چونکے اسماء کی پھٹی نظریں ابھی تک اس لڑکی کے فرزام کے ہونٹوں سے لگے ہاتھوں پر تھیں روحاء نے ایکدم اسے اٹھایا اور پھر تینوں بھاگ گئے۔

☆.....☆.....☆

وہ امیمہ کو اس کے فلیٹ پر چھوڑ کے گھر آیا تو ایک بج رہا تھا سیٹی بجاتا ہوا وہ اندر داخل ہوا مگر ٹھنک گیا لاؤنج میں بڑے بابا ادھر سے ادھر گھوم رہے تھے بانی سب خاموش کھڑے تھے اسے آتا دیکھ کر وہ ایکدم اس کی طرف مڑے۔

”بڑا مان تھا مجھے اپنی اولاد پر کہ مجھے کبھی نیچا نہیں دکھائے گی مگر مجھے کیا پتہ تھا کہ میری اولاد میری پیٹھ میں خنجر گھونپ دے گی ایک لڑکی کے سامنے ذلیل کر دائے گی مجھے ارے کس منہ سے کہوں میں اس لڑکی سے کہ میرے بیٹے سے شادی کر لو وہ بیٹا جو سر عام لڑکیوں کے ساتھ گھومتا ہے۔“ فرزام نے ایکدم ان سب کی طرف دیکھا سالم نے سر ہلا کر نظریں جھکا لیں۔

”کل تک حاریہ کے لئے بے قرار تھا اس کی اور اپنی محبت کے واسطے دے رہا تھا اور ہوٹل میں کسی اور کے ساتھ گل چہرے اڑا رہا تھا پناہ مانگتا ہوں میں ایسی اولاد سے میرا مان توڑ دیا اپنا بیٹا کہتے ہوئے شرم آ رہی ہے مجھے میں ایک فیصل سے اس بچی کی جان چھڑوا کر

دوسرے فیصل سے کیسے باندھ دوں اسے۔“ فرزام کی نظریں جھک گئیں۔

”تم جیسے لوگ ایک کھونٹے پر نکتے ہی نہیں ہو ایک سے دل نہیں بھرتا تمہارا گل چہرے اڑانے کی عادت ہوتی ہے تم لوگوں کو کل حاریہ تھی آج اس لڑکی کے ساتھ تھا، کل کو کسی اور کے ساتھ گھوم رہا ہوگا، گھر بسانا نہیں آتا تم جیسے بے غیرتوں کو۔“ اب کہ فرزام تڑپا۔

”ابو پلینز میری.....“

”خبردار جو مجھے ابو کہا، مر گیا میں آج سے تیرے لئے اس بچی کی شادی تو نہیں کروں گا اب میں تمہارے ساتھ مگر میری بات لکھ لے تو حاریہ سے بھی نہیں کرے گا کہ وہ تو بہت نیک بچی ہے تو اس سے بھی نہیں کرے گا جس کے ساتھ گھوم رہا تھا۔“ فرزام کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

”تمہیں صرف لڑکیوں کے ساتھ گھومنا پسند ہوتا ہے پرسوں کوئی اور ہوگی اور تو اس کو بھی.....“ بڑے بابا کی گالیاں فرزام کو تیروں کی طرح لگ رہی تھیں۔

”مولوی صاحب آنے والے ہیں آج ہی اسماء اور شہرام کا نکاح ہوگا، روحاء بیٹی کو اور مل جائیں گے۔“ وہ روحاء کے سر پر ہاتھ رکھ کے بولے۔

”میں صرف اپنی اولاد پر زبردستی کر سکتا ہوں کسی دوسرے کی اولاد پر نہیں۔“ شہرام کی آنکھیں کھل گئیں۔ روحاء کا چہرہ زرد ہو گیا۔ فرزام کچھ کہنا چاہتا تھا مگر مولوی صاحب آگئے تھے روحاء کی آنکھیں جیسے بھرا گئیں۔ شہرام اپنی جگہ سے ہل نہ سکا۔ بڑے بابا فیصلہ سنا چکے تھے۔

”تم جیسے بے غیرت کے لئے میرے گھر میں کوئی جگہ نہیں ہے اسی کے پاس چلا جا جس کے ساتھ گھوم رہا تھا مگر میں جانتا ہوں تو نہیں جائے گا کیونکہ تجھے اس سے بھی شادی نہیں کرنی۔“ بڑے بابا کہہ کر باہر نکل گئے اسماء نے ڈرتے ڈرتے شہرام کی طرف دیکھا وہ سن کر مڑا تھا روحاء نے سالم کی طرف دیکھا اور وہ اس کی نظروں سے گھبرا کر اسے کندھے سے لگا کر لے گیا۔

فرزام دروازے سے ہی مڑ گیا۔

☆.....☆.....☆

شہرام اور اسماء کا نکاح ہو گیا تھا شہرام دوپہر سے باہر نکلا ہوا تھا۔ فرزام کا بھی کچھ پتہ نہیں تھا۔ بڑی امی دونوں بیٹوں کے لئے رو رہی تھیں۔ آج تو پھپھو بھی نیچے آئی ہوئی تھیں، روحاء یونہی چپ تھی۔ سالم اسے دیکھ دیکھ کر ہول رہا تھا۔

”روحاء کچھ تو بولو۔“ وہ اسے بلا کر بولا۔ وہ جواباً پھٹی پھٹی آنکھوں کے ساتھ اسے دیکھتی رہ گئی۔ سالم نے اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر اسے خود سے لگایا۔ حاریہ بھی آئی تھی۔ اسے اپنا غم بھول گیا تھا اور روحاء کی فکر لگ گئی تھی۔

”پتہ نہیں کس کس کی خوشیاں چھینے گی یہ لڑکی۔“ حاریہ کو اسماء پر سخت تاؤ چڑھ رہا تھا۔

”میرے دونوں بیٹے چھین لئے مجھ سے پتہ نہیں کہاں ہوں گے میرے بچے۔“ بڑی امی الگ رو رہی تھیں۔ بڑے بابا اپنے فیصلے سے مطمئن تھے۔

”آجائیں گے تمہارے بیٹے سر چڑھائے تھے میں نے۔“ وہ بولے تھے۔

شام ہو گئی اور پھر رات کا اندھیرا چھا گیا، شہرام آیا اور سیدھا اپنے کمرے میں بند ہو گیا۔

”شہرام! کچھ کھالے بیٹا! دروازہ تو کھول۔“ مگر جواب نہ دار تھا، فرزام ابھی تک غائب تھا۔ روحاء چپ سا دھبے بس تکتے جا رہی تھی۔

”شہرام کو بلاؤ۔“ حاریہ نے مشورہ دیا مگر شہرام باہر آنے سے انکاری تھا۔ وہ سب دروازہ پیٹ پیٹ کر تھک گئے آخر سالم کو غصہ آ گیا۔

”شہرام! جب میری بہن مرجائے گی تو اس کے جنازے کو کندھا دینے کے لئے بھی باہر نہیں آئے گا۔“ تب شہرام باہر آیا۔

”روحاء۔“ روحاء نے کھلی آنکھوں سے اسے دیکھا وہ اسے جھنجھوڑ کے بولا۔

”روحاء۔“ اب کے وہ کٹے ہوئے شہتیر کی مانند اس کے سینے سے آگئی، اتار دوئی کہ بے ہوش ہو گئی۔

سالم، شہرام اور بڑے بابا اسے اسپتال لے کر آئے اس کا زورس بریک ڈاؤن ہوتے ہوتے رہ گیا تھا۔ شہرام اس کے ہوش میں آتے ہی نہ جانے کہاں نکل گیا تھا۔ کئی گھنٹے بعد روحاء کو گھر جانے کی اجازت ملی۔ فرزام کا کچھ پتہ نہیں تھا اس کا سیل فون بھی بند تھا، تبھی سالم کو امیمہ کی کال آگئی وہ بے تحاشا رو رہی تھی۔

”کیا ہوا امیمہ.....؟“ سالم پریشان ہو گیا دوسری طرف کی بات سن کر اس کے ہاتھوں سے موبائل پھسل گیا۔

”کیا ہوا سالم.....؟“ حاریہ نے پوچھا۔

”فرزام نے امیمہ سے شادی کر لی ہے۔“ اس نے بتایا تو حاریہ دم بخود رہ گئی۔

☆.....☆.....☆

فرزام نے واقعی امیمہ سے زبردستی نکاح کر لیا تھا اور اسے کسی اور فلیٹ پر لے گیا تھا، صبح ہو گئی تھی اسے روتے روتے۔ فرزام نے دو دفعہ کھانے کی ٹرے اس کے آگے رکھی تھی مگر وہ صرف رو رہی تھی۔

”امیمہ! کھانا تو کھاؤ۔“ وہ ایک دفعہ پھر ٹرے اس کے آگے رکھ کر بولا اور وہیں کارپٹ پر اس کے سامنے بیٹھ گیا وہ ایک لفظ نہ بولی۔

”پلینز امیمہ کھانا.....“ مگر وہ ایک دم چلا اٹھی۔

”دفع ہو جاؤ یہاں سے نہیں کھانا میں نے کھانا۔“

”امیمہ! تم مجھے کوس لو گالیاں دے لو مگر چند لقمے تو کھاؤ۔“ وہ بولا۔

”تھوڑا سا بھی خیال نہیں آیا تمہیں کہ تم اس شخص کی محبت چھین رہے ہو جو تمہاری خاطر صرف تمہاری خاطر اتنا کچھ کر رہا تھا۔“ امیمہ چیخ پڑی فرزام چپ رہا۔

”کیا سوچے گا سالم؟ کیا کرے گا اب وہ.....؟“ امیمہ کو پھر سے رونا آیا۔

”امیمہ میں بہورتا، ابو نے مجھے صاف کہہ دیا تھا

کہ میں کسی سے بھی شادی نہیں کروں گا، میں نے بہت برا کیا ہے، سالم سے میں اب کبھی نظریں نہیں ملا سکوں گا مگر امیمہ! تمہیں میں اب کسی قیمت پر نہیں چھوڑوں گا، ابو کو دکھاؤں گا کہ میں بے غیرت نہیں ہوں۔“ امیمہ اب بھی چپ تھی۔

”کھانا کھا لو پھر لے کر جاؤں گا تمہیں وہاں۔“ وہ بولا۔

”میں نہیں جاؤں گی۔“ وہ ہٹ دھرمی سے بولی۔

”نہیں جاؤ گی تو میں تمہیں اور خود کو آگ لگا لوں گا۔“ وہ چلا کے بولا، امیمہ چپ رہی۔

بڑی مشکلوں سے وہ فرزام کے ساتھ گئی تھی بڑے بابا گھر پر ہی تھے وہ جب امیمہ کو لے کر وہاں پہنچا تو سب ناشتہ کر رہے تھے اسے دیکھ کر چونک گئے۔

”کیوں آئے ہو اب۔“ سالم بھی آ گیا۔ امیمہ اسے دیکھ کر نظریں جھکا گئی۔ فرزام نے مضبوطی سے اس کا ہاتھ تھاما ہوا تھا۔

”آپ کو دکھائے آیا ہوں کہ میں بے غیرت نہیں ہوں، شادی بھی کی ہے اور اسی لڑکی سے کی ہے جس کے ساتھ گھوم رہا تھا۔“ سالم کے پیچھے کھڑی حاریہ کا دل کرچی کرچی ہو گیا۔

”اب اس گھر میں تبھی آؤں گا جب یقین کر لیں گے کہ میں بے غیرت نہیں ہوں۔“

”تب تمہارے ساتھ کون ہوگی؟“ بڑے بابا ہنسے تھے۔

”یہ ہی ہوگی۔“ اس کا جواب سالم کو سلا گیا، پھر فرزام پلٹ گیا شاید ہمیشہ کے لئے۔ سالم مڑا اس کے عین پیچھے حاریہ کھڑی تھی اس کی آنکھیں ایک دم چمکیں۔

”میری بات سننا حاریہ.....“ کہہ کر وہ اندر کی طرف مڑا حاریہ اس کے پیچھے آ گئی۔

”نیرا ساتھ دو گی حاریہ؟“ اس نے پوچھا تھا۔

☆.....☆.....☆

پھر کافی دن گزر گئے۔ شہرام صبح یونیورسٹی جاتا، پھر

”اس نے جو کچھ میرے ساتھ کیا ہے اس کا بدلہ۔“
ساریہ نے کتاب بند کر دی۔

”تو سالم کو اپنے ساتھ کیوں گھسیٹ رہی ہو۔“
”تمہیں اتنا دکھ کیوں ہو رہا ہے تمہیں کیا عشق ہے اس سے۔“ حاریہ اونچی آواز میں بولی۔

”ہاں مجھے عشق ہے اس سے۔“ ساریہ اس سے بھی اونچی آواز میں چلا اٹھی۔

”ساریہ.....“ وہ خیر کے عالم میں بولی ساریہ چپ ہو گئی۔

”ساریہ واقعی.....“ وہ اس کے پاس بیٹھی مگر ساریہ خود نہ بولی اس کی آنکھیں بول رہی تھیں حاریہ چند لمحے کچھ بول نہ سکی۔

”تم نے کبھی بتایا نہیں ساریہ.....“ وہ بولی۔
”کیونکہ مجھے جیسی لڑکی کے لئے محبت بہت بے معنی

لفظ ہوتی ہے میں بتاتی تو تم لوگ یقین نہ کرتے اور ویسے بھی میں نے اس موتی پہ ہاتھ رکھا جو کسی اور کے ہار میں سما ہوا تھا۔“ وہ کہہ کر انیکدم اٹھی اور باہر نکل گئی تھی حاریہ بیٹھی رہ گئی۔

”نہیں ساریہ! وہ موتی جس ہار میں سجا ہوا تھا وہاں سے ٹوٹ گیا ہے۔“ اس نے سوچا تھا۔

☆.....☆.....☆
پھر آہستہ آہستہ بہت سا وقت گزر گیا لمبی طویل گرمیاں اور جاڑا اس گھر کے مکینوں کو دیکھتا ہوا گزر گیا۔ شہرام باہر چلا گیا تھا اور جاتے جاتے آسمان کو انتظار کی صلیب پر لٹکا گیا۔ امیمہ نے پھر سے جاب شروع کر دی تھی مگر نہ وہ فرزام سے بولتی تھی نہ فرزام اسے کچھ کہتا تھا۔ حاریہ اور سالم کی پیپر میرج ابھی تک چل رہی تھی بس بدلے کی آگ آہستہ آہستہ خود ہی بجھ گئی تھی۔ دونوں بہنیں انگلینڈ میں مقیم اپنی والدہ کے پاس بھی ہو آئی تھیں وہیں حاریہ کی ملاقات علی سے ہوئی تھی جس سے اس کی والدہ اس کی بٹناوی کرنا چاہ رہی تھیں۔ علی کو وہ پسند آ گئی تھی علی میں کئی کئی چیزیں تھیں خوبصورت

کہیں اور نکل جاتا اور شام کو تب گھر آتا جب سب سو چکے ہوتے تھے آسمان چور بنی پھرتی روجاء کالج سے آ کر کمرے میں بند ہو جاتی کسی سے نہ بات کرتی نہ کسی کام میں حصہ لیتی ہر چیز سے الگ تھلگ ہو گئی تھی سالم نہ جانے کن سرگرمیوں میں لگا ہوا تھا فرزام اس دن کے بعد سے نہیں آیا تھا امیمہ سے اس کی بات چیت نہ ہونے کے برابر تھی اس نے خود ہی آفس جانا ہی چھوڑ دیا تھا فرزام بھی اسے کہیں نہیں جانے دیتا تھا جب جاتا تھا فلیٹ بند کر کے جاتا تھا۔ امیمہ ویسے بھی ایک ہی کمرے میں پڑی رہتی تھی۔ اس دن وہ اپنے کیمین میں بیٹھا تھا جب گلاس ڈور پر دستک ہوئی۔

”یس۔“ کہہ کر وہ دوبارہ فائلز میں گم ہو گیا۔

”مبارکباد نہیں دو گے فرزام!“ جانی پہچانی آواز سن کر اس نے سر اٹھایا اور پھر ساکن ہو گیا حاریہ اسے اب کبھی نہیں مل سکے گی یہ وہ جانتا تھا مگر یوں اس کے سامنے آئے گی یہ اس نے نہیں سوچا تھا وہ ایک دم کھڑا ہو گیا۔

”کیوں فرزام! کیسا لگتا ہے اپنی محبت کو کسی اور کے پہلو میں دیکھ کر۔“ سالم کی مسکراہٹ اسے سلگا گئی۔

”یقیناً بہت برا۔“ اس نے حاریہ کے کندھوں کے گرد بازو پھیلا کر اسے خود سے لگایا تھا۔ حاریہ دھیمے سے مسکرا دی۔ فرزام ساکن کھڑا رہ گیا تھا۔ اس نے بھی سالم کے ساتھ یہ ہی کیا تھا جواب وہ اس کے ساتھ کر رہا تھا۔

☆.....☆.....☆
وہ اپنے لئے چائے بنا کر کمرے میں آئی تو ساریہ جاگ رہی تھی۔

”یہ تم کہاں پھرتی رہتی ہو آج کل سالم کے ساتھ۔“ ساریہ طنز بھرے لہجے میں بولی۔

”تمہیں کیا.....“ وہ لا پرواہی سے بولی۔

”مجھے کچھ ہے تو تم سے پوچھ رہی ہوں۔“ حاریہ اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

”میں فرزام سے بدلہ لے رہی ہوں۔“

”کس بات کا.....؟“ ساریہ کے لہجے میں سختی تھی۔

خوب سیرت، ویل ایجوکیٹڈ، ویل آف کی حاریہ میں بھی نہیں تھی مگر کچھ کی ضرورت تھی وہ اپنی والدہ کو سوچنے کا کہہ کر آگئی تھی فرزام اب اسے نہیں مل سکتا تھا اور وہ کب تک فرزام کے سامنے اپنی اور سالم کی فرضی شادی کا ڈھونگ

رچائے گی؟ پھر اس کے سامنے ساریہ بھی جو خود کچھ نہیں کہتی تھی مگر اس کی نظریں بہت کچھ کہہ جاتی تھیں آخر اس نے ضبط کر لیا وہ ساری زندگی اکیلی نہیں گزار سکتی تھی اس کی محبت سچی تھی مگر اسے نہیں مل سکتی تھی یہ بھی سچ تھا۔ وہ اس دن سالم سے ملنے چلی گئی۔

”ماما نے میرے لئے لڑکا دیکھا ہے سالم۔“ وہ بولی۔

”تو پھر جارہی ہو واپس.....؟“ سالم نے سوال کیا تھا۔

”ہاں چلی جاؤں گی میں۔“ وہ سوچ کے بولی۔
”مجھے اس فرضی بندھن سے آزاد کر دو۔“ سالم نے گہری سانس لی۔

”راضی ہو اپنی والدہ کی رضامیں۔“ وہ سر نہ ہلا سکی۔
”راضی نہیں ہوں تو خلاف بھی نہیں ہوں میں ساری زندگی اکیلے نہیں گزار سکتی میں اپنی زندگی فرزام کے ساتھ گزارنے کے صرف خواب دیکھ سکتی تھی وہ میں نے دیکھ لئے مگر اس کا ساتھ میری قسمت نہیں تھا میری قسمت میں شاید سات سمندر پار بیٹھا وہ شخص ہے۔“

سالم نے پھر سانس لی۔
”ٹھیک ہے..... میں تمہیں کل ڈائیورس دے دوں گا۔“ سالم کھڑا ہو گیا تھا۔

”میری ایک بات مانو گے سالم۔“ اس نے پوچھا۔
”جب اپنی محبت لا حاصل ہو جائے تو کسی اور کی محبت کو حاصل کر لینا چاہئے۔“ سالم کے ماتھے پر لکیریں ابھریں۔

”میں کس کی محبت کو حاصل کر لوں.....؟“
”وہ جو تم سے بہت پیار کرتی ہے۔“

”کون.....؟“ اس نے پوچھا۔

”ساریہ.....“ سالم سن ہو گیا۔

”وہ کبھی نہیں کہے گی ساری زندگی تمہاری محبت دل میں دبائے بیٹھی رہے گی مگر تم سے کبھی نہیں کہے گی اس لئے تم کہہ دو۔“

”تم جانتی ہو میں صرف امیمہ سے کہتا تھا اب ساریہ سے کیسے کہہ دوں۔“ حاریہ اس کے سامنے آئی۔

”سالم! کبھی کبھی محبوب کے ساتھ زندگی گزارنے کی بجائے محبوب بن کر زندگی گزار لینا چاہئے بہت اچھی گزر جاتی ہے۔“ کہہ کر وہ نکل گئی سالم کرسی پر گر گیا۔

حاریہ نے فرزام سے ملنے کا بھی سوچا تھا مگر صرف فرزام کو سمجھانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا اسے امیمہ کو بھی سمجھانا تھا اسی لئے وہ ان کے آفس جانے کی بجائے گھر چلی گئی۔ دونوں رات کا کھانا کھا رہے تھے اسے دیکھ کر چونک گئے۔

”تمہیں تکلیف دینے نہیں آئی کچھ بتانے آئی ہوں۔“ وہ فرزام کا چہرہ دیکھ کر بولی تھی دونوں چپ رہے۔

”اسے کب چھوڑو گے فرزام.....؟“ اس نے پوچھا تھا۔

”کبھی نہیں۔“ فرزام کا لہجہ اٹل تھا۔
”تم کب جاؤ گی سالم کے پاس۔“ اب کی بار وہ امیمہ کی طرف مڑی۔

”کم ظرف لوگ اعلیٰ ظرف لوگوں کے ساتھ زندگی نہیں گزارتے اب نہ جانے کم ظرف میں ہوں یا وہ۔“ امیمہ بولی تھی۔

”جب تم دونوں کو ہمیشہ ساتھ رہنا ہے تو پھر دریا کے دو کنارے کیوں بنے ہوئے ہو۔“ دونوں چپ رہے۔

”فرزام! تم نے مجھے چاہا اور اس نے سالم کو مگر قسمت کو یہ منظور نہیں تھا اور ہوتا ہمیشہ وہ ہے جو قسمت کو منظور ہوتا ہے اور قسمت یہ ہے کہ تم دونوں ساتھ زندگی گزار دو انسان اپنا مقدر خود نہیں بناتا مقدر بنا دیا ہوتا ہے اور انسان کو اس مقدر کو تسلیم کرنا پڑتا ہے تم دونوں بھی

”یا تو مجھے ویسے اپنا نہیں جیسے فرزام نے اپنا یا ہے
امیرہ کو یا پھر ایسے چھوڑ دیا ہے۔“ وہ
ساکن رہ گیا۔ اسماء کی آنکھیں بھرا آئی تھیں۔ شہرام اس
کی طرف مڑا۔

”مجھ سے الگ ہونا چاہتی ہو.....؟“ وہ بولا۔
”میں اب بھی آپ سے الگ ہی ہوں۔“
”اور اگر میں نہ چھوڑوں تو.....؟“ وہ اس کے
قریب آیا۔

”تو پھر اس بار مجھے بھی اپنے ساتھ لے کر
جائیں۔“ اس کے آنسو جھلکے تھے۔

”میری وجہ سے جلا وطنی کاٹ رہے ہیں تو پلیز
میری وجہ سے خود پر اتنا برا ظلم نہ کریں مجھے چھوڑ دیں اور
اپنے ابو کے پاس آ کر رہیں میں نہیں بھی چلی جاؤں
گی۔“ وہ اب واقعی رو رہی تھی۔

”آخری فیصلہ ہے یہ تمہارا.....؟“ اسماء ایک لمحے
کو ڈمگائی مگر پھر سنبھل گئی۔

”ہاں آخری فیصلہ ہے۔“ شہرام نے کچھ لمحوں بھر
اس کا چہرہ تمام کے اس کے آنسو صاف کئے۔

”چلو آج سے تمہیں ویسے ہی اپناؤں گا جیسے فرزام
بھائی نے امیرہ کو اپنا یا ہے۔“ وہ بولا تو اسماء حیران ہو
گئی۔ فرزام دروازے پر کھڑا مسکرا رہا تھا۔

واقعی ایسے ہی ہوتا ہے، ہم کسی کو اپنانے کی اس کے
ساتھ تمام عمر گزارنے کی اسے دل میں بسانے کی تمنا بہت
شدت سے کرتے ہیں پھر اس تمنا کو اس خواہش کو حقیقت
میں بدلنے کے لئے کوشش بھی بہت کرتے ہیں مگر یہ
بھول جاتے ہیں کہ جو قسمت میں نہیں ہوتا وہ کوششوں اور
خواہشوں کے باوجود نہیں ملا کرنا چاہے ساری زندگی گزار
دو کیونکہ قسمت ’مقدر‘ نصیب یہ سب ہم خود نہیں لکھتے
مقدر وہی رہتے ہیں جو لکھ دیئے گئے ہوں ’مقدر‘ بدلائیں
کرتے، ہم صرف تمنا کر سکتے ہیں خواہش کر سکتے ہیں ہوتا
وہی ہے جو قسمت میں لکھا ہوتا ہے۔

☆.....☆

”کیونکہ تم ہاں کرو گی تو تم سے شادی کروں گا۔“
ساریہ کے ہاتھ سے پینٹ برش گر گیا وہ اس کے عین
پچھے کھڑا تھا۔

”چاہتی ہونا مجھے.....؟“ وہ انکار نہ کر سکی۔
”کب ساتھ دو گی میرا.....؟“ اس نے ساریہ کے
ہاتھ سے رنگ پکڑ کر رکھے اور اسے اپنی طرف موڑا۔
”جب تم میرا ساتھ دینا چاہو گے۔“ وہ بولی تو سالم
مسکرا دیا جواب مل گیا تھا وقت بتا رہا تھا کہ اس کی اور
ساریہ کی زندگی بہت اچھی گزرنے والی تھی۔

☆.....☆

بڑے بابا کو ہارٹ ایک ہوا تھا وہ اسپتال میں
ایڈمٹ تھے انہوں نے دونوں بیٹوں کو بلایا تھا وہ بھی
آخر انسان تھے دو بیٹوں کی جدائی کیسے برداشت کرتے
فرزام امیرہ کے ساتھ آیا تھا بڑے بابا نے اسے گلے
سے لگالیا۔

”دیکھ لیں ابو! میرے ساتھ آج بھی وہی ہے۔“
وہ کہنا نہیں بھولا تھا شہرام کئی دن بعد آیا تھا ان سب
نے مل کر اسماء کی ہمت بندھائی تھی شہرام کو واپس جانے
سے روکنا تھا اور یہ کام اسماء کو کرنا تھا۔ روحاء اور ساریہ
اسے بیوی پارلر سے تیار کروا کر فرزام کے کلیٹ پر چھوڑ
گئیں تھوڑی دیر بعد فرزام بھانے سے شہرام کو وہاں
اتار گیا۔ فرزام اور امیرہ اب بڑے گھر شفٹ ہو گئے
تھے روحاء کی چند دنوں بعد شادی تھی اس کے بعد سالم
نے ساریہ کو لے آنا تھا وہ جیسے ہی اندر داخل ہوا ٹھنک
گیا ڈانگ ٹیبل پر انگلیاں پھیرتی وہ اسماء ہی تھی وہ
وہیں سے مڑا۔

”کہاں جا رہے ہیں.....؟“ وہ ایک دم کھڑی
ہوئی تھی۔

”جہاں سے آیا ہوں۔“

”تو فیصلہ کر کے جائیں۔“

”کیسا فیصلہ.....؟“ وہ حیران ہوا تھا۔

”یہ ہی وجہ ہے سالم بھائی! کہ وہ مجھے پسند کرنا
ہے۔“ سالم سمجھ نہیں سکا۔

”وہ کتنا بھی اچھا ہو مگر وہ جانتا ہے میری اور شہرام
کی مگنی اور محبت کے بارے میں بے شک وہ مجھے ساری
زندگی یہ طعنہ نہ دے مگر بھائی میرے دل میں ہمیشہ یہ
خوف رہے گا یہ سچ ہے میں اس سے پیار نہیں کرتی
شادی کے بعد میرے دل میں ہمیشہ یہ خیال رہے گا کہ
وہ مجھ سے پیار کرتا ہے اور میں اس سے نہیں۔ بھائی
میں حسن سے محبت اپنے اور اس کے رشتے کی وجہ سے
کروں گی مگر یار سے محبت اس کے اس طعنے کے خوف
کے وجہ سے کروں گی میں حسن کے ساتھ ایک سکون
بھری ہی نہیں ایک اطمینان بھری زندگی بھی گزاروں گی
مگر یار کے ساتھ زندگی گزارتے ہوئے مجھے یہ
اطمینان نہیں ہوگا بھائی واقعی عورت کو اس سے شادی
کرنی چاہئے جو اسے چاہتا ہو مگر تب جب وہ عورت کی
محبت کے بارے میں کچھ نہ جانتا ہو حسن میرے اور
شہرام کے بارے میں کچھ نہیں جانتا اس لئے مجھے اس
سے شادی کرنا منظور ہے۔“ سالم اس کی بات سمجھ گیا اور
اس نے روحاء کا بھرپور ساتھ دیا۔

تھوڑے دنوں بعد روحاء اور حسن کی مگنی ہو گئی
حارہ واپس چلی گئی۔ اس دن سالم ساریہ کی طرف آ
گیا۔ ماموں کہیں گئے ہوئے تھے۔ وہ ساریہ کے
کمرے کی طرف آ گیا۔ وہ اسے دیکھ کر حیران ہوئی۔
”تم اس وقت خیریت.....؟“ وہ بولی۔

”ہاں..... ایک سوال کرنے آیا ہوں۔“ وہ آرام
سے کرسی پر گر گیا۔

”کیسا سوال.....؟“ وہ حیران ہوئی۔
”انسان کو کسے اپنا چاہئے.....؟ اسے جسے وہ
چاہتا ہو یا اس سے جو اسے چاہتی ہو۔“

”یہ نہیں۔“ وہ بولی۔
”لیکن مجھے پتہ ہے۔“ وہ کھڑا ہو گیا۔

”تو مجھ سے کیوں پوچھنے آئے ہو۔“ وہ ایک لمحے کو

تسلیم کر دیا ہم خواہش کر سکتے ہیں کوشش کر سکتے ہیں مگر
مقدر کو تبدیل نہیں کر سکتے فرزام! میں اگر تمہارا مقدر نہیں
تھی تو سالم کا بھی نہیں ہوں۔“ فرزام ایک دم چونکا۔

”ہاں میں انگلینڈ واپس جا رہی ہوں جانتے ہو
سالم کا مقدر کون ہے.....؟ وہ لڑکی جس کے عتاب کا
سب سے زیادہ نشانہ بنا تھا وہ ساریہ ہے اس کا مقدر۔“
امیرہ اب بھی چپ تھی۔

”امیرہ! تمہیں یہ..... قبول کرنا ہے کیونکہ یہ تمہارا
مقدر ہے۔“ کہہ کر وہ چلی گئی۔ امیرہ کے آنسو گر رہے
تھے فرزام چلتا ہوا اس کے قریب آیا پھر اس کے
سامنے بیٹھ گیا۔

”میں تمہیں ساری زندگی کے لئے اپنا مقدر سمجھ کر
قبول کر سکتا ہوں امیرہ مگر اس کے باوجود اگر تم اس کے
پاس جانا چاہو جس کا مقدر کوئی اور ہے تو تمہاری
مرضی۔“ وہ بول رہا تھا۔

”میری مرضی تب تو نہیں پوچھی جب زبردستی نکاح
کے پیپرز پر سائن کروا رہے تھے تو اب کیوں پوچھ رہے
ہو.....؟“ فرزام نے اس کے آنسو صاف کئے۔

”زندگی گزار لو گے اس لڑکی کے ساتھ جو کسی اور
سے پیار کرتی تھی۔“ وہ بولی۔

”کرتی تھی کرتی ہے نہیں۔“ وہ اس کے ہاتھ تمام
کر بولا۔

”جہاں تک ہو سکا میں اسے بھلانے کی کوشش
کروں گی۔“ فرزام نے اس کا ہاتھ ہونٹوں سے لگالیا۔

☆.....☆

روحاء کے لئے حسن کا رشتہ آیا تھا پھپھو نے آ کر
بتایا مگر ساتھ یہ بھی بتا دیا یار روحاء سے شادی کرنا چاہ
رہا ہے۔ بڑے بابا نے خود بلا کر روحاء سے پوچھا۔

”بڑے بابا مجھے یار سے شادی نہیں کرنی۔“ اس
نے ایک سیکنڈ میں فیصلہ سنا دیا تھا۔ گھر والے یار کے حق
میں تھے بھی سالم اس رات اس کے کمرے میں آیا۔
”وہ تمہیں پسند کرتا ہے۔“ وہ ایک دم بول پڑی۔

کش خان

افسانہ

ایک بار میرے دن کا تقاضہ

”زندگی کا سفر اگرچہ بڑا کٹھن بڑا دشوار ہے اس کے سنگ میل اگرچہ بہت دشوار ہیں مگر یہ بھی سچ ہے کہ سویرا۔ مجھے انتظار ہے اس روشن سویرے کا جب میری ہر سیاہ رات کے بعد ایک سویرا ہے..... ایک روشن



زندگی سے یہ تنہائی اور اداسی کے بادل چھٹ جائیں گے اور میں بھی پورے چاند کی طرح گنگن پر روشن چاندنی بن جاؤں گی انتظار ہے طویل مگر ختم ہونا ضرور ہے۔ یہ سچ ہے کہ میں نے محبت کی نہیں مگر محبت کی چاہ ضرور کی ہے۔“

”ستارہ!“ اس پہلی پکار پر ہی اس نے قلم بند کر کے ڈائری میں رکھ دیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

”جی می!“ وہ جلدی سے زینہ اتر کر ان کے سامنے حاضر ہوئی۔

”صبح اور دیا کالج سے آنے والی ہوں گی تم نے ابھی تک کھانے کا انتظام نہیں کیا؟ دماغ کہاں لگا رہتا ہے آخر؟ سوتیلی سہی ہیں تو بہنیں تمہاری ایک کھانا پکانا تو تمہاری ذمہ داری ہے وہ بھی یاد دلانا پڑتا ہے۔“

شیریں بیگم جو شروع ہوئیں تو بچے ادھیڑ کر رہی رکیں۔

”ممی! دیا نے کہا تھا ارہر کی دال چاول کا تو دال گلنے پر رکھی ہے میں گھوٹ لیتی ہوں اور صبح نے نوڈلز کھانے ہیں تو اس کے آتے ہی بناؤں گی آپ کے بگھارے بیگن بھی چڑھے ہوئے ہیں ان چیزوں کے گلنے میں وقت تھا تو میں کچھ دیر کے لئے اوپر چلی گئی تھی۔“ وہ دبی آواز میں بولی۔

”مجھے اپنے کاموں کی فہرست مت گنواؤ“ کچن میں کھڑی ہوں میں سب چیزیں نظر آ رہی ہیں جلدی سے سب تیار کرو اور رات کے لئے نرگسی کو فتنے مٹر ملاؤ اور چاکلیٹ کسٹرڈ بنا لینا۔“ وہ غصہ سے گھور کر چلی گئیں۔ اس کی کب کی رُکی سانس بحال ہوئی۔

☆.....☆.....☆

”ستارہ..... ستارہ“ دیا کی تیز پکار پر وہ آلیٹ کی پیاز توڑے پر چھوڑ کر تیزی سے بھاگی کہ اس نے اگر ہنگامہ مچا دیا تو اسے سنبھالنا محال تھا۔

”کیا ہوا دیا؟“ وہ پھولی ہوئی سانس میں جلدی سے بولی۔

”تم نے یہ کپڑے پرپس کیے ہیں؟ واٹ نان

سنس..... تمہیں کپڑے استری کرنے نہیں آئے؟ یہ شکنیں دیکھ رہی ہو میں ایسے کپڑے پہن کر نہیں جاسکتی جلدی سے میرا یونیفارم دوبارہ پرپس کر دو۔ وہ تحکم سے کہتی اپنے شوڈر کٹ بالوں میں برش کرنے لگی۔

”لیکن میں ناشتہ بنا رہی ہوں۔“ اس نے دبا دبا احتجاج کرنا چاہا۔

”سو واٹ؟ میرا بریک فاسٹ ریڈی کرو جتنی دیر میں بریک فاسٹ کروں گی تم پرپس کر دینا“ جاؤ اب۔“ وہ آرام سے برش کرنے لگی۔ وہ بے بسی سے ہاتھ ملتی تیزی سے کچن میں بھاگی۔ پیاز جل جاتی تو اسے دوبارہ سب کرنا پڑتا۔

اس نے سب کا ناشتہ ٹیبل پر رکھا اور کپڑے پرپس کرنے چل دی۔ بھوک سے حالت بری تھی جلدی سے پرپس کر کے ڈائننگ ہال کی طرف بڑھی کہ کال نیل بجی۔ اسے پتہ تھا کوئی نہیں جائے گا نا چار دروازے کی طرف بڑھی سخت بھوک میں لان سے گزر کر دروازے تک جانا پہاڑ سر کرنے کے برابر لگ رہا تھا بے دلی سے گیٹ کھولا۔

”السلام وعلیکم!“ موسم سرما کی ٹھنڈی سی دھوپ میں انگوری رنگ کا پیارا سا سوٹ پہنے ایک سو برسی آنٹی بکھری ہوئی تھی۔

”وعلیکم السلام!“ اس نے بھی اپنے چہرے کے بگڑے زاویے درست کیے اور خیر مقدمی مسکراہٹ بکھیری۔

”بیٹا اندر آنے کو نہیں کہو گی؟“ وہ اتنی پیاری تھیں کہ وہ محویت سے ان کا جائزہ لینے میں مشغول تھی کہ ان کے آنے کا مقصد پوچھا اور نہ اندر بلایا۔

”اوہ..... سوری آنٹی! آئیے۔“ وہ تیزی سے راستہ دینے کو بیٹی۔

”آپ کا کیا نام ہے بیٹا؟“ وہ اس کے بکھرے سے حلیے کا جائزہ لے کر بولیں اپنے حلیے پر اسے خود

شرمندگی ہوئی۔ کل نہائی تھی تو مصروفیت میں بال بنانے کا وقت ملا نہیں، گھٹنوں سے نیچے آتے بال کھلے ہوئے تھے بس ایک کچر پھنسا ہوا تھا بالوں میں، شاٹنگ پنک جوڑے میں اس کی گوری رنگت اگرچہ بہت دمک رہی تھی مگر تیل کے چھینے کافی برے لگ رہے تھے مگر خراب حلیے کے باوجود اس کا قدرتی حسن قلعاً نہیں دب رہا تھا۔ ہیزل گرین آنکھیں، گھنی پلکیں، شکر فی لب، بونا قد، متناسب سراپا بلاشبہ وہ حسین تر تھی اور صبح صبح کی بھاگ دوڑ سے سفید گال گلابی ہو رہے تھے۔

”ستارہ“۔ وہ مسکرا کر بولی۔

”ماشاء اللہ..... تم تو واقعی ستارہ ہو“۔ انہوں نے اس کی تعریف کی تو وہ جھینپ گئی۔ انہیں ڈانٹنگ ہال میں ہی لے آئی۔

”یہ میری امی اور یہ میری چھوٹی ٹوئز بہنیں ہیں دیا اور صبح اور یہ.....“ شیریں بیگم ایک اجنبی خاتون کو ستارہ کے ساتھ آگے دیکھ کر جلدی سے کھڑی ہو گئیں تو ستارہ تعارف کرانے لگی مگر جب آنٹی کی باری آئی تو اسے یاد آیا اس نے تو ان سے کچھ پوچھا ہی نہیں ہے۔

”میرا نام شبانہ ہے، ہم آپ کے نئے پڑوسی ہیں، نیا مکان لیا ہے تو آج دوپہر میں ظہر کے بعد میلا در کھا ہے اگر آپ اور بچیاں آئیں تو ہمیں بڑی خوشی ہوگی“۔ وہ اپنی اسی مدھم مسکراہٹ سے کہنے لگیں۔

”انشاء اللہ ہم ضرور آئیں گی“۔ شیریں اس وقت واقعی شیریں بن گئیں۔

”دیا“ صبح! بیٹا برتن اٹھاؤ اور آنٹی کے لئے ناشتہ لاؤ“۔

”ارے نہیں ناشتہ تو میں فجر کے بعد ہی کر لیتی ہوں، جائے ابھی ہی پی ہے کچھ تکلف نہیں پھر آؤں گی تو کھانا کھا کر ہی جاؤں گی آج تو آپ لوگ ہمارے گھر آئیں۔ ستارہ بیٹا تم ضرور آنا“۔ وہ تاکید سے بول کر چلی گئیں۔

”ستارہ! برتن اٹھاؤ اور کچن سمیٹو“۔ ان کے جاتے ہی وہ اپنی جون میں لوٹ آئیں۔

”جی می!“ وہ مرے مرے قدموں سے کام سمیٹنے لگی۔

دیا اور صبح نے تو 3 بجے لوٹا تھا ستارہ کو ہی وہ مجبوراً لے کر گئیں۔ شبانہ نے اپنے لان میں انتظام کیا تھا کافی عورتیں تھیں۔ یہ لوگ جگہ بناتی شبانہ تک پہنچیں کہ انہیں دیکھ کر ہکا بکا کھڑی رہ گئیں۔

شبانہ کے برابر میں بالکل ان کی ہم شکل ان ہی کی طرح کی خاتون بیٹھی تھیں۔

”ارے ستارہ بیٹا!“ ان میں سے ایک لپک کر انہیں تو انہیں پتہ لگا کہ یہ شبانہ ہیں۔

”ریحانہ! یہ ستارہ ہے اور یہ اس کی امی شیریں ہیں اور شیریں! یہ میری جڑواں بہن ریحانہ ہیں، سمن آباد میں رہتی ہیں“۔ شبانہ نے باہم تعارف کروایا۔

”اسم باسکی ہے یہ بچی تو.....“ ریحانہ بڑی مگر جوشی سے دونوں سے گلے ملیں۔

”اور کیا کرتی ہو بیٹا! کون سی کلاس میں پڑھتی ہو؟“ ریحانہ نے اپنے پاس ہی اسے بٹھالیا۔

”آنٹی! گریجویشن کیا ہے اور گھر کے کام وغیرہ کرتی ہوں یعنی اب گھر پر ہی ہوتی ہوں، میری چھوٹی بہنیں ابھی کالج میں ہیں فرسٹ ایئر میں۔ می کے پاس کوئی ہوتا نہیں تو میں نے آگے پڑھائی چھوڑ دی“۔ وہ دھیمے لہجے میں بولی۔

”اور تمہارے والد.....“

”ان کا اور میری ماما کا 3 سال پہلے روڈ ایکسیڈنٹ میں انتقال ہو گیا تھا، می میری اسٹیپ مدر اور دیا اور صبح میری اسٹیپ سسٹر ہیں، تب سے میں می کے ساتھ رہتی ہوں ورنہ ہم الگ رہتے تھے“۔

”او..... تو یہ بات ہے“۔ وہ بغور اسے دیکھتی فیصلہ کن انداز میں اٹھ کر شیریں کے پاس چلی گئیں۔

☆.....☆.....☆

”سنا ہے کہ جاتا ہوا خزاں نوید بہار دے جاتا ہے“ کہتے تو سب تھے مگر اب لگتا ہے کہ یہ سچ ہی ہے کیونکہ سونا جلنے سے پہلے کندن نہیں بنتا، نکلی بننے سے پہلے پھول نہیں کھلتا، رات جانے سے پہلے اجالا نہیں ہوتا اور قسمت مہربان ہونے سے پہلے کنارہ نہیں ملتا۔ وہ جو آنٹی ہیں ناں شبانہ آنٹی کی بہن..... وہ می کو میرے رشتہ کا پیغام دے گئی ہیں اور حیرت کی بات یہ ہے کہ می کا جواب اثبات میں ہے، مگر اس کا جواب بھی مجھے مل گیا ہے۔ می دیا اور صبح سے کہہ رہی تھیں کہ کلمو ہی کا رشتہ آیا تو بہت اچھا ہے دل مان نہیں رہا اتنی اچھی جگہ اسے بھیجے کو مگر جب تک یہ یہاں رہے گی تم لوگوں کے اچھے رشتے نہیں مل پائیں گے کیونکہ وہ خوبصورت بہت ہے تو اس لئے ریحانہ آنٹی کو میری شادی کی تاریخ دے دی گئی ہے فروری کی 28 تاریخ میں میری زندگی بدل جائے گی۔ بنتی ہے یا بگڑتی ہے مالک کے ہاتھ میں ہے، میں مگر ہر حال میں یہ رشتہ نبھاؤں گی چاہے سمجھوتہ ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ اور سال کا آخری صفحہ بھی ڈائری کا پورا ہو گیا اور اب اس نے سوچ لیا کہ مزید ڈائری نہیں لکھے گی۔

☆.....☆.....☆

زور زور سے دھڑکتے دل کی آواز اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ گلاب کے پھولوں کے درمیان وہ خود ایک خوبصورت گلاب لگ رہی تھی آج بالآخر وہ ایک ایسے شخص کی سجا کر بیٹھی ہوئی تھی جس کو کبھی دیکھا نہ تھا صرف اس کا نام جانتی تھی، انس حیات۔ جو اب اس کا مجازی خدا تھا۔ انتظار کی گھڑیاں طویل ہوتی جا رہی تھیں تو وہ بالآخر بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کر کمر سیدھی کرنے لگی مگر دروازہ کھلنے کی آواز پر ایکدم سیدھی ہو کر سر جھکا گئی۔

”السلام وعلیکم یا عروس!“ انس حیات کی شوخ آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

”بھئی یہ کیا اس زمانے میں بھی اتنا لمبا گھونگھٹ جبکہ آج کل تو دلہنوں کا سرے سے گھونگھٹ ہی نہیں ہوتا اور میرے سلام کا جواب تو دو بھئی!“ یہ کہتے کہتے اچانک اس نے گھونگھٹ الٹ دیا، تیز تیز چلتی زبان بند ہو گئی۔ وہ ایکدم دنگ رہ گیا۔ ستارہ اتنی حسین ہوگی اس کے تصور میں بھی نہ تھا۔ میرون لہنگا اور دوپٹہ اور چولی پر خوب پیارا کام ہوا تھا، خوبصورت بیضوی چہرے پر ٹیکا، جھومر اور ننھ الگ ہی چھب دکھلا رہے تھے، کبھی تیار نہ ہونے والی ستارہ پر آج اتنا روپ آیا تھا کہ حد نہیں۔ بڑی مشکل سے وہ اپنے حواس بحال کر پایا اور گنہگار لہجے میں بولا۔

”ستارہ! تم میرے تصور سے کہیں بڑھ کر حسین ہو، امی نے کہا تھا دلہن بہت خوبصورت ہے مگر خوبصورت لفظ تمہارے آگے بچ ہے مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ میں پہلی ہی نظر میں اپنی دلہن کے آگے دل ہار چکا ہوں مگر کیا میری عروس ایک بار بھی مجھے نہیں دیکھے گی؟ ایک بار میری طرف دیکھو پلیز!“ گنہگار لہجے میں کی گئی التجا نے اسے سر اٹھانے پر مجبور کر دیا مگر مقابل کی سحر طراز آنکھوں میں ٹھانٹیں مارتے چاہت کے سمندر نے اسے ایک بل سے زیادہ دیکھنے نہ دیا مگر ایک بل میں ہی وہ اپنے نصیب پر شکر بجالائی کیونکہ وجاہت میں وہ کسی طرح اس سے کم نہ تھا۔

”تو کیا لگا میں؟“ وہ یقیناً اپنی شخصیت کے بارے میں آگاہ تھا۔

”اف!“ دل کی حالت تو حد سے سوائی اس کے کوئی جواب نہ دینے پر اس کا ہاتھ اس کی گرفت میں چلا گیا، اس نے کسمسا کر چھڑانا چاہا مگر وہ دوسرا ہاتھ بھی قید کر گیا۔

”پلیز!“ وہ اس کی سخت گرفت میں متوش ہو گئی۔

”جب تم کسی بات کا جواب نہیں دو گی تو کیا پلیز.....“ وہ اس کے جواب نہ دینے پر کچھ برہم ہوا تھا۔ مگر وہ اس کا بلکا ساخت لہجہ بھی برداشت نہ کر پائی بے

اختیار رو آنسو بہہ گئے۔
”ارے“۔ وہ اپنی برہمی بھول کر اس کے اشک اپنے لبوں سے چن گیا۔

”سوری میں بھول گیا تھا آج رات میں دلہن بولتی نہیں.....“ وہ اس کی اشکبار آنکھوں میں دیکھ کر مسکرایا، وہ فوراً سر جھکا گئی۔

”یہ آپ کی منہ دکھائی مسز ستارہ انس!“ ایک خوبصورت لاکٹ وہ اس کے گلے کی زینت بنا گیا اور دھیرے دھیرے اس کے دوپٹے کی پٹنیں نکالنے لگا اور سرگوشیاں کرنے لگا۔

وہ اپنے ہوش رُبا سراپے سمیت اس کی نگاہوں کی گرفت میں تھی۔ اس نے دوپٹہ اٹھانا چاہا مگر اس کا بڑھا ہاتھ اس کے قبضے میں آ گیا اور اگلے ہی پل وہ اس کی گرفت میں بے بس ہو گئی اور رات ستارہ کی مانگ میں چاند بھر گیا۔

☆.....☆.....☆

صبح شاور لے کر ریڈ کلر کا دیکے کا سوٹ پہنا اور آئینے کے آگے کھڑی اپنے لمبے گھنے بال سلجھا رہی تھی کہ انس بھی شاور لے کر ٹاول سے بال رگڑتا باہر آیا۔ آئینے میں اس سے نظریں ملیں تو وہ فوراً آنکھوں پر پلکوں کی جھال گر گئی۔

”صبح بخیر زندگی!“ وہ ٹاول ایک طرف پھینک کر اسے بانہوں میں بھر چکا تھا۔

”سنئے! مجھے تیار ہونا ہے۔“ جب اس کی گرفت میں بے خودی غالب آنے لگی تو ستارہ کو لب کھولنے ہی پڑے۔

”کیوں تیار ہونا ہے؟ ارے تمہیں تو اللہ نے تیار کر کے بھیجا ہے۔“ وہ اس کی کالی گھٹاؤں میں کھور ہاتھ کہ یکدم کسی نے دروازہ دھڑ دھڑایا۔

”اوشٹ!“ وہ برا سا منہ بنا کر پیچھے ہٹا، ستارہ معجوب سی سر پر دوپٹہ ڈال کر کنارے پر ٹنگ گئی۔ انس نے ہی دروازہ کھولا۔

”میرے منہ میں زبان بھی ہے اور اس کا استعمال بھی خوب جانتی ہوں، بے فکر رہیں آپ۔“ وہ اس کی شکل دیکھ کر کھلکھلا کر ہنس دی۔

”بہت خوب! بدلے بدلے سے میرے سر کا نظر آتے ہیں۔ جانم! تمہاری یہ پٹر پٹر چلتی زبان میں پل میں بند کر سکتا ہوں، مجھ سے زیادہ کونفیڈنس تو یقیناً آپ میں نہیں پایا جاسکتا۔“ وہ اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر اس کی آنکھوں میں جھانک کر ذومعنی بولا، پل بھر میں ہی اس کی پلکیں سجدہ ریز ہو گئیں۔

”میں آپ سے نہیں بولوں گی۔“ جب وہ اسے چھوڑ کر ہٹا تو وہ شکایتی انداز میں بول کر تیزی سے باہر نکل گئی، ہاں اس کا قبضہ سماعتوں میں ضرور گونجا۔

”ستارہ کے ہاتھ میں ڈالنے بہت ہے جو بناتی ہے لا جواب۔“ حیات صاحب نے دل کھول کر داد دی۔ ریحانہ نے بھی تائید کی۔ ستارہ مسکرا کر مینگو آئسکریم نکال لائی۔

”انس! تم آج آفس کیوں چلے گئے تھے؟ ابھی شادی کو ہفتہ ہی تو گزرا ہے، کہیں گھومنے بھی نہیں گئے تم لوگ۔“ ریحانہ نے انس کو آڑے ہاتھوں لیا۔

”ارے ای حضور! اسی لئے تو آفس گیا تھا، باس نے بلایا تھا ان کی طرف سے پیرس کے ہمارے ٹکٹ ہمارا شادی کا گفٹ ہے لینے گیا تھا، بس دو دن بعد ہم پندرہ دن کے ٹور پر جا رہے ہیں۔“ وہ مسکرا کر بولا۔

”مینگو آئسکریم بنائی تھی اس لئے مینگو کلر کا سوٹ پہنا تھا۔“ وہ کچن سمیٹ رہی تھی کہ وہ اس کے سر پر آ کھڑا ہوا، اس نے شکایتی نظروں سے دیکھا مگر چپ رہی۔

”یار! اتنے قاتل نین نہیں تمہارے پھر بھی ایسے دیکھو تو بس.....“ وہ خاموشی سے سمیٹنے میں لگی رہی۔

وہ کھٹ کھٹ کرتی کمرے میں گھس گئی۔ تیزی سے چلتی ڈریسنگ روم میں گھس رہی تھی کہ انس نے تیزی سے اس کی کلائی پکڑی اور جھٹکے سے اسے کھینچا، وہ

لیمن شیفون کا سوٹ جس پر سلور کام ہوا تھا اس کی گلابی رنگت پر دمک اٹھا تھا۔ گیلے لمبے بال اس کی پشت پر بکھرے ہوئے تھے انہیں کچر لگا کر کھلا چھوڑ دیا۔ لائٹ سامک اپ کر لیا، میرون لپ اسٹک ہی بس ڈارک لگائی تھی، پرفیوم سے خود کو مہکا کر دوپٹہ کھول کر اوڑھنے لگی تھی کہ دروازہ کھلا اور انس اندر آیا، اسے دیکھ کر دو منٹ کو ساکت کھڑا رہ گیا۔

”السلام وعلیکم!“ اس کے دیکھنے کے انداز پر وہ جھینپ گئی۔

”السلام وعلیکم!“ وہ ایک لمبی سانس لے کر بیڈ پر بیٹھ گیا۔ وہ خواجہ ڈرینگ ٹیبل درست کرنے لگی۔

”یہ تم کیا میرا ہارٹ فیل کروانا چاہتی ہو، روز آفس سے آؤ تو ایک نیاروپ سجائے تم ملتی ہو، تم اتنی زیادہ خوبصورت ہو کہ مجھے روز تم بدلی بدلی لگتی ہو۔“ وہ شوز اور کوٹ اتار کر اس کے پیچھے آ کھڑا ہوا۔

اس نے لمحہ بھر کو نظر اٹھا کر آئینے میں دیکھا وہ انتہائی محویت سے اس کا جائزہ لینے میں مشغول تھا، وہ دھیرے سے اس کی طرف مڑی۔

”یہ بتائیں! آپ مجھے کب بیوقوف بنانا بند کریں گے؟ روز اس طرح قصیدہ پڑھتے ہیں جیسے واقعی میں کہیں کی حسینہ عالم ہوں، آپ نے اگر میری تعریف میں یہ مبالغہ آرائی بند نہ کی تو میں تیار ہونا چھوڑ دوں گی۔“ وہ اس کی تعریفوں پر بس جھینپ جاتی تھی اس لئے تھوڑا کونفیڈنس سے بولی۔

”یہ میری ہی بیوی ہے ناں۔“ وہ دھیرے سے ستارہ کے چٹکی لے کر بولا، وہ پیچ پڑی۔

”شکر..... میں سمجھا کوئی بدروح وغیرہ تمہاری شکل میں آ گئی ہے، یار تمہارے منہ میں زبان بھی ہے؟ سچ شادی کے دن سے ابھی تک پہلی بار تم نے مجھ سے آنکھ ملا کر پہلا طویل جملہ کہا ہے، دکھاؤ یار زبان لمبی ہو گئی ہے یا بدل گئی ہے؟“ وہ شرارت سے اس کے قریب ہوا۔ وہ تیزی سے پیچھے ہٹی۔

”السلام وعلیکم!“ اس کے دیکھنے کے انداز پر وہ جھینپ گئی۔

”السلام وعلیکم!“ وہ ایک لمبی سانس لے کر بیڈ پر بیٹھ گیا۔ وہ خواجہ ڈرینگ ٹیبل درست کرنے لگی۔

”یہ تم کیا میرا ہارٹ فیل کروانا چاہتی ہو، روز آفس سے آؤ تو ایک نیاروپ سجائے تم ملتی ہو، تم اتنی زیادہ خوبصورت ہو کہ مجھے روز تم بدلی بدلی لگتی ہو۔“ وہ شوز اور کوٹ اتار کر اس کے پیچھے آ کھڑا ہوا۔

اس نے لمحہ بھر کو نظر اٹھا کر آئینے میں دیکھا وہ انتہائی محویت سے اس کا جائزہ لینے میں مشغول تھا، وہ دھیرے سے اس کی طرف مڑی۔

”یہ بتائیں! آپ مجھے کب بیوقوف بنانا بند کریں گے؟ روز اس طرح قصیدہ پڑھتے ہیں جیسے واقعی میں کہیں کی حسینہ عالم ہوں، آپ نے اگر میری تعریف میں یہ مبالغہ آرائی بند نہ کی تو میں تیار ہونا چھوڑ دوں گی۔“ وہ اس کی تعریفوں پر بس جھینپ جاتی تھی اس لئے تھوڑا کونفیڈنس سے بولی۔

اس کے سینے سے جا لگی، انس نے اس کا کچر ہٹا دیا۔
کالے سیاہ بادلوں نے اس کا گھیراؤ کر لیا۔
”چھوڑیں مجھے۔“ وہ برہمی سے چیختی۔ انس اسے
چھوڑ کر حیرت سے دیکھنا لگا۔ وہ غصہ پر قابو پا کر بیڈ کے
کونے پر ٹپک گئی۔

”آخر ہوا کیا ہے؟ مزاج اتنے برہم کیوں ہیں؟
میں آفس سے آیا تھا تب تو ٹھیک تھیں۔“
”میں ابھی بھی ٹھیک ہوں۔“ وہ خود کو کمپوز کر کے
تھوڑا آرام سے بولی۔

”دیکھیں انس! یہ آپ کا مزاج ہے میں سمجھ چکی
ہوں، مگر پلیرز کمرے کے باہر تھوڑا سا نگاہوں کو کنٹرول
رکھا کریں، ابھی ٹیل پر اٹکل بھی تھے آنٹی بھی پھر بھی
آپ کس طرح دیکھے جارہے تھے مجھے آنٹی نے کہا کہ
آپ کو سمجھاؤں۔ میرا کوئی قصور نہیں تھا پھر بھی اپنا آپ
عجیب لگ رہا تھا۔“ اس کے غصہ کی وجہ یہ تھی انس کی
پیشانی پر سوچ کی لکیریں پھیل گئیں۔

”یار! میرا مزاج ہی ایسا ہے تم اتنی اچھی لگتی کیوں
ہو کہ انسان بس تمہیں ہی دیکھتا جائے؟“ وہ بے چارگی
سے بولا۔ باوجود غصے کے ستارہ کوٹھی آ گئی۔
”مگر آج کے بعد آپ کمرے کے باہر خود پر
کنٹرول رکھیں گے۔“ وہ تیزی سے پیچھے ہو کر کھڑی
ہو گئی۔

”کمرے سے باہر ناں! کمرے کے اندر تو پابندی
نہیں۔“ وہ اس کی کلائی کھینچ کر خود پر گرا چکا تھا۔ اس کا
پیار ایک سرکش ندی تھی جس کی بہتی تیز موجوں سے وہ
لاکھ چاہ کر بھی خود کو بچا نہیں پاتی تھی۔



یہ لوگ ہنی مون منا کر لوٹ آئے، دعوتوں کے بعد
روٹین کی زندگی شروع ہو گئی۔

”ہیلو!“ انس آفس میں مصروف تھا کہ فون کی
بیل پر اٹھایا۔

”السلام وعلیکم! آپ انس بھائی ہیں ناں ستارہ کے

شوہر؟“ کوئی نسوانی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی۔
”جی! مگر آپ کون؟“ اسے سخت حیرت ہوئی۔
”میں رباب ہوں ستارہ کی دوست میں نے ایک
بات بتانے کے لئے آپ کو فون کیا ہے۔“ وہ تمہید
باندھنے لگی۔

”فرمائیے۔“ انس فائل بند کر کے ہمد تن گوش ہوا۔
”ستارہ اور میرے بھائی ہاشم ایک دوسرے کو پسند
کرتے تھے مگر ستارہ اپنی اسٹیپ مدر کے آگے اسٹینڈ
لینے کی پوزیشن میں نہ تھی تو اسے مجبوراً آپ سے شادی
کرنا پڑی، مگر وہ چاہتی میرے بھائی کو ہے وہ آپ کے
ساتھ صرف سمجھوتہ کر رہی ہے آپ اسے طلاق دے
دیں کیونکہ وہ میرے بھائی کے ساتھ ہی خوش رہ سکتی
ہے۔“ انس ہکا بکارہ گیا۔ فون بند ہو چکا تھا۔ دماغ نے
کام کرنا بند کر دیا۔ کیا سچ ہے کیا جھوٹ؟

انس نے دماغ کو ہوش دلایا اور سی ایل آئی سے
وہ نمبر اتارا، کار کی چابی اٹھا کر ریش ڈرائیونگ کرتا
گھر پہنچا۔

”طبیعت تو ٹھیک ہے بیٹا؟ آج 4 بجے ہی آ
گئے۔“ گھستے ہی پہلانا کراریحانہ بیگم سے ہو گیا۔

”جی می! بس سر میں درد ہے تھوڑا ریٹ کر دوں
گا۔“ وہ زبردستی مسکراتا کمرے میں آ گیا۔ ستارہ بیڈ پر
نیم دراز کوئی کتاب پڑھ رہی تھی اسے دیکھ کر ایک دم
کھڑی ہو گئی۔

”ارے آپ اتنی جلدی آ گئے۔“ وہ مسکراتے
ہوئے آگے آئی اور اس کا کوٹ اٹھا کر بولی۔

”واپس چلا جاؤں؟“ سرد آواز میں سپاٹ لہجے
میں بولتا وہ ستارہ کی مسکراہٹ عائب کر چکا تھا۔

”کیا ہوا؟ طبیعت تو ٹھیک ہے آپ کی۔“ وہ اس
کے بدلے انداز پر ہراساں ہوئی۔

”اب جی تو ہوش میں آیا ہوں! بالی داوے رباب
کافون آیا تھا آج میرے پاس۔“ وہ اس کے سامنے جا
کھڑا ہوا۔

”کون رباب؟“ وہ حیرت سے آنکھیں پھیلا کر
بولی، دل الگ ڈوبا جا رہا تھا۔

”اوہ! رباب نہیں پتہ کون ہے پھر تو ہاشم کو بھی نہیں
جانتی ہوگی؟“ وہ استہزائیہ انداز سے ہنسا۔

”کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ؟ کون رباب
کون ہاشم؟ اگر میں جانتی ہوتی تو چھپاتی کیوں؟“ وہ
روہا نسی ہو گئی۔

”شٹ اپ! جھوٹ مت بولو تمہاری معصوم
صورت کے فریب میں میں اور نہیں پھنس سکتا۔ رباب
تمہاری سہیلی تمہارے محبوب ہاشم کی بہن، اس کا فون آیا
تھا آج آفس میں اور تمہاری ساری داستان عشق اور
مجبوری اس نے مجھے بتا دی ہے تم جو چاہو میں فیصلہ
کرنے کو تیار ہوں۔“ وہ مڑا۔

”انس! بخدا میرا یقین کریں میں ایسی نہیں میری
زندگی میں سوائے آپ کے کبھی کسی مرد کا گزر نہیں ہوا
آپ مجھ پر اعتبار کریں وہ جو بھی تھی جھوٹی تھی میں نہیں
جانتی کہ میری دشمن آخر کون ہے مگر میں یہ جانتی ہوں
کہ میں آپ سے بہت محبت کرتی ہوں جدائی کی بات
مت کریں اور اس کے فریب میں نہ آئیں، پلیرز
انس۔“ وہ بھاگ کر اس کی پشت سے لپٹ گئی اور
پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”ٹھیک ہے تمہیں ایک چانس دیتا ہوں، بتاؤ یہ نمبر
کس کا ہے؟“ وہ جو نمبر لکھ کر لایا تھا وہ اسے دکھایا۔

”یہ تو میرے گھر کا نمبر ہے ای کے گھر کا۔“ وہ
حیرت سے چیخ پڑی۔

”کیا؟“ انس بھی چونک پڑا، اپنے سیل میں اس
کے گھر کا نمبر نکالا، دونوں نمبر سیم تھے۔ وہ ٹھنڈی
سانس بھر کر شرمندگی سے سر جھکا گیا۔ اپنی جلد بازی
پر سوائے کف افسوس ملنے کے کچھ نہ کر سکتا تھا، چور
نظروں سے اس کا چہرہ دیکھا۔ یہاں ستارہ کے
حواس منجمد تھے سوتیلی بہنیں بدخواہی میں اس حد تک
جا سکتی ہیں؟ اب پتہ لگا تھا۔ آنسو بے اختیار بہہ

رہے تھے۔ وہ وہیں کارپنٹ پر بیٹھتی چلی گئی۔ ایک
سوتیلے رشتوں کی کاٹ دوسرے محبوب جیسے شوہر کی
بے اعتباری۔

وہ اس کے سامنے ہی گھٹنے ٹکا کر بیٹھ گیا۔ سمجھ نہیں آ
رہا تھا کن لفظوں سے اپنی بے اعتباری کا مداوا کرے۔

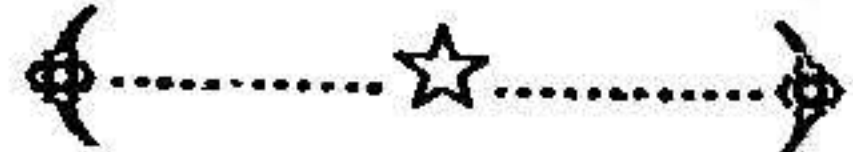
”آئی ایم سوری!“ دھیرے سے اس کے ہاتھ
تھامے۔ ستارہ نے ایک جھٹکے سے چھڑا لیے اور کھڑی ہو
گئی۔ وہ اس کی طرف دیکھے بغیر جانے لگی کہ جھٹکے سے
اس نے کلائی پکڑ کر کھینچا، وہ اس کے سینے سے آگئی دور
ہونا چاہا مگر مقابل کی گرفت آہنی تھی۔

”چھوڑیں مجھے میں آپ کے ساتھ.....“ باقی کا
جملہ مکمل نہ ہو سکا، یکنخت اس نے اس کے مخملی لبوں پر
فصل لگا دیا۔

”ایک بندہ شرمندہ ہے اپنے کیے کی معافی مانگ
رہا ہے تو انصاف کا تقاضہ ہے کہ اسے معاف کر دیا
جائے۔ ہمارے ساتھ کو ابھی ایک ماہ بھی نہیں گزرا ہم
مزاج آشنا ضرور ہو گئے ہیں مگر گزشتہ زندگی کے ہر پل
سے تو باخبر نہیں، بندہ بشر ہوں خطا ہو گئی، مگر حسن کی
عدالت میں معافی کا طلبگار ہوں، معاف نہیں کرو گی؟“
مدھم لہجے نے جادو جگایا اور خوا کی بیٹی موم کی طرح پکھل
گئی۔ اس کے سینے میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو
دی وہ اپنی محبت کو ٹٹل سے پیہم بچھنے لگا۔

”یاد رکھیں انس! اس بار تو سہہ گئی ہوں مگر بہت
محدود میاں جھیل کر آپ کی چھاؤں میں آ کر سکون ملا اور
اگر آپ ہی مجھے دھوپ میں لاکھڑا کریں گے تو میں مر
جاؤں گی آپ کی محبت پر ایمان کی حد تک بھروسہ ہے مگر
اب بے اعتباری تو نہ کریں گے؟“ وہ آنسوؤں سے
لبریز غزالی آنکھیں اٹھا کر بولی۔

”کبھی نہیں جاناں! ٹرسٹی!“ وہ بے خودی سے
اس کے اشک لبوں سے چٹنے لگا، ستارہ کے لبوں پر بھی
طمانیت بھری مسکان کھڑ گئی۔



استقبال کے لئے کھلا ہوا ہے سوالات کی بوچھاڑ سے پہلے تو وہ بوکھلا اٹھا تھا مگر جب زینب نے سب کے سامنے اس کی حرکات گنوائیں تو معیز کی حالت ایسی تھی جیسے الٹا چور کو توال کو ڈانٹنے بڑی ڈھٹائی کے ساتھ وہ سب کو جھٹلاتا اور خود کو معصوم ثابت کرتا رہا تھا۔ یہ طویل بحث و مباحثہ اس وقت خطرناک موڑ پر پہنچنے لگا جب معیز نے غلط قسم کی زبان استعمال کرتے ہوئے زینب پر الزام تراشی کی کوشش کی اس کے بعد زینب کے بھائیوں کو ٹھنڈا کرنا شمس کے لیے ناممکن تھا لہذا انہیں معیز کو وہاں سے فوری طور پر چلے جانے کا کہنا پڑا تھا۔ دوسری وجہ یہ کہ چائیک بگڑتی صورتحال میں زینب کی والدہ کی حالت بگڑتی جا رہی تھی۔ سدرہ تو بس انہیں ہی سارا وقت سنبھالنے کی فکر میں لگی رہی تھیں۔ جس وقت معیز زینب کے بھائیوں سے منہ ماری کرتا بکنا جھکتا دھمکا تا ہوا جا رہا تھا سارہ نے بروقت ایلیٹا کام کیا تھا کہ روتی بکلتی زینب کے ہاتھ سے ایجنٹ رنگ اتار کر معیز کو پکڑا دی تھی جس پر زینب کے بھائی نے کہا تھا کہ رنگ ہاتھ میں دینے کے بجائے اس کے منہ پر مارنی تھی۔

معیز کے جانے کے بعد بھی انہیں کافی وقت زینب کے گھر میں گزارنا پڑا تھا خوشی کے آنسو کیا ہوتے ہیں یہ معیز کے بہتے آنسوؤں نے اسے بتایا تھا۔ ایک طویل عرصہ ذہنی اذیت میں مبتلا رہنے کے بعد آج اس نے سکون کا سانس لیا تھا اور اس کے چہرے کی طمانیت سارہ کے لیے ہر خوشی سے بڑھ کر تھی۔ گھر جس وقت ان کی واپسی ہوئی

ناکھ طارق -
قسط نمبر 21-

سلسلے وار ناول

سافلی شری اور سلیک

واقعی اس نے جو سوچا تھا وہی حالات سامنے آئے تھے۔ شمس کو اس معاملے میں انو لو کرنا اس کی سب سے بڑی عقلمندی تھی جس طرح انہوں نے ساری حقیقت زینب کے گھر والوں کے سامنے رکھی تھی آوہا فیصلہ تو اسی وقت زینب کے حق میں ہو گیا تھا۔ جس وقت معیز کی آمد ہوئی زینب کے تینوں چھوٹے بڑے بھائی شدید اشتعال میں تھے مگر شمس کی وجہ سے فوراً ہی آپے سے باہر نہیں ہوئے تھے۔ معیز کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ کون سا محاذ اس کے



تقریباً بارہ تو بج ہی چکے تھے۔ پہنچ کرنے کے بعد وہ ہشاش بشاشی لاؤنج میں آ بیٹھی تھی تب ہی سدرہ اس کی طرف چلی آئی تھیں۔

”مجھے تم یہ بتاؤ جب زینب کے گھر کے بڑے وہاں موجود تھے تو تمہیں کیا ضرورت تھی انگوٹھی معیز کے ہاتھ پر رکھنے کی؟“ وہ ڈپٹے والے انداز میں پوچھ رہی تھیں۔

”زینب کا رشتہ اسی وقت ختم ہو گیا تھا جب اس نے رورو کر اپنے بھائیوں کے سامنے زبان کھولی تھی جو کام غصے میں سب بھول گئے تھے وہ میں نے انجام دے دیا۔“

”ذرا سانس نہیں آیا تمہیں زینب کی امی پر کس طرح وہ بے چاری تڑپ کر رہی تھیں۔“ سدرہ غصیلے انداز میں بولی تھیں۔

”ساری زندگی کا روگ اپنی بیٹی کو دے کر ہمیشہ تڑپتے رہنے سے بہتر یہی تھا“ آپ کے سامنے ہی وہ اللہ کا کتنا شکر ادا کر رہی تھیں کہ ان کی بیٹی غلط ہاتھوں میں جاتے جاتے بچ گئی۔“

”ہر بات کا جواب زبان کی نوک پر رکھتی ہوں تم۔“ سدرہ اسی غصیلے لہجے میں بولی تھیں دوسری جانب وہ چند لمحے انہیں خاموشی سے دیکھتی رہی مگر پھر ایک جھٹکے سے اٹھ کر سدرہ کے ہی کمرے کی طرف گئی تھی جہاں ٹمس سونے کے لیے لیٹ چکے تھے۔

”آپ کچھ سن رہے ہیں یا نہیں؟ جب سے زینب کی طرف سے آئی ہیں مجھے برا بھلا کہہ جا رہی ہیں۔“ وہ بھڑکنے والے انداز میں شکایت کرتی خاموش ہو گئی تھی جب ٹمس نے آنکھوں سے بازو ہٹا کر اسے دیکھا تھا۔

”تو پھر کیا کروں میں؟“ وہ کوفت سے بولے تھے۔

”سمجھائیں خاموش کروائیں انہیں ورنہ.....“ اس نے بات ادھوری چھوڑی تھی۔

”کیا سمجھاؤں؟ وہ بھی تمہاری ہی بہن ہے میں نے کہہ دیا اور وہ ہو گئی خاموش۔“ وہ ناگواری سے بولے تھے۔

”اب مجھ تک کوئی آواز آئی تو باہر آ کر گردنیں دبا دوں گا“ سونے دو مجھے اور یہ دروازہ بھی بند کرو۔“ جھلائے انداز میں اسے گھر کتے ہوئے دوسری جانب کروٹ بدل گئے تھے جبکہ وہ حیرت سے انہیں دیکھتی دروازے تک گئی تھی اسے بند کیا تھا اور پھر واپس بیڈ کی طرف آئی تھی۔

”میں نے بند کر دیا دروازہ۔“ سارہ کی آواز پر وہ چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوئے تھے اور اگلے ہی پل کرنٹ کھا کر اٹھ بیٹھے تھے۔

”باہر جا کر دروازہ بند کرو بے وقوف لڑکی۔“ ان کی دھاڑ پر وہ ہڑبڑا کر دروازے کی سمت بھاگی تھی جہاں موجود سدرہ مسکراہٹ چھپائے خشکیوں نظروں سے اسے ہی گھور رہی تھیں جو منہ پر ہاتھ رکھے ہنسی روکتی آگے بڑھ گئی تھی۔

برآمدے میں رک کر اس نے دائیں پورشن کے سامنے موجود شیٹ کو دیکھا تھا جو وہاں اپنے کزن سے کوئی بات کر رہا تھا یہ موقع غنیمت جان کر وہ سرعت سے عاطف کی طرف بڑھی تھی جو تنہا نظر آ رہا تھا۔

”مجھے آپ کو ایک خوشخبری سنانی تھی۔“ عاطف کے سامنے کرسی پر بیٹھتی وہ جھلملائے چہرے کے ساتھ چکی تھی۔

”زینب کی انجمن مکمل ختم ہو گئی ہے انگوٹھی واپس کر کے میں نے قصہ ہی پاک کر دیا ہے۔“

”یہ خوشخبری ہے؟“ عاطف نے حیرت سے اسے دیکھا تھا۔

”بالکل..... اور یہ خوشخبری میں بطور خاص آپ کو سنانے آئی ہوں۔“ وہ فوراً بولی تھی۔

”اگر یہ تمہارے لیے خوشخبری ہے تو تمہیں مبارک ہو مگر مجھے اس سے کیا غرض ہو سکتی ہے جو بطور خاص مجھے سنانے آئی ہو؟“ عاطف کے سنجیدہ لہجے پر سارہ نے گہری سانس لے کر اسے دیکھا تھا۔

”عاطف! آپ جانتے ہیں میرے یہاں آنے کا مقصد..... آپ اس سچے بارے میں کچھ سوچنے کی زحمت تو کر سکتے ہیں وہ بہت اچھی ہے کیا آپ کہیں اور.....“ التجائی نظروں سے اسے دیکھتی وہ بالکل ادھوری چھوڑ گئی تھی۔

”سارہ! میں اس بارے میں مذاق میں بھی اب کوئی بات نہیں سنوں گا، بہتر ہے کہ اس موضوع کو ہمیں ختم کر دو۔“

”میں اتنی بڑی بات مذاق میں نہیں کر سکتی، میں ایک اچھے مقصد کو مد نظر رکھ کر اس کے بارے میں آپ کی رائے جاننا چاہ رہی ہوں۔“ عاطف کی بے انتہا سنجیدگی نے اس کے سارے جوش کو ٹھنڈا کر دیا تھا۔

”دیکھو مجھے نہ کوئی رائے قائم کرنی ہے نہ دینی ہے وہ تمہاری دوست ہے میرے لیے ایک اسٹوڈنٹ ہے قابل احترام ہے بس اس سے زیادہ اور کچھ نہیں، وہ یقیناً بہت اچھی ہوگی مگر مجھے اس کی اچھائیوں سے کوئی سروکار نہیں ہے۔“ عاطف نے کہا تھا جبکہ وہ بجھے ہوئے چہرے کے ساتھ اسے دیکھتی رہی تھی۔

”میں جانتا ہوں تمہیں برا لگا ہے مگر میں اس کے علاوہ اور کچھ کہہ بھی نہیں سکتا۔“

”مجھے بھی اس وقت بہت زیادہ برا لگے گا جب آپ خدا خواستہ یہ کہنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ میں انجانے میں اپنی زندگی کی سنگین غلطی کر چکا ہوں۔“ اس کے سپاٹ لہجے پر عاطف نے دنگ نظروں سے اسے دیکھا تھا مگر وہ اپنی بات مکمل کر کے رُکی نہیں تھی تیز قدموں کے ساتھ وہاں سے چلی گئی تھی۔

☆.....

اسٹیرز کی جانب بڑھتے ہوئے یکدم ہی اس کے قدم رکنے لگے مگر اس نے پلٹ کر اسے دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی جو چند لمحوں تک اس کے متوجہ ہونے کی منتظر ہی رہی تھی۔

”اگر کسی تیسرے انسان کی بات کرنی ہے تو میں رکنا ہوں۔“ اس کی جانب ملتے بغیر ہی وہ بولا تھا۔

”اس طرح مجھ سے کتنا نظر چرائے رکھنے سے تم خود کو مضبوط ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہو تو یہ غلط فہمی ہے تمہاری۔ کوئی ہوگا تم جیسا کمزور انسان اس دنیا میں.....“ جیسے لہجے میں بولتی وہ یکدم اس وقت رُکی تھی جب اس نے شیٹ کو جارحانہ انداز میں اپنی طرف آتے دیکھا تھا، گڑبڑا کر دو قدم پیچھے ہوتی دیوار سے جا لگی تھی۔

”اب تمہاری غلط فہمی دور کرنے کے لیے مجھے کس حد تک جانا ہوگا؟“ دائیں جانب دیوار پر ہاتھ جھکائے وہ قدرے اس کے چہرے کی جانب جھکا بھنچی آواز میں پوچھ رہا تھا دوسری جانب اس کے اتنے نزدیک آ جانے پر سارہ کی سانس بس ایک پل کو سانس ہوئی تھی مگر اگلے ہی پل.....

لبوں پر گہری ہوتی مسکراہٹ کے ساتھ وہ مدھم مدھم روشنی میں شیٹ کے چہرے کو بغور دیکھ رہی تھی جو اس کی مسکراہٹ پر کچھ دنگ ہوتا لکھا بھی تھا۔

”ساری زندگی کے لیے تمہاری غلام بن جاؤں گی اگر تم اس حد سے آگے بڑھ جاؤ۔“ اس کی شرٹ کا کالر مٹھی میں جکڑ کر اپنی طرف واپس جھکاتے ہوئے وہ مدھم مگر پُر حدت لہجے میں بولی تھی دوسری جانب وہ اس کے ترشے لبوں پر بھی قاتلانہ مسکراہٹ سے نظر چراتا سرعت سے اسٹیرز کی جانب گیا تھا جبکہ سارہ بمشکل ہنسی روکتی اس کے پیچھے ہی بھاگی تھی۔

”دومنٹ رکو مجھے عاطف کے بارے میں کچھ پوچھنا تھا۔“ سارہ کی آواز پر وہ ناچاہتے ہوئے بھی اس کی طرف متوجہ ہوا تھا جو ریلنگ کے پاس ہی نیچے رکی ہوئی تھی۔

رداؤ انجسٹ 157 جولائی 2012ء

”کیا پوچھنا ہے؟“ وہ تنہ ہوئے چہرے کے ساتھ بولا تھا۔

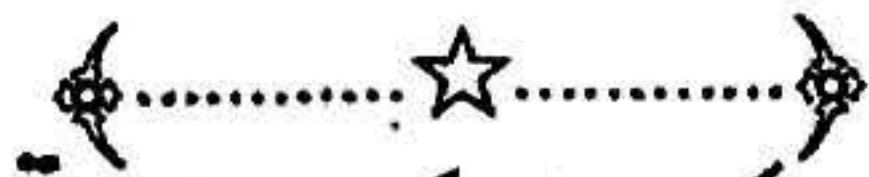
”یہی کہ عاطف اس لیے شادی کے ذکر سے کتراتے ہیں کہ وہ..... وہ بظاہر دیکھنے میں میرا مطلب ہے کہ.....“ وہ کچھ جھجک کر رکتی اسے دیکھ رہی تھی جو سنجیدہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”اسے اپنی کمی کا کوئی کومپلیکس نہیں ہے، اگر وہ ابھی شادی کی ذمہ داری نہیں اٹھانا چاہتا تو یہ اس کی مرضی ہے۔“ وہ بولا تھا۔

”مگر میں بھی کہاں ان سے فوراً شادی کا کہہ رہی ہوں وہ میری بات پر غور تو کر سکتے ہیں۔“ وہ بولی تھی۔

”عاطف تمہاری بات ضرور سنیں گے اگر تم ان سے زینب کے بارے میں بات کرو۔“ سارہ نے کہا تھا۔

”میں کوئی بات نہیں کروں گا جسے کوشش کرنی ہے کرتا رہے۔“ اکھڑ انداز میں بولتا وہ رکنا نہیں تھا دوسری جانب سارہ بھی اطمینان کے ساتھ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی، کیونکہ اسے معلوم تھا کہ شیث اب ضرور عاطف کو کنوینس کرے گا۔



بے تحاشہ ابراؤد آسمان نے کتنے ہی دلوں کو بے چین کر دیا تھا، متوقع ساون نے تر سے دلوں کو مزید ترسانے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ بیدار ہوتے جذبوں کی حدت نے ماحول کی خشکی اور سرد ہواؤں کے جھونکوں سے بے نیاز کر دیا تھا۔ برآمدے میں آتے ہی خوشگوار سی کیفیت اس کے رگ و پے میں سرایت کرتی مسکرانے پر مجبور کر گئی تھی۔

ہر طرف پھیلی رونق کسی پکنک اسپاٹ کا منظر پیش کر رہی تھی۔ دور موجود کار کے کھلے دروازوں سے اسٹیریو سے ابھرتی میوزک کی لہریں ماحول کو اور دلکش بنا رہی تھیں۔ برآمدے کے اسٹپس اتر کر آگے بڑھتے ہوئے اس کی مسکراتی نظریں وسیع گراؤنڈ کی جانب تھیں جہاں گھر کی سب لڑکیاں آپس میں چہلیں کرتیں کھلکھلاہٹیں بکھیر رہی تھیں جبکہ گراؤنڈ کے باہر مرد حضرات پھیلے تھے۔ گاڑیوں کی چھتوں پر گھر کی چھتوں پر اور ٹیرس پر بھی سب بے باقی

سے بارش کے برسنے کا انتظار کر رہے تھے۔ رنگ برنگے سوئٹرز میں ملبوس بھاگتے دوڑتے بچوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے اسے اپنی پشت پر گرم شعاعیں لپکتی محسوس ہوئی تھیں، چلتے چلتے اس نے یکدم ہی گردن موڑ کر دیکھا تھا، نظر سیدھی اس تک گئی تھی جو سیاہ جیکٹ میں ملبوس اپنے کچھ کزنز کے ساتھ موجود تھا۔ سارہ کے اچانک متوجہ ہونے پر وہ سرعت سے نظروں کا زاویہ بدل تو گیا تھا مگر سارہ اس کی چوری پکڑ چکی تھی۔ لبوں میں مسکراہٹ دبائے وہ مٹی کی

سوندھی مہک سانسوں میں اتارنی سرشار ہونے لگی تھی مین گیٹ سے وہ ابھی کچھ ہی فاصلے پر تھی جب اس نے اندر داخل ہوئی زینب کے مسکراتے چہرے کو دیکھا تھا۔

”بروقت آئی ہو تم..... یہ جو بیزار ہو کر بیٹھی ہو زندگی سے کچھ تو نارمل ہوگی۔“ اس کے ہاتھ پکڑنے ہوئے وہ مسکراتی تھی۔

”ساری بلائیں ٹل چکی ہیں آئینے میں خود کو دیکھا تم نے؟ اتنا سکون اور نکھار ایک عرصے بعد تمہارے چہرے پر دیکھ رہی ہوں۔“ اس کے ساتھ آگے بڑھتے سارہ نے اس کے کھلے ہوئے چہرے کو دیکھا تھا۔

”اگر تم میرے پاس نہ ہو تیں تو شاید میں کبھی یہ دن نہ دیکھ پاتی۔“ زینب نے تشکر آمیز نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

”ابھی تو تمہیں آگے مزید ان گنت خوبصورت دن دیکھنے ہیں انشاء اللہ۔“ سارہ کے دعائیہ انداز پر زینب نے نم ہوتی آنکھوں سے اسے دیکھا تھا۔

اپنے نام کی پکار پر وہ رک کر شان کی طرف متوجہ ہوئی تھی جو اپنے دوسرے کزنز کے ساتھ گاڑی کے بونٹ بیٹھا تھا۔

”شاہی سب کے فرمائشی گانے پلے کر رہا ہے، تمہیں کسی کے لیے.....“

”ہرگز نہیں۔“ سارہ نے درمیان میں ہی اسے روکا تھا جبکہ شاہ رخ گاڑی سے باہر نکلا تھا۔

”عاطف بھائی! ایک خاتون نے آپ تینوں حضرات میں سے کسی ایک کے لیے گانا لگانے کی التجا کی ہے۔“ حلق کے بل اس نے مومو کے پورشن میں برآمدے میں موجود عاطف سے کہا تھا۔ سارہ کے ہوش اڑ گئے تھے کیونکہ وہاں عاطف کے علاوہ اس کے بڑے بھائی واصف اور شیث بھی موجود تھے دوسری جانب شاہ رخ فوراً ہی واپس گاڑی میں گھس گیا تھا۔

”گانا پلے ہو رہا ہے آپ تینوں خود ہی اپنے اپنے ایمان سے فیصلہ کر لیجیے گا۔“ واصف نے اشارے سے کچھ پوچھا تھا جو شان نے آواز لگائی تھی۔ زینب کے ساتھ ہونے کی وجہ سے بھی وہ اب مزید تیزی سے آگے بڑھ گئی تھی جبکہ اسٹیریو کی بلند آواز پر اس کا دل چاہا کہ اپنا سر پیٹ لے۔

”نہ بولوں گی نہ بولوں گی

ان کے منائے بنا

نہ مانوں گی.....“

”دوبندے سوچ میں پڑے ہیں مگر واصف بھائی خواخواہ خوش ہو رہے ہیں۔“ شان کی قہقہہ لگاتی آواز پر بمشکل مسکراہٹ روکتے ہوئے اس نے زینب کو دیکھا تھا جو خود بھی مسکراتی نظروں سے سارہ کو دیکھ رہی تھی۔

”کبھی کبھی مجھے سمجھ نہیں آتا میں ان اعلیٰ درجے کے انسانوں میں کس طرح ایڈجسٹ کر گئی ہوں۔“ سارہ نے خشگیں لہجے میں کہا تھا۔

”میں نے بھی محسوس کیا ہے تمہارے اندر کافی بدلاؤ آیا ہے جو کہ بہت اچھا ہے ویسے تو جان لٹا دینے والی ہستی تو تم شروع سے رہی ہو۔“ زینب کے کہنے پر وہ بس مسکراتی تھی۔

”سر میری غیر حاضری کے بارے میں کچھ پوچھ رہے تھے؟“ زینب نے سوال کیا تھا۔

”تمہاری طرح میں بھی غیر حاضر تھی میری ان سے ناراضی چل رہی ہے۔“ سارہ کے فوراً ہی کہنے پر وہ حیران ہوئی تھی۔

”تم ان سے کیوں ناراض ہو؟“

”بس ہوں ناراض۔“ نخوت سے سر جھٹکتی وہ مومو کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔

”جلدی آ جاؤ دونوں، جتنی مشکل سے میں نے چکن پکوڑے بنائے ہیں اس سے زیادہ مشکل ہو رہی ہے انہیں نندیوں سے بچا کر رکھنے میں۔“ قریب آتے ہی وہ غلت میں بولی تھی۔

”آپی بھی تو بتا رہی ہیں پتا نہیں کیا کیا۔“ سارہ نے کہا تھا۔

”ارے وہ کیا، ہر گھر سے کچھ نہ کچھ پلیٹوں میں بھر کر باہر آ رہا ہے، منٹوں میں سب چٹ ہو رہا ہے ان سب بھوکوں کا منہ ہی ہم تکتے رہ جائیں گے۔“ مومو نے بیزاری سے کہا تھا۔

”ہاں یہ تو نظیر آ رہا ہے۔ زینب! تم آپی سے مل کر آ جاؤ ہم یہیں انتظار کرتے ہیں۔“ سارہ کی ہدایت پر زینب سر ہلاتی آگے بڑھ گئی تھی۔

”مومو! سچ بتاؤ، یہ تمہیں عاطف کے لیے پرفیکٹ لگتی ہے یا نہیں؟“ سارہ نے سنجیدگی سے سوال کیا تھا۔

”پرفیکٹ ہونے کے لیے اتنا کافی ہے کہ یہ تمہاری دوست ہے میں تو ویسے بھی پہلے دن سے اس کی ہونق شکل پر

فدا ہوں۔“ مومو بولتے ہوئے ہنسی تھی کیونکہ سارہ نے اسے گھورا تھا۔

”یہ جیکٹ کس کی پہنی ہوئی ہے تم نے؟“ سارہ نے مشکوک نظروں سے اس کی لیدر کی جیکٹ کو دیکھا تھا۔
”کس کی ہو سکتی ہے؟“ مومو بروچڑھائے مسکرائی تھی۔

”تم اتنی غربت زدہ ہو کہ ایک ذاتی سوئزر بھی نہیں ہے۔“ سارہ نے اسے گھرا تھا۔

”کبھی کبھی تو اسے مجھ پر پیارا آتا ہے وہ بھی کسی سے برداشت نہیں ہوتا۔“ مومو کے کچا چبا جانے والے لہجے پر وہ بے ساختہ ہنسی تھی۔

عاطف کی کوئی بات سنتے ہوئے وہ اس کی طرف متوجہ ہوا تھا جو زینب اور مومو کے ساتھ اسی جانب آ رہی تھی۔
اس سرد موسم میں اس نے کوئی شال یا سوئٹر تک لینے کی زحمت نہیں کی تھی اس وقت بھی بس سادہ کاٹن کے لباس میں ملبوس تھی۔

”میرے نکلے شاگردو! کوئی سلام نہ دعا.....“ عاطف نے مسکراتی نظروں سے سارہ کے سنجیدہ چہرے کو دیکھا تھا جبکہ شرمندہ ہوتی زینب نے مدھم آواز میں شیٹ کو بھی سلام کیا تھا جس کا جواب سر کے اشارے سے واپس آیا تھا۔

”میں تو نہیں بھیجنے والی ان سب پر سلامتی جو میری دوست کے دشمن ہیں۔“ مومو نے مسکراتے ہوئے معنی خیز نظر شیٹ پر بھی ڈالی تھی۔

”سارہ! کیا یہ سچ کہہ رہی ہے؟“ عاطف نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

”کیوں بات کر رہے ہیں مجھ سے ناراض ہیں تو ناراض رہیں۔“ نخوت سے بولتی وہ تیزی سے گھر کے اندر جا چکی تھی۔

”مجھے تو یہی نہیں معلوم میں کب ناراض ہوا ہوں اس سے۔“ عاطف نے حیرانگی سے ہنستے ہوئے شیٹ سے کہا تھا۔
”کچھ کرو میرے دوست! ورنہ یہ خاتون مجھے نفسیاتی بتانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑے گی۔“

”تو پھر میں کیا کروں؟ اس کے سامنے جا کر ہاتھ پیر جوڑوں۔“ شیٹ کے ناگوار لہجے پر عاطف حیران نہیں ہوا تھا۔
”تم کچھ نہ کرو بس دل لگا کر مرچیں چباؤ اور اطمینان سے انگاروں پر چل قدمی کرو۔“ عاطف کے خشکی لہجے پر وہ ہر جھٹک کر رہ گیا تھا۔

اپنے کمرے کی جانب بڑھتے ہوئے عاطف نے ان دونوں کو دیکھا تھا جو ہال میں ہی موجود مومو کی واپسی کا انتظار کر رہی تھیں۔ دوسری جانب سارہ نے مکمل اسے نظر انداز کیا تھا۔

”سارہ! ایک پلیٹ میرے کمرے میں پہنچا دو۔“ عاطف نے جان بوجھ کر اسے مخاطب کیا تھا جو چکن پکڑوں پر ہاتھ صاف کر رہی تھی۔

”جب تک آپ میری ناراضی دور نہیں کریں گے مجھ سے اس وقت تک کوئی امید نہ رکھیں۔“ وہ فوراً بولی تھی۔

”کیسے ناراضی دور ہوگی تمہاری؟“ ایک نگاہ زینب کے حیران چہرے پر ڈال کر اس نے سارہ سے کہا تھا۔

”آپ اچھی طرح جانتے ہیں انجان بنے رہنے میں آپ کا کوئی ثانی نہیں ہے۔“ اس کے شکایتی لہجے پر عاطف ایک گہری سانس لیتا کمرے میں چلا گیا تھا۔

”یہ مومو کہاں رہ گئی؟ تم بیٹھو میں دیکھوں چائے بنا رہی ہے یا پائے۔“ زینب سے کہتی وہ بیڑھیوں کی جانب بڑھ گئی تھی۔

دروازے پر دستک دے کر وہ رکی تھی اور پھر اجازت ملنے پر جھجکتے ہوئے اندر داخل ہوئی تھی۔ حیران نظروں سے

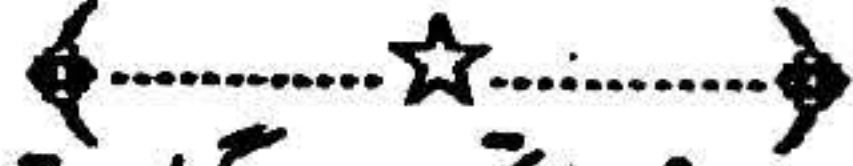
عاطف نے اسے دیکھا تھا جو چکن پکڑوں کی پلیٹ تھامے سامنے آرہی تھی۔

”میں تو دیے ہی سارہ کو تنگ کر رہا تھا آپ یہ میرے لیے کیوں لے آئی ہیں میں تو حد سے زیادہ ان کے ساتھ انصاف کر چکا ہوں۔“ پکڑوں کی سمت اشارہ کرتے ہوئے عاطف نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا تھا۔

”سارہ آپ سے کیوں ناراض ہے؟ وہ مجھے کچھ بتانے پر تیار نہیں۔“ وہ کچھ جھجکتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

”یہ بہتر ہے کہ آپ کو اس نے نہیں بتایا کچھ جاننے کے تجسس میں آپ بھی پریشان نہ ہوں۔“ عاطف نے سنجیدگی سے کہا تھا۔

”اگر میں کہوں مجھے اس کی ناراضی کی وجہ معلوم ہے تو؟“ اس کے مدھم لہجے پر عاطف نے چونک کر اسے دیکھا تھا جوڑ کی نہیں تیزی سے دروازے کی سمت چلی گئی تھی۔ بند دروازے کو دیکھتے ہوئے وہ گہری سوچ میں گم ہونے لگا تھا۔ اس غیر معمولی لڑکی میں کچھ تھا ایسا جو اس کے بارے میں سوچنے سے وہ خود کو روک نہیں پارہا تھا یہ اور بات تھی کہ اس سچ کو قبول کرنے سے وہ نظر بھی چرائے رکھنا چاہتا تھا۔



بیک سیٹ پر وہ زینب کے ساتھ باتوں میں مشغول تھی جب سگنل پر قریب ہی رکتی گاڑی نے اسے متوجہ کیا تھا۔
”عاشر بھائی.....“ وہ بے اختیار ہی پکار گئی تھی جبکہ ڈرائیونگ سیٹ پر موجود شیٹ کے اعصاب تن گئے تھے۔

”آ جاؤ..... میں گھر ہی جا رہا ہوں سب خوش ہو جائیں گے تمہیں اچانک میرے ساتھ دیکھ کر۔“ عاشر نے فوراً ہی کہا تھا۔

”ابھی نہیں آ سکتی میری دوست ساتھ ہے۔“ سارہ نے جواب دیا تھا کہ بیک دیو مرر سے دو چلتی نگاہیں اس پر ہی جمی تھیں۔

زینب کو اس کے گھر ڈراپ کرنے کے بعد بھی اس نے فرنٹ سیٹ پر جانے کی کوشش نہیں کی تھی خود کو لائق رکھتے ہوئے پچھلی سیٹ پر ہی بیٹھی رہی تھی۔

یکدم ہی گاڑی رکنے پر وہ چونک کر اس کی جانب متوجہ ہوئی تھی جو ڈرائیونگ سیٹ سے اتر کر اب سامنے شاپ کی طرف جا رہا تھا۔ وہ یقیناً مومو کے لئے چائیس لینے جا رہا تھا جس کی فرمائش گھر سے نکلتے ہوئے شیٹ سے اس نے کی تھی۔

سڑک پر پھیلی زرد روشنیوں میں وہ ہلکی ہلکی برستی بوندوں کو دیکھ رہی تھی تب ہی اس نے چونک کر اپنی طرف ہی متوجہ اس شخص کو دیکھا تھا جو یقیناً اسی کی جانب آ رہا تھا۔ سارہ کو محسوس ہوا تھا کہ اس شخص کو وہ پہلے بھی دیکھ چکی ہے منٹوں میں اسے یاد آیا تھا کہ اس رات عاطف کو اس نے سگنل پر اس شخص کی طرف متوجہ کیا تھا لہذا وہ پر جھکتے اس شخص کو دیکھ کر وہ زبردست ضرور ہوئی تھی مگر گھبرائی نہیں تھی۔

”جس شخص کے ساتھ تم گھوم رہی ہو اس کی حقیقت اگر جاننا چاہتی ہو تو اس نمبر پر مجھ سے رابطہ کرنا۔“ قریب آتے ہی ایک کارڈ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے وہ بولا تھا سارہ کا چہرہ فٹ ہو گیا تھا۔

”میں اس کے گھر کے ایک ایک بندے کو جانتا ہوں تم سے اس کا کیا تعلق ہے مجھے نہیں معلوم مگر میں چاہتا ہوں کہ تم اس کے نقاب میں چھپے چہرے کو.....“ یکدم ہی اس شخص کی زہراکتی زبان رکنی تھی جب ایک جھٹکے سے کسی نے اسے پیچھے دھکیلا تھا لڑکھڑا کر سنبھلتے ہوئے رضی نے عیسیٰ نظروں سے اس کے سرخ چہرے کو دیکھا تھا۔

”اگر تمہیں اپنی زندگی عزیز ہے تو وقت ضائع کیے بغیر یہاں سے چلے جاؤ ورنہ میں نہیں جانتا کہ میں تمہارا کیا اثر

کروں گا۔“ شدید ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے رضی کے ہاتھ سے کارڈ چھین کر اس کے پرزے کر ڈالے تھے۔
”ایسے نہیں جاؤں گا تمہاری اوقات کی گواہی اسی سڑک پر دے کر جاؤں گا۔“ رضی کے حقارت آمیز لہجے پر وہ
س ایک پل کو رکھتا تھا مگر اگلے ہی پل وہ رضی کا گریبان ہاتھوں میں جکڑ چکا تھا۔
”شیث.....“ دہل کر چیختی وہ گاڑی سے اترتی تھی۔

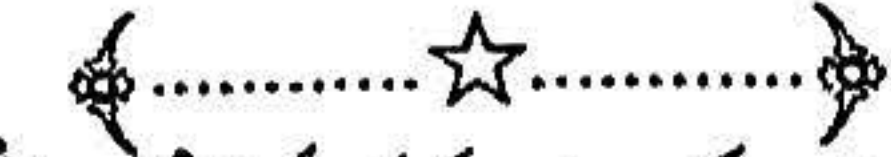
”میری اوقات بتاؤ گے تمہاری اوقات کیا ہے یہ میں بتاؤں تمہیں.....“ رضی کا گریبان جھٹکتے ہوئے وہ ہٹاڑا تھا۔
”شیث! چھوڑ دو اسے سب دیکھ رہے ہیں۔“ کانپتے ہوئے سارہ نے اس کا بازو تھام کر رضی سے دور کرنے کے
لیے زور لگایا تھا۔

”آج تو خاموش ہو جاتا ہوں مگر میری زبان بند نہیں ہوگی۔“ رضی نے غراتے ہوئے دھمکی دینا ہی نیت جانا
تھا کہ ارد گرد لوگ جمع ہونے لگے تھے۔

وہ شعلہ بار نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا جو اب تیز قدموں کے ساتھ اپنی گاڑی کی طرف جا رہا تھا۔ سفید پڑتے
چہرے کے ساتھ سارہ نے اسے اپنی طرف متوجہ ہوتے دیکھا تھا اور اگلے ہی پل لرزتے وجود کے ساتھ وہ سرعت
سے بیک سیٹ پر جا بیٹھی تھی۔

بیک ویو مرر سے وہ اس کی خون آلود آنکھوں کو دیکھ سکتی تھی اس کی ڈرائیونگ سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اس وقت
بھی کتنے اشتعال میں ہے۔

”جو ہوا ہے اس کا ذکر کسی سے مت کرنا۔“ ونڈ اسکرین پر نظر جمائے وہ تنے لہجے میں سارہ کو ہی تاکید کر رہا تھا۔
”وہ..... کون تھا؟“ بمشکل ہی سارہ کے حلق سے آواز نکلتی تھی۔ جواباً شیث کے مدھم مگر شعلہ بار لہجے پر وہ سن ہو گئی
تھی اس نے کبھی شیث کو ایسے جملے ادا کرتے نہیں سنا تھا۔



”دو گھنٹے گزر چکے ہیں مگر اب تک ان دونوں کی واپسی کی کوئی خبر نہیں، شمس کو اگر معلوم ہو گیا تو تمہاری بھی خبر نہیں
ہوگی۔“ سدرہ نے غصیلے انداز میں اسے مزید دہلایا تھا جو پریشان چہرے کے ساتھ ٹہل رہی تھی۔
”آپ مجھے اور ہولا ہولا کر بے دم کر دیں۔“ وہ جھلا کر بولی تھی۔

”تو کیا کروں تمہاری طرح لیفٹ رائٹ شروع کر دوں رات سر پر آ رہی ہے شمس باہر ہیں مگر کسی بھی وقت
واپس آ سکتے ہیں دوبارہ چیچی نے کاشی کو بھیجا ہے مومو کو بلانے کے لیے۔“

”میں نے کہہ تو دیا تھا اس کے بھائی سے کہ وہ میرے ساتھ پریکٹس کر رہی ہے ٹیسٹ کی۔“ وہ مزید جھلائی تھی۔
”آنے دو آج ذرا شاہی کو۔“ سدرہ بڑبڑاتی تھیں تب ہی کال بیل کی آواز پر سارہ لاؤنج سے بھاگی تھی۔

حیرانگی کے ساتھ وہ شان کے پیچھے آئی تھی جو پاگلگوں کی طرح ہنستا صوفے پر نیم دراز ہو گیا تھا۔ ہونٹوں کی طرح
لوٹ پوٹ ہوتے شان کے اشارے پر سدرہ کے ساتھ وہ بھی پلٹی تھی اگلے ہی پل اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا تھا
جب اس نے بگڑے تیوروں کے ساتھ آتے شمس کو اور ان کے پیچھے ہی نمودار ہوتے شاہ رخ اور مومو کے لٹکے چروں
کو دیکھا تھا۔

کمرے کے دروازے پر رک کر شمس ان دونوں کی طرف پلٹے تھے جو لاؤنج میں ہی رک گئے تھے۔

”کمرے میں آؤ دونوں۔“ غصیلی نظروں سے ان دونوں کو دیکھتے ہوئے وہ دھاڑے تھے جس پر پہلے مومو بیل
کر اندر گئی تھی اور اس کے پیچھے ہی شمس کی نظروں سے بچتا شاہ رخ۔

”ہوا کیا ہے؟“ سدرہ نے پوچھنے کی ہمت کر لی تھی۔
”یہ دونوں باہر آ جائیں تو تم اندر آ جانا دے دوں گا سارے بچوں کو۔“ شان کے خواخوڑ لہجے پر سدرہ کا رنگ اڑ
گیا تھا دوسری جانب دھماکے سے دروازہ بند ہو گیا تھا جبکہ شان کی رکی ہوئی ہنسی پھر اسٹارٹ ہو گئی تھی۔

”یہ کہاں مل گئے ان دونوں کو تم ہی کچھ بتا دو؟“ حیران پریشان لہجے میں سارہ نے شان سے پوچھا تھا۔
”اسی ہوٹل میں ڈنر کے دوران بڑے بھائی نے رنگے ہاتھوں پکڑے وہ دونوں کو۔“ سدرہ نے
”تم نے ہی خبر دی ہوگی انہیں شروع سے فتنے بھرے ہیں تمہارے اندر ہی سدرہ نے شان کو لٹاڑا تھا۔
”میں نے کچھ نہیں کیا بڑے بھائی خود اپنے دوستوں کے ساتھ اس ہوٹل میں پہنچ گئے تھے اب یہ اور بات ہے
کہ ڈنر کرنے وہ مومو اور شاہی کی ٹیبل پر ہی جا پہنچے تھے۔“

”تمہیں یہ سب کیسے معلوم؟“ سارہ نے دنگ ہو کر پوچھا تھا۔

”بڑے بھائی کے ساتھ کینڈل لائٹ ڈنر کرتے ہوئے شاہی نے مجھے میج کیا تھا۔“ شان نے بتایا تھا جبکہ وہ بے
ساختہ مسکراتے ہوئے سدرہ کی طرف متوجہ ہوئی تھی جو کمرے کے بند دروازے سے کچھ سننے کی کوشش کر رہی تھیں۔

”آپ پر کوئی پابندی نہیں ہے اندر جاسکتی ہیں۔“ لاؤنج میں آتے شیث نے مسکراتی نظروں سے سدرہ کو دیکھا تھا۔
”تا کہ ان کا سارا غصہ مجھ پر اتر جائے۔“ سدرہ نے خشمگین نظروں سے اسے گھورا تھا۔

”آپ خود اندر چلے جائیں بڑے بھائی کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ جائے گا۔“ شان نے مسکراتے ہوئے شیث
کو مشورہ دیا تھا۔

”میں اندر چلا گیا تو بہت جوتے بڑیں گے شاہی کو۔“ صوفے پر بیٹھتے ہوئے اس نے ایک سرسری نگاہ سارہ پر
ڈالی تھی جو بند دروازے پر نظر جمائے گم ضم بیٹھی تھی۔

”پتا نہیں وہ کتنی ڈانٹ ڈپٹ کر رہے ہوں گے مومو نے رونا شروع کیا تو گھر بھر میں خبر ہو جائے گی دونوں نے
کیا گل کھلایا ہے۔“ سدرہ پریشان ہوئی تھیں۔

”ایک تو آپ کے گھر کی زمین ہی بڑی زرخیز ہے ذرا سی بات پر گل کھل جاتے ہیں۔“ سارہ کلس کر بولی تھی۔
”یہ ذرا سی بات ہے؟“ سدرہ نے اسے گھر کا تھا۔

”آپ کیوں پریشان ہو رہی ہیں جن کی مدد سے وہ دونوں گھر سے نکلے تھے انہیں فکر مند نہ ہونے دیں۔“ شیث
کے بے نیاز لہجے پر سارہ ہل کھا کر رہ گئی تھی۔

”سارہ! اپنے سیل فون کا کیمرہ آن کر لو یادگار مناظر محفوظ کرنے کے لیے۔“ شان ہدایت دیتا استقبال کے لیے
اٹھ گیا تھا۔

سب سے پہلے مومو منہ سجائے باہر نکلی تھی جبکہ اس کے پیچھے ہی باہر آتے شاہ رخ نے کیمرے سے بچتے ہوئے
اس طرح چہرہ ہاتھ سے چھپانے کی کوشش کی تھی جیسے باہر پورا میڈیا استقبال کے لیے کھڑا ہے۔

”آپ اپنی ناکام ڈیٹ کے بارے میں کچھ کہنا پسند کریں گے؟“ شان نے اپنے ہاتھ کا مائیک اس کے سامنے کیا تھا۔
”تم نے سوال نہیں کیا میرے بھائی! زخموں پر نمک چھڑکا ہے تو جانتا ہے اس ڈیٹ نے مجھے شرم سے پانی پانی
کر دیا ہے مگر میں کہنا چاہتا ہوں میرے عزیز ہم وطن میرے دلارو بھی خاندان کی لڑکی کو ڈیٹ پر مت لے جانا
تالیاں.....“ شاہ رخ کی تقریر پر سارہ نے اپنا سر پکڑ لیا تھا۔

”کس جلوس سے خطاب کر رہے ہو گردن توڑ اس کی بڑے سوال کر رہا ہے بتاؤں تیرے کارنامے۔ روز رات کو
رداؤ انجسٹ 163 جولائی 2012ء

”I wish you become a top brand ambassador“۔ اس عورت کی نظریں شیٹ کے چہرے سے ہٹنے کو تیار نہیں تھیں۔

”It's your wish or innocent punish for me?“۔ شیٹ کے مسکراتے سوالیہ لہجے پر اس عورت کی بے ساختہ رس گھولتی ہنسی بلند ہوئی تھی۔ بیزاری کے ساتھ شان دوسری طرف متوجہ رہا تھا مگر کان ان دونوں کی گفتگو پر ہی لگے تھے۔

کچھ چونک کر وہ شیٹ کی طرف متوجہ ہوا تھا جو اس عورت کی فرمائش پر ایکسکیز لیتا اس کے ہمراہ وہاں سے جا رہا تھا۔ ناگواری کے ساتھ شان تعاقب میں جانے سے خود کو روک نہیں سکا تھا جس جگہ وہ دونوں جا کر رُکے تھے وہ بالکل رونق سے الگ تھلگ حصہ تھا۔ بڑھتے بحس کے ساتھ شان سرعت سے اس خالی ٹیبل کے گرد جا بیٹھا تھا جو ان دونوں سے کچھ فاصلے پر موجود تھی۔ عورت کی پشت شان کی طرف تھی مگر شیٹ بخوبی شان کو دیکھ سکتا تھا۔ وہ عورت بہت بے تکلفی سے اپنی جس خواہش کا اظہار کر رہی تھی اسے سنتے سمجھتے ہوئے شان کے چودہ طبق روشن ہونے لگے تھے۔ دنگ نظروں سے وہ شیٹ کے پرسکون چہرے کو دیکھ رہا تھا جو بہت نرمی اور سلیقے سے اس عورت کی پیش کی گئی آفر پر انکار کر گیا تھا جسے بخوشی عورت نے قبول کیا تھا۔

وہ عورت اب سرسری دوستانہ انداز میں بولتی شیٹ کے ساتھ وہاں سے جا رہی تھی اس عورت کی نظر بچا کر شیٹ نے اسے پیچھے آنے کا اشارہ کیا تھا جو ٹیبل کے گرد ہی بیٹھا اسے گھور رہا تھا۔



وڈ اسکرین سے نظر ہٹا کر اس نے ایک بار پھر شان کو دیکھا تھا جو بہت خاموشی کے ساتھ اپنا سیل فون چیک کرنے میں مگن تھا۔

”مجھے معلوم ہے کہ تم وہاں بور ہوئے ہو گے مگر یہ تمہاری خواہش تھی وہاں میرے ساتھ جانے کی“۔ شیٹ نے کہا تھا۔

”وہاں سب کیسا لگا تمہیں؟“ اس کی مستقل خاموشی پر شیٹ نے سوال کیا تھا۔

”Hell“۔ شان اتنا ہی بولا تھا۔

”وہاں سب لوگ کیسے لگے؟“

”Fake“۔ جواب آیا تھا۔

”وہاں جو فی میل ماڈلز تھیں ان کے بارے میں کیا رائے ہے؟“ شیٹ نے کچھ دلچسپی کے ساتھ مزید پوچھا تھا۔

”Artificial things“۔ سیل فون پر ہی نظر جمائے شان بولا تھا۔

”اور میرے بارے میں کیا کہو گے؟“ شیٹ نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا تھا۔

”میں چاہتا ہوں اس سوال کا جواب آپ خود دیں“۔ شان نے سنجیدگی سے اسے دیکھا تھا۔

”Faithful“۔ اس نے شان کی طرف دیکھتے ہوئے تائید چاہی تھی۔

”کس کے ساتھ وفادار ہیں آپ؟“ شان کے سوال نے اسے حیران کیا تھا۔

”اپنے رب کے بعد ہر اس انسان کے ساتھ جو مجھ سے تعلق رکھتا ہے یہاں تک کہ اپنی ویلیوز اور اپنے ضمیر کے ساتھ بھی.....“

(جاری ہے)



باہر بایک کوریس دیتا ہے اور مرزا صاحب کی دلآری دوڑی چلی آتی ہے کھڑکی میں۔ ”مومن نے تملاکر شان کو گھورا تھا۔“

”دیکھو ذرا اب بھی شرمندہ نہیں ہے خبردار جو میرے شریف دیوروں پر الزام لگایا۔“ سدرہ نے اسے گھر کا تھا۔

”ارے کیوں شرمندہ ہو جاؤں گن پوائنٹ پر کیا میں نے لوٹ لیا ہے تمہارے شریف دیور کو آپ کتنی شرمندہ ہوئی تھیں جب میرے بھائی نے پکڑا تھا آپ کو ساحل سمندر پر گھوم رہی تھیں اپنے میاں کے ساتھ۔“ مومو کا میٹر فل گھوما ہوا تھا۔

”ڈنکے کی چوٹ پر وہاں جاؤں گی جہاں میرے شوہر لے جائیں گے اور تمہارے بھائی نے نہیں ہم نے اسے پکڑا تھا اس ڈائن کے ساتھ خبردار جو میرے سامنے زبان چلائی۔“ سدرہ تملاعی گئی تھیں۔

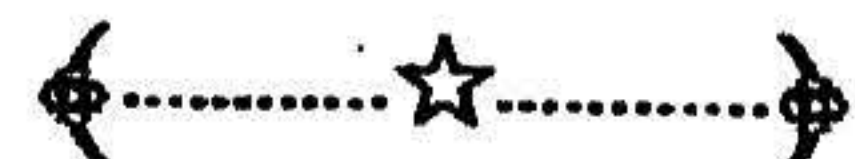
”بھابی! آپ میرے بھائی کے ساتھ ساحل سمندر پر گھوم رہی تھیں کیا منہ دکھاؤں گا میں دنیا کو۔“ شاہ رخ جذباتی ہوا تھا۔

”یہ سوال تمہیں اس وقت بھی اپنے لئے سوچنا چاہیے۔“ شیٹ نے خشکی نظروں سے پہلے شاہ رخ اور پھر مومو کو دیکھا تھا۔

”مومنہ! یہ تو بتا دو تمہارا کینڈل لائٹ ڈنکسار ہا؟“ اس نے جلی بھی مومو کو چھیڑا تھا۔

”چپ چاپ بیٹھے رہو چھوٹے بھائی! خواہ تپانے والی باتیں مت کیا کرو تم۔“ وہ مزید تنک اٹھی تھی ان سب کے ہنسنے پر۔

”بیٹا! تو باہر نکل تیری ہڈیاں ہی توڑوں گی۔“ وہ بھنا کر شاہ رخ پر چیختی تھی مگر اگلے ہی پل شمس کی ابھرتی دھاڑ پر گڑبڑا کر باہر بھاگ گئی تھی۔



آج شہر کے اس مصروف ہوٹل میں کمپنی کے نیو برانڈ پروڈکٹ کا Launch تھا کمپنی کی مکمل آرگنائزیشن کے علاوہ بھی جو کراؤ وہاں جمع تھا ان سب کے درمیان شان خود کو بہت uncomfortable محسوس کر رہا تھا کہ اس قسم کے ایونٹ میں شرکت کا پہلا اتفاق تھا مگر شیٹ اسے بالکل نارمل اور پُر اعتماد دکھائی دے رہا تھا۔ شان کے لیے یہ حیران کن تھا کہ وہ کس طرح اس بے باک اور گیسر سے بھرپور ماحول میں کس اپ ہو چکا ہے۔

بہت پروفیشنل انداز میں شیٹ نے پروڈکٹ کے حوالے سے audience کو انفارمیشن بلکی سی اسپیج کی شکل میں جنم پہنچائی تھی اور اس کے بعد وہاں موجود پرنٹ میڈیا کی ایک بڑی تعداد کو فوٹو سیشن دیا تھا اسی دوران شان نے بھی اپنے گیسرے میں اس کی کئی تصاویر قید کی تھیں۔

ہوٹل میں بہت اعلیٰ قسم کے ریفر۔ شمنٹ کا اہتمام کیا گیا تھا مگر شان بس اب یہاں سے نکل کر آزادی کا سانس لینا چاہتا تھا اس لیے شیٹ کے فارغ ہونے کا انتظار کر رہا تھا جو پتا نہیں کون کون سی شخصیات سے محو گفتگو ہوتا رہا تھا۔

اس وقت وہ شیٹ کے ہمراہ ہی کمپنی کے منیجر کے ساتھ موجود تھا جب اسی کمپنی کے ایم ڈی حسن حیات ایک لیڈی کے ہمراہ آ گئے تھے۔ حیرت کا جھٹکا شان کو لگا تھا جب اس عورت نے والہانہ انداز میں اپنا سفید نازک ہاتھ شیٹ کے ہاتھ میں دے دیا تھا ایم ڈی کو تعارف کروانے کی ضرورت نہیں پڑی تھی وہ عورت خود ہی شروع ہو گئی تھی۔ کسی مشہور کمپنی کی وہ پروفیشنل ماڈل تھی بلاشبہ اس کا حسین چہرہ کسی بھی پروڈکٹ کو چار چاند لگانے والا تھا مگر یہاں موجود دیگر خواتین کی طرح اس کے پاس بھی لباس کی بہت قلت تھی۔ کوفت زدہ نظروں سے وہ شیٹ کو دیکھ رہا تھا جو بہت توجہ سے اس عورت کی بات سن رہا تھا۔

فوزیہ خان

افسانہ

سچے گھر

وہ جیسے ہی گھر میں داخل ہوا تھا میوزک کی تیز آواز نے اس کے تھے ہوئے اعصاب کو اور سخت کر دیا تھا۔
”خان بابا..... خان بابا“۔ اذلان شاہ نے تقریباً چلاتے ہوئے کہا تھا۔ اس کے چلانے پر خان بابا دوڑتا ہوا آیا۔

”جی صاحب!“ خان بابا نے اذلان شاہ کے سخت تیور دیکھتے ہوئے ڈرتے ہوئے پوچھا۔

”خان بابا! یہ گھر میں کیا بھونچال آیا ہوا ہے کس نے اتنی تیز آواز میں میوزک چلایا ہوا ہے.....؟“ اذلان شاہ نے غصے سے پوچھا۔

”وہ صاحب! وفابی بی کی کچھ دوستیں آئی ہوئی ہیں تو انہوں نے.....“

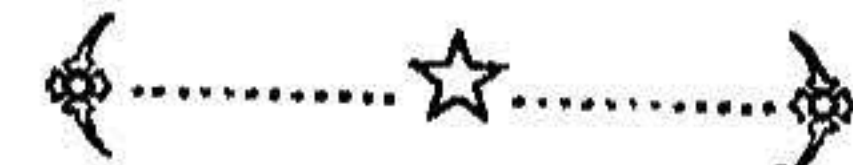
”آپ! وفا کو میرے کمرے میں بھیجیں“۔ اس نے غصے سے کہا اور میز کو ٹھوکرنازتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ دروازے پر دستک ہوئی۔

”آجاذ“۔ وہ جانتا تھا وفا ہی ہوگی۔ وفا نے اندر قدم رکھتے ہی ڈرتے ہوئے اذلان شاہ کی طرف دیکھا جس کے چہرے کے تاثرات سے اس کے غصے کا پتہ چل رہا تھا۔

”وفا! دن بدن تم سدھرنے کی بجائے اور بگڑتی جا رہی ہو امی اور چھوٹی امی نے تمہیں سر پر چڑھا رکھا ہے اور یہ کونسا طریقہ ہے میوزک سننے کا کہ پورا گھر ہی ڈسٹرب ہو جائے شرم آئی چاہئے تمہیں..... اور اپنی

ان فضول دوستوں کو کالج تک ہی محدود رکھا کرو“۔ اذلان شاہ نے غصے سے کہتے ہوئے اس کے چہرے کی طرف دیکھا جو اپنی اتنی تعریف پر دھواں دھواں ہو رہا تھا۔

”اب جاؤ تم“۔ اذلان شاہ نے کہا تو وہ جیسے پہلے ہی جانے کو تیار تھی ایک سیکنڈ کی دیر کے بغیر کمرے سے باہر چلی گئی۔



”کہاں گئی تھیں تم.....؟“ ثناء نے پوچھا تھا۔
”جانا کہاں ہے اس نے یقیناً اپنے اس ہینڈسم کزن سے انسٹ کروا کر آ رہی ہوگی“۔ آنسہ کا یہی کہنا تھا کہ وفا نے دھواں دھار روٹا شروع کر دیا تھا۔

”ارے وفا! میں تو مذاق کر رہی تھی تم تو رونا ہی شروع ہو گئی کیا ہوا ہے بتاؤ.....؟“ آنسہ نے کہا۔
”ہونا کیا ہے ہر وقت وہی انسٹ! ابھی بھی میوزک کی آواز تیز ہونے کی وجہ سے اتنی باتیں سنائی ہیں“۔ وفا نے روتے ہوئے بات مکمل کی۔

”اوہو..... اتنی سی بات پر تم رونے بیٹھ گئیں اور دعوے تمہارے بہت بڑے ہیں کہ میں اذلان شاہ کو تبدیل کر کے رکھ دوں گی اذلان بھائی سے محبت بھی کرتی ہو اور بات بھی برداشت نہیں کر سکتیں جن سے محبت کی جاتی ہے ان کی ہر بات برداشت کی جاتی ہے“۔ ثناء جو کہ اس کی بچپن کی دوست تھی اسے محبت پر لیکچر دے رہی تھی

اور وقاسر جھکائے ان کے لیکچرسن رہی تھی۔

”وفا بیٹا! جاؤ اذلان کو بلا کر لاؤ“۔ شاملہ بیگم نے کہا۔

وقائے دروازے پر دستک دی۔

”آ جاؤ۔“ اذلان کی آواز آئی، وفانے اندر داخل ہو کر ادھر ادھر نظر دوڑائی تو اذلان سامنے بیڈ پر لیٹا ہوا تھا۔

”اذلان! آپ کو بڑی امی بلارہی ہیں۔“

”میرے سر میں درد ہے، میں کچھ دیر بعد آتا ہوں۔“
 اذلان نے کہا۔

”میں سر دباؤں آپ کا.....؟“ وفانے جھجکتے ہوئے پوچھا اور کوئی وقت ہوتا تو یقیناً اذلان منع کر دیتا، لیکن شدید درد ہونے کی وجہ سے اثبات میں سر ہلا دیا، وفا ایک سائیڈ پر ہو کر بیٹھ گئی اور سر دبانے لگی۔

”وفا! زور سے دباؤ“۔ اذلان نے اس کے ہاتھوں پر دباؤ دیتے ہوئے کہا، وفا کے اندر ایک لہری زور گئی، اذلان کے بس سے۔ وفا اذلان کا سر دباتی رہی اور جب وہ پرسکون ہو کر نیند کی وادی میں چلا گیا تو اسے دیکھنے لگی۔

”کاش تم ایسے ہی تمام عمر میرا ہاتھ تھامے رکھو اور میں ایسے ہی تمہیں دیکھتی رہوں۔“ وفانے سوچا اور باہر نکل گئی۔

زادہ شاہ اور عمران شاہ دو بھائی تھے دونوں کے رشتے اپنی ماموں زاد کزنوں سے ملے تھے۔ جب دونوں کی اکٹھی شادیاں ہوئیں تو زادہ شاہ کا بیٹا پیدا ہوا جس کا نام انہوں نے اذلان شاہ رکھا اور اس سے چھوٹی بیٹی پیدا ہوئی جس کا نام انہوں نے دعا رکھا۔ عمران شاہ کے دو بچے تھے سب سے بڑا اذہان شاہ اور اس سے چھوٹی وفا شاہ تھی دونوں گھروں میں مثالی محبت تھی اذلان شاہ اور اذہان شاہ دونوں ایم بی اے کر کے اپنا بزنس سنبھال رہے تھے جبکہ دعا اور وفا بی ایس سی کے فاسٹ ایئر میں تھیں۔

وفا جب سیکنڈ ایئر میں تھی تو پتہ نہیں کیوں اسے اپنا یہ مغرور سا کزن اچھا لگنے لگا تھا۔ آج سے دو سال پہلے جب اذلان کی یونیورسٹی میں فنکشن تھا، اس نے بلیک تھری پیس پہنا تھا اور وفا کے دل نے اس دن اذلان کو دیکھتے ہی ایک بیٹ مس کی تھی اور اس دن کے بعد وفا اکثر ہی اذلان شاہ کو سوچنے لگی تھی یہ سوچنا کب محبت میں بدلا اسے خود پتہ نہیں چلا، دعا، آنسہ اور ثناء کو اس نے بتایا تو تینوں نے خوب اس کے ریکارڈ لگائے اور کہا کہ تمہیں اذلان شاہ سے محبت ہوگئی ہے۔

”بڑی امی! آج مٹن کے ساتھ بریانی بنا لیتے ہیں
 اذلان کو بہت پسند ہے۔“ وفانے کہا تو پاس کھڑی دعا پیے
 وجہ کھانسنے لگی، وفانے گھور کر دعا کی طرف دیکھا، جو شرابی
 نظروں سے وفا کو دیکھ رہی تھی۔

”ہاں ہاں کیوں نہیں بیٹا! بنالو بریانی“۔ شائلہ بیگم نے کہا۔

”میں خود بناؤں گی اپنے ہاتھوں سے“۔ وفانے چمکتے ہوئے کہا۔

”ہاں تم خود بنانا میں ذرا عائشہ کو دیکھوں کیا کر رہی ہے کچن میں۔“ شاملہ بیگم کہتے ہوئے اندر چلی گئیں۔

”اوہو..... بڑا خیال رکھا جا رہا ہے ہمارے بھائی کا۔“ دعا نے اسے چھیڑا۔

”ہمیں تو کبھی پانی تک نہیں پوچھا اور بھائی کے لئے
برائی بننا ہی ہو۔“ دعا نے شرارت سے کہا۔
”منہ دھور کھو تمہیں کیوں پانی پوچھوں، تم کوئی اذلان
تھوڑی ہو۔“ وفانے شوخی سے کہا۔

”وہ بھیہا.....“ وفا نے بے چارگی سے دعا کر
طرف۔

”در اصل یہ کہہ رہی تھی کہ میں ازلان بھائی کی طرح سنجیدہ تھوڑی ہوں۔“ دعا نے کہا تو وفا کی جارا

1

رواڈ انجسٹ 168 جولائی 2012ء

میں جان آئی۔

کھانا لگ چکا تھا اور سب ڈائننگ میبل کے ارد گرد بیٹھے تھے، وفا اپنی بریانی کی تعریف سننے کو بے تاب تھی۔

”چھوٹی امی! بریانی کس نے بنائی.....؟“ ازلان نے پوچھا۔

”وقا نے بتائی ہے۔“ عائشہ بیگم نے جواب دیا۔
 ”ارے واہ ہماری بیٹی تو بڑی اچھی کوکنگ کر لیتی
 ہے۔“ زابد شاہ نے کہا تو اذلان نے وقا کو ایسے دیکھا جیسے
 یقین نہ آ رہا ہو۔

☆

”امی! مجھے دیر ہو رہی ہے ڈرائیور چھٹی پر ہے اور دعا کی بچی نے بھی چھٹی کر لی ہے۔“ وفانے روئی شکل بنا کر کہا۔

”اذلان آفس جار ہا ہے تمہیں کالج چھوڑنا جائے گا“
 اس اس سے کہہ دیتی ہوں۔“ عائشہ بیگم نے کہا تو وفا کی تو
 میرے دل کی مراد برآئی تھی۔

”جی اچھا امی.....“ وفا سعادت مندی سے کہا۔
ہارن کی آواز آرہی تھی، وفا نے جلدی سے کتابیں
میٹیں اور باہر کی طرف دوڑ لگا دی، فرنٹ ڈور کھلا ہوا تھا
وفا جلدی سے بیٹھ گئی۔ اذلاب شاہ نے گاڑی اشارٹ
لر دی۔

”دعا نہیں جا رہی تھی تو شہیں کون سی مصیبت آن
ی تھی، پہلے کون سا تم نے ٹاپ کر لیا ہے جواب کرنا
ہے۔“ اذلان نے کہا تو وفا کی آنکھوں میں آنسو
گئے تھے، وفانے اذلان شاہ کی طرف دیکھا، اذلان
نے بھی وفا کی طرف دیکھا اور پھر پتا نہیں کیوں اس
فا لے آنسو دیکھ کر اسے کچھ ہوا تھا، تبھی کالج آ گیا تھا، وفا
گئی تو اذلان نے بھی سر جھٹک کر گاڑی اشارٹ
رو دی تھی۔

مس آصفہ آج آئی نہیں تھی اور ان کا پیر یڈ فری تھا،

وہ تینوں کالج کے پچھلے گراؤنڈ میں آگئی تھیں۔
 ”کس کے ساتھ آئی ہو تم.....؟ دعا تو آج آئی
 نہیں۔“ آنسہ نے پوچھا۔

”اذلان شاہ کے ساتھ“۔ وفانے جواب دیا۔
 ”اوہو.....“ ثناء نے شرارت سے کہا۔

”جی نہیں دے مانے آتا نہیں تھا تو اسی نے کہا اذلان
شاہ کے ساتھ چلی جاؤ۔“۔ وفانے کہا۔

”ہم نے کچھ کہا تم سے“۔ ثناء نے کہا تو وفا کا چہرہ
سرخ ہو گیا۔

”بھاڑ میں جاؤ تم لوگ“۔ وفانے اٹھتے ہوئے کہا۔
اس کا ہاتھ پکڑ کر بیٹھالیا۔

”یار کیا ہو گیا مذاق کر رہے تھے ہم لوگ“۔ ثناء نے کہا۔

”ثناء! میں پہلے ہی بہت ڈسٹرب ہوں۔“
 ”وفا! ہمیں یقین ہے اگر تمہاری محبت سچی ہے تو

ذالان بھائی کو بھی تم جیت لوگی۔“ آنسہ نے کہا تو وفا
خاموش ہو گئی۔

☆

”وفا! میرے خیال میں تمہیں بھائی کو بتانا چاہئے کہ تم ان سے کتنی محبت کرتی ہو“۔ دعا نے کہا تو وفا نے حیرت سے دعا کو دیکھا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا میں خود ان سے جا کر بولوں
 کے مجھے آپ سے محبت ہے اور وہ سب گھر والوں کے
 سامنے مجھے بے عزت کر دیں۔“ وفانے غصے سے کہا۔
 ”وقا! پوری بات تو سن لیا کرو شروع پہلے ہی ہو جاتی
 ہے۔“ وفانے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

”میں یہ کہہ رہی ہوں کہ تم انہیں اپنی باتوں اپنی
 رکتوں سے احساس دلوادو۔“ دعا نے اسے بڑی اماں کی
 روح سمجھاتے ہوئے کہا۔

”لیکن کیسے.....؟“ وفانے پوچھا۔
 ”جیسے ابھی تم بھائی کے لئے جائے بنا کر لے جاؤ گی

روہ تمہیں بلک سوٹ میں دکھ کر مہیوت رو جائیں

رداؤ انجسٹ 169 جولائی 2012ء

گئے۔ دعا نے کہا تو وفا اسے گھور کر رہ گئی مگر اسے اس کا آئیڈیا اچھا لگا تھا بھی فوراً عمل کرنے چل دی۔

☆.....☆.....☆.....

دروازے پر دستک ہوئی تھی اذلان شاہ نے پس کہا تو وفا ہاتھ میں چائے پکڑے اندر داخل ہوئی اذلان کمپیوٹر پر کچھ کام کر رہا تھا۔

”اذلان! یہ چائے۔“ وفا نے معصومیت سے کہا۔
”مگر میں نے تو نہیں مانگی۔“ اذلان شاہ نے اسی کے انداز میں کہا تو وفا مشکل میں گھر گئی۔

”اوہو..... اچھا یقیناً کسی دوست کے گھر جانا ہوگا“ اسی لئے چائے دے رہی ہو لیکن میں ہرگز اجازت نہیں دوں گا، لاسٹ سیمسٹر ہے پڑھائی پر توجہ دو تم دونوں اور ہاں جاتے ہوئے دروازہ بند کر کے جانا۔“ اذلان نے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے اسے کہا تو وفا رونی شکل بنا کر باہر آ گئی۔

”وفا! کیا کہا بھائی نے.....؟“ دعا نے جلدی سے پوچھا اور وفا نے ساری بات بتادی جسے سن کر دعا نے ہنسنا شروع کر دیا۔

”بھائو! میں جاؤں دو تم دونوں بہن بھائی۔“ وفا نے کہا اور پاؤں بٹختی ہوئی اٹھ گئی اور دعا پیچھے سے اسے آوازیں لگاتی رہ گئی۔

☆.....☆.....☆.....

”افضل بھائی کے بیٹے کی مہندی ہے آج اور سب کو جانا ہے۔“ شائلہ بیگم نے کہا۔

”بڑی امی! مجھے نہیں جانا ہے۔“ وفا نے کہا۔
”اور اگر وفا نہیں جائے گی تو میں بھی نہیں جاؤں گی۔“ دعا نے کہا۔

”بیٹا! تمہارے ابو کے ساتھ بچپن کی دوستی ہے ان کی جانا تو پڑے گا۔“ عائشہ بیگم نے حتی لہجے میں کہا۔
”امی! دعا کو لے جائیں۔“ وفا نے کہا تو دعا نے گھور کر وفا کو دیکھا اور وفا نے لاپرواہی سے منہ دوسری طرف موڑ لیا۔

”چلو اٹھو دعا! تیار ہو جاؤ۔“ عائشہ بیگم نے کہا تو دعا کو مجبوراً چھوٹی امی کی بات ماننی پڑی اور وہ اٹھ کر تیار ہونے چلی گئی۔

”وفا! اذلان آئے تو اسے کھانا دے دینا۔“ شائلہ بیگم نے کہا تو وفا نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

☆.....☆.....☆.....

سب کو گئے ہوئے تقریباً گھنٹہ ہو گیا تھا اور وفا دی دیکھنے میں منہمک تھی تبھی ڈور بیل بجی تھی وفا نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ سامنے اذلان تھا وفا سائیڈ پر ہو گئی۔

”آپ فریش ہو جائیں میں کھانا لگاتی ہوں۔“ وفا نے کہا اور جیسے ہی نظر اذلان کے بازو پر پڑی تو بے ساختہ اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

”یہ کیا ہوا ہے.....؟“ وفا نے اذلان کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا جہاں سے خون بہہ رہا تھا اذلان کے جواب دینے سے پہلے ہی اس نے اپنا دوپٹہ پھاڑا اور اذلان کا ہاتھ پکڑ کر پٹی کرنے لگی وفا نے اذلان کے چہرے کی طرف دیکھا جہاں درد کے آثار نمایاں تھے وفا نے ایک بار پھر رونا شروع کر دیا اور اذلان شاہ جو ساکت سا وفا کو اپنے لئے روتے ہوئے دیکھ رہا تھا بولا۔

”وفا! معمولی سی چوٹ ہے۔“
”یہ معمولی سی چوٹ ہے آپ کم از کم اپنے لئے نہیں تو میرے لئے اپنا خیال رکھ لیا کریں آپ کو کچھ ہونے سے پہلے ہی میں تو مر جاؤں گی۔“ وفا کے جو منہ میں آیا بول دیا اذلان ساکت بیٹھاسا رہا تھا اذلان نے وفا کے آنسوؤں سے تر چہرے کو دیکھا یہ کیسا اقرار تھا یہ کیسی محبت تھی جو اس کی معمولی سی چوٹ پر تڑپ اٹھی اذلان کا دل وفا کے آنسوؤں کے ساتھ قطرہ قطرہ پگھل رہا تھا اس نے ہاتھ بڑھا کر وفا کے آنسو صاف کئے تھے۔

”وفا! تم.....“ اذلان بس اتنا ہی بول سکا تھا۔
”ہاں نہیں دیکھ سکتی میں آپ کو تکلیف میں نہیں برداشت ہوتا مجھ سے آپ کو اس حالت میں دیکھ کر۔“ وفا

کہتے ہوئے باہر بھاگ گئی۔

☆.....☆.....☆.....

اس کے لئے آنسو بہاتی ہوئی وفا اسے دل کے بہت قریب محسوس ہوئی تھی لیکن شاید اس کی محبت تو پہلے ہی دل کے کونے میں چھپی ہوئی تھی وہ جو اسے بلاوجہ ڈانٹتا تھا اور پھر آنکھوں میں آنسو بھی نہیں دیکھ سکتا تھا اور نظریں چرا جاتا تھا۔

”اوہ مائی گاڈ! وفا مجھ سے اتنی محبت کرتی تھی اور مجھے پتہ ہی نہیں چلا وفا میں بھی تم سے محبت کرنے لگا ہوں لیکن مجھے اس دن کا انتظار ہے جب میں مکمل تمہارے رنگ میں رنگ جاؤں گا تو پھر اظہار کروں گا مائی لو۔“ اذلان نے سوچتے ہوئے آنکھیں موند لیں تھیں۔

☆.....☆.....☆.....

”اوہ مائی گاڈ! وفا مجھ سے اتنی محبت کرتی تھی اور مجھے پتہ ہی نہیں چلا وفا میں بھی تم سے محبت کرنے لگا ہوں لیکن مجھے اس دن کا انتظار ہے جب میں مکمل تمہارے رنگ میں رنگ جاؤں گا تو پھر اظہار کروں گا مائی لو۔“ اذلان نے سوچتے ہوئے آنکھیں موند لیں تھیں۔

☆.....☆.....☆.....

”اذلان! یہ چوٹ کیسے لگی تمہیں.....؟“ شام کی چائے پر سب اکٹھے تھے تو عمران شاہ نے پوچھا۔
”کچھ نہیں چھوٹے ابو! معمولی سا ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔“

”اذلان! تم اپنا خیال نہیں رکھ سکتے ہو۔“ اذلان نے کہا۔
”اب رکھوں گا تم لوگوں کے لئے۔“ اذلان نے یہ جملہ دانستہ طور پر وفا کو سنانے کے لئے اس کی طرف دیکھ کر کہا تھا جو چائے لے کر آئی تھی اور اذلان کی بات پر جھل ہو کر اندر چلی گئی تھی۔ اذلان اسے جاتا دیکھ کر ہنستے ہوئے پھر باتوں میں مصروف ہو گیا تھا۔

☆.....☆.....☆.....

”وفا! کیا تم نے سچ میں اذلان بھائی سے یہ کہا.....؟“ دعا نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔
”تو اور کیا میں تم سے جھوٹ بول رہی ہوں۔“ وفا نے غصے سے کہا۔

”اوہو..... وہی تو میں کہوں یہ بھیا آج بار بار وفا کو کیوں دیکھ رہے ہیں۔“ دعا نے شرارت سے کہا۔

☆.....☆.....☆.....

”وفا! میچنگ تو بڑی کی ہے تم دونوں نے۔“ دعا نے سرگوشی کی تو وفا نے گھورنے پر اکتفا کیا وہ دونوں ہی کچھ سیٹ پر بیٹھنے لگی تھیں جب اذلان کی آواز آئی۔

”ڈرائیور نہیں ہوں تم لوگوں کا ایک آگے آ کر

کہتے ہوئے باہر بھاگ گئی۔

”تم نے تو ان کا خون بہتے دیکھ کر 1965ء کی ہیروئن کی طرح بی ہو کیا ہوگا۔“ دعا نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔

”شٹ اپ.....“ وفا نے اسے جھڑکتے ہوئے کہا تو وہ بے ساختہ مسکرانے لگی۔
”دعا! تمہیں ہنسی آرہی ہے اور میری جان پر بنی ہوئی ہے اگر انہوں نے کسی کو بتا دیا تو میں تو گئی۔“ وفا نے بے چارگی سے کہا۔

”اچھا جب یہ ڈائلاگز بولے تھے تب احساس نہیں تھا۔“ دعا نے اسے چڑاتے ہوئے کہا۔
”دعا تم.....“ وفا نے بے بسی سے کہا۔

”وفا! مجھے یقین ہے بھائی کسی سے کچھ نہیں کہیں گے کیونکہ آج میں نے ان کی آنکھوں میں تمہارا عکس دیکھا ہے۔“ دعا نے سنجیدگی سے کہا۔

”دعا! تم میرا دکھ کم کرنے کے لئے مجھے جھوٹی تسلیاں نہ دو۔“ وفا نے کہا اور اٹھ کر چلی گئی۔

☆.....☆.....☆.....

سب لوگ ویسے کے لئے نکل چکے تھے دعا اور وفا کے علاوہ جنہوں نے اذلان شاہ کے ساتھ جانا تھا اور وہ اس کا انتظار کر رہی تھیں۔

”وفا! بھیا ابھی تک آئے کیوں نہیں۔“ دعا نے کہا۔
”مجھ سے تو ایسے پوچھ رہی ہو جیسے مجھے تو ہر کام بتا کر کرتے ہیں۔“ وفا نے بھناتے ہوئے کہا کہ اتنی دیر میں ہارن کی آواز آئی تو دونوں باہر نکلیں اور سامنے ہی گاڑی کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑے اذلان شاہ کو دیکھا جو اسکن شرٹ اور بلیک پینٹ میں بہت پیارا لگ رہا تھا وفا نے بھی بلیک فرائیڈ پہنا ہوا تھا۔

”وفا! میچنگ تو بڑی کی ہے تم دونوں نے۔“ دعا نے سرگوشی کی تو وفا نے گھورنے پر اکتفا کیا وہ دونوں ہی کچھ سیٹ پر بیٹھنے لگی تھیں جب اذلان کی آواز آئی۔

”ڈرائیور نہیں ہوں تم لوگوں کا ایک آگے آ کر

کہتے ہوئے باہر بھاگ گئی۔

بیٹھے۔ اور یہ کہتے ہوئے فزٹ ڈور کھول دیا۔

”وفا! تم آگے بیٹھ جاؤ میرے سے نہیں بیٹھا جاتا۔“ دعا نے کہا تو مجبوراً وفا کو بیٹھنا پڑا اور اذلان نے گاڑی اشارت کردی اذلان شاہ نے سرسری سا وفا شاہ کی طرف دیکھا تھا جو بلیک فرائک میں بہت خوبصورت دکھائی دے رہی تھی۔

”یہ ہے ہی اتنی خوبصورت یا مجھے لگ رہی ہے۔“ اذلان نے سوچا اور شپ ریکارڈر آن کر دیا۔

”تیرا ہونے لگا ہوں

جب سے ملا ہوں“

وفا بے خیالی میں اذلان شاہ کو دیکھے جا رہی تھی۔

”اگر میرا جائزہ لے لیا ہو تو میرج ہال آ گیا ہے۔“ اذلان شاہ نے کہا تو وفا چونک گئی اور جب اپنی بے خیالی یاد آئی تو جھل سی ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگی دعا جو ساری کارروائی دیکھ رہی تھی بمشکل اپنی ہنسی کنٹرول کرتی گاڑی سے اتری تھی اور وفا نے بھی دعا کی پیروی کی تھی۔

”دعا! تم کیوں ہنس رہی ہو.....؟“ وفا نے اپنی شرمندگی مٹانے کو پوچھا۔

”کچھ نہیں ایسے ہی۔“ دعا نے ہنستے ہوئے جواب دیا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ وفا جانتے بوجھے انجان بن رہی ہے وفا جب سے میرج ہال میں داخل ہوئی تھی کسی کی نظروں کی تپش اسے مسلسل محسوس ہو رہی تھی اس نے مڑ کر دیکھا تو سامنے ایک لڑکے کو اپنی طرف دیکھتے پایا تو اس نے غصے سے دوسری طرف منہ کر لیا اذلان شاہ جو وفا کی طرف ہی دیکھ رہا تھا اس نے بھی اس سمت دیکھا جہاں وفا دیکھ رہی تھی اور اس سے بھی برداشت نہیں ہوا کہ کوئی وفا کی طرف دیکھے۔

”وفا! میری بات سنو۔“ اذلان شاہ نے سنجیدگی سے کہا۔

”جی۔“ وفا نے کہا۔

”میرے ساتھ گھر چلو۔“ وفا نے سوالیہ نظروں سے

دعا کو دیکھا جس نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کندھے اچکا دیئے۔

”دعا! ای کو بتا دیتا وفا میرے ساتھ گھر گئی ہے۔“ اذلان نے دعا سے کہا اور وفا کا ہاتھ پکڑ کر باہر لے آیا اور گاڑی میں بٹھا دیا وفا ایک ٹرانس کی کیفیت میں تھی ہوش تو تب آیا جب گھر آ چکا تھا۔

”نیچے اترؤ۔“ اذلان کی آواز اس کے کانوں میں پڑی تو اس نے چونک کر اذلان کو دیکھا اور پھر نیچے اتر گئی اور اندر چلی گئی وفا نا سمجھی کی کیفیت میں بیٹھی تھی جب اذلان شاہ بھی ڈرائنگ روم میں آ گیا وفا نے سوالیہ نظروں سے اذلان کو دیکھا جیسے وجہ جانتا چاہتی ہو اذلان شاہ اس کی نگاہوں کا مفہوم سمجھ گیا تھا جیسی بولا۔

”تمہیں کس نے کہا تھا اتنا میک اپ کر کے جاؤ۔“ اذلان شاہ نے کہا تو وفا کو لگا شاید وہ پاگل ہو گیا ہے جو یہ پوچھنے کے لئے اسے گھر لایا ہے۔

”آپ یہی پوچھنے کے لئے مجھے وہاں سے لائے ہیں.....؟“ وفا نے سادگی سے پوچھا تو اذلان شاہ کو بے ساختہ اس کی معصومیت پر پیار آیا تھا اور پھر شرارت سے بولا تھا۔

”نہیں میں یہ پوچھنے کے لئے تمہیں ساتھ لایا ہوں کہ تم اتنی پیاری کیوں ہو.....؟“ اذلان شاہ نے کہا تو وفا نے حیرت سے اسے دیکھا اسے یقین ہو گیا تھا اذلان شاہ پاگل ہو گیا۔

”کیا مطلب.....؟“ وفا نے کہا تو اذلان کو ہنسی آ گئی وفا کے پوچھنے کا انداز ایسا تھا جیسے اسے اپنی خوبصورتی کا یقین نہ ہو۔

”مطلب بھی سمجھ آ جائے گا کل تمہیں۔“ اور اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا اور وفا اس کی پشت کو گھورتی رہ گئی۔

☆.....☆.....☆

دعا صبح اٹھی تو اسے غیر معمولی پن کا احساس ہوا۔

جیسے اس سے کچھ چھپایا جا رہا ہو وفا نے دعا سے پوچھنے کی کوشش کی لیکن دعا نے کام زیادہ ہونے کا رونا رو کر اپنی جان چھڑوالی آخر کار وفا نے دوپہر کے قریب دعا کو پکڑ ہی لیا۔

”دعا! کیا ہے یہ سب کچھ تم لوگ مجھ سے کچھ چھپا رہے ہونا.....؟“ وفا نے کہا۔

”ارے نہیں تو تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔“ دعا نے کہا۔

”دعا! سچ بتاؤ کیا بات ہے.....؟“

”وفا! وہ تمہارا نکاح ہے آج۔“ دعا نے بڑے آرام سے اس کے گرد دھماکا کیا تھا وفا نے نا سمجھی کے عالم میں دعا کو دیکھا۔

”کیا مطلب.....؟“

”ایک تو تم مطلب بہت پوچھتی ہو۔“ دعا نے کہا۔

”لیکن کس کے ساتھ.....؟“ وفا کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا بولے اس کی زندگی کا فیصلہ اسے ایسے سنایا جا رہا تھا جیسے کسی اور کی بات ہو۔

”اذلان بھائی کے ساتھ۔“ دعا نے کہا تو اسے پہلے تو یقین نہیں آیا لیکن پھر بولی۔

”بڑی امی نے انہیں مجبور کیا ہوگا لیکن مجھے محبت خیرات میں نہیں چاہئے اس طرح حاصل کرنے سے اچھا ہے میں انہیں حاصل ہی نہ کروں۔“ وہ روانی میں بولے جا رہی تھی اسے پتہ ہی نہیں چلا کہ دعا کمرے سے نکل گئی تھی اور اذلان کمرے میں آیا تھا اس نے مڑ کر دیکھا تو دعا کی جگہ سامنے اذلان شاہ کو دیکھ کر اس کی بولتی بند ہو گئی۔

”ہاں ہاں بولو تم کیا کہہ رہی تھیں مجھے محبت بھیک میں نہیں چاہئے اس کا مطلب تم مجھ سے محبت کرتی ہو۔“ اس نے وفا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا جو آنسوؤں سے لالہ بھر گئی تھیں اور اذلان شاہ کے دل کو جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا تھا۔

”وفا! پلیز آنسو صاف کرو اپنا دیوانہ تو پہلے ہی

بتالیا ہے اب کیا مارنے کا ارادہ ہے۔“ اذلان شاہ نے کہا تو اس کی مرنے والی بات پر وفا نے فوراً آنسو صاف کئے تھے اس کی اس حرکت پر اذلان شاہ قہقہہ لگا کر ہنسا تھا اور وفا نے جھینپ کر رخ موڑ لیا تھا اذلان نے اسے شانوں سے پکڑ کر اپنی طرف موڑا تھا اور ایک جذب کے عالم میں بولا۔

”وفا! آئی لو یو۔“ اور وفا اس کا پالٹ پر حیران تھی۔

”جی نہیں آپ میری اتنی انسٹ کرتے تھے۔“ وفا نے شکوہ کیا۔

”میں اپنی محبت کو چھپانے کے لئے ایسا کرتا تھا۔“

”ٹھیک ہے پھر پراس کریں آئندہ مجھے ڈانٹیں گے نہیں۔“

”اچھا بابا پراس۔“ اور وفا کھلکھلا کر ہنس دی اور بولی۔

”لیکن یہ نکاح والا کیا قصہ ہے۔“

”ہاں آج نکاح ہے ہمارا کل ہم شادی پر گئے تھے تو تمہیں کوئی بڑا گھور گھور کر دیکھ رہا تھا اور مجھ سے برداشت نہیں ہوا تو تمہیں ساتھ گھر لے آیا اور رات ہی کو امی کو صاف صاف بتا دیا کہ میں تمہیں پسند کرتا ہوں اور کل ہی نکاح کرنا چاہتا ہوں تو امی نے چھوٹی امی سے اور چھوٹے ابو سے بات کی اور انہیں بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا اتنے ہونہار لڑکے کے رشتے سے جوان کی پاگل بیٹی کو اپنا ناچاہتا تھا لیکن انہوں نے جب تم سے بات کرنے کو کہا تو دعا نے انہیں مطمئن کر دیا۔

”اس دعا کی بچی کو میں چھوڑوں گی نہیں۔“ وفا نے کہا تو اذلان شرارت سے بولا۔

”شرم کر لو اپنے ہونے والے شوہر کے سامنے کسی اور کو نہ چھوڑنے کی باتیں کر رہی ہو لیکن فی الحال تو میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔“ اذلان نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا تو وفا ہاتھ چھڑا کر باہر بھاگ گئی تو اذلان نے زور سے قہقہہ لگایا۔

☆.....☆.....☆

سباس گل

قسط نمبر 14۔

سلسلے وار ناول

ایک عرصہ گزرا

”وقت اور حالات کی کسے خبر ہے کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے نفیس! کہ ہم جس کو دیکھے بغیر ایک لمحہ نہیں گزار سکتے اس کے بغیر ایک عرصہ گزارنا پڑتا ہے۔“ نفیس کی سماعتوں میں عینی کی مدھم اور نرم آواز اپنی تمام تر حلاوتوں کے ساتھ گونجی۔



”واقعی یعنی! مجھے حالات کی خبر نہیں تھی اسی لئے یہ تکلیف دہ وقت میرے حصے میں آ گیا ہے لیکن عینی جانو! اب تو تین ماہ ہونے کو ہیں اور تین ماہ کا عرصہ کم تو نہیں ہوتا اب تمہارے بغیر گز نہیں ہوتی جاناں! میری زندگی پلیز لوٹ آؤ“۔ نفیس نے اسے اپنے سامنے محسوس کرتے ہوئے با آواز کہا۔

لوٹ آ اب کے بن تیرے جاناں!

زندگی بہت اداس لگتی ہے!!!

رات بھر وہ بے کلی سے کروٹیں بدلتے رہے۔ آج وہ عینی کے کمرے میں اس کے بیڈ پر اس کی جگہ پر سونے کے لئے لیٹے تھے مگر نیند اس کی یادوں نے چھین لی تھی۔ وہ آنکھیں بند کرتے تو انہیں محسوس ہوتا کہ عینی ان کے سینے پر سر رکھے سو رہی ہے جو نبی اس احساس میں گھر کر آنکھیں کھولتے عینی انہیں اپنے سامنے کھڑی دکھائی دیتی وہ اسے پکڑنے کے لئے دیوانوں کی طرح اٹھ کھڑے ہوتے تو انہیں لگتا کہ وہ اپنی سڈول کلابوں کی بانہیں ان کے گلے میں ڈال لے کھڑی مسکرا رہی ہے۔ وہ اس کے چہرے کو چھونے کے لئے ہاتھ بڑھاتے تو یہ خیالی پیکر غائب ہو جاتا اور وہ بہت بے قرار ہو کر تڑپ اٹھتے۔

”عینی! میری دیوانگی تم سے پوشیدہ نہیں ہے پلیز مجھے دنیا کے سامنے دیوانہ نظر آنے سے بچاؤ مجھے بچاؤ عینی! اپنے نفیس کو بچاؤ پلیز عینی ان خیالوں کو حقیقت کا رنگ پہناؤ“۔ نفیس نے اس کی تصویر کو دیکھتے ہوئے بھگتی آواز میں کہا آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر عینی کی تصویر بھگوتے رہے۔ یونہی چند دن اور گزر گئے نفیس نے خود کو اپنے بزنس میں بے حد مصروف کر لیا تھا لیکن عینی کی یاد سے پیچھا چھڑانے میں ناکام رہے تھے۔ انہوں نے ایک بار پھر اسے سارے شہر میں ایئر پورٹ ریلوے اسٹیشن ایڈھی سینٹر غرض یہ کہ ہر اس جگہ تلاش کیا جہاں انہیں محسوس ہوا کہ وہ وہاں ہو سکتی ہے لیکن وہ کہیں نہیں ملی انہیں نے اسلام آباد کے اس پی سی او کا خود ایک دن کے لئے اسلام آباد جا کر پتہ کیا تھا عینی کے فون کی تصدیق تو انہوں نے خود بھی اپنے ٹیلی فون آبرویشن سے کر لی تھی اس کی آواز وہ فوراً پہچان گئے تھے اس کے لہجے میں جو درد اور تڑپ تھی وہ ان سے چھپی نہیں رہ سکی تھی لیکن ان کی اسلام آباد جانے کی جستجو بھی ناکام ہو گئی تھی۔ پی سی او کے مالک نے انہیں یہ کہہ کر مایوس کر دیا تھا۔

”سر! ہمارے پاس تو روزانہ سینکڑوں لوگ ٹیلی فون کرنے آتے ہیں، ہم ان سے ان کا نام پتہ تو نہیں پوچھتے جن بی بی کا آپ پوچھ رہے ہیں وہ پرسوں کراچی کی کال کے لئے آئی تھیں مگر ہم انہیں پہچان نہیں سکتے نہ بتا سکتے ہیں کہ وہ کون تھیں اور کہاں رہتی ہیں؟ کیونکہ انہوں نے نقاب کر رکھا تھا“۔

اور نفیس بے بسی کے عالم میں وہاں سے چلے آئے تھے لیکن آنے سے پہلے انہوں نے اسلام آباد کے ہوٹلوں سڑکوں اور ہوٹلوں میں بھی عینی کو تلاش کیا تھا اور خالی ہاتھ لوٹ آئے تھے۔

تیری جستجو مجھے شہر شہر لئے پھری

اور تیری جگہ تھکن واپسی پہ ساتھ چلی

☆.....☆.....☆

”حمید صاحب! یہ کاریگروں اور ہنرمندوں کی محنت ہی ہے جو ہماری ساکھ بیرون ملک بنائے ہوئے ہیں ان کی محنت کی اجرت کے ساتھ ساتھ اچھا کام کرنے پر انعام بھی ضرور ملنا چاہیے انہی کے دم سے تو یہ فیکٹریاں آباد ہیں چل رہی ہیں اور کامیابی کے معیار کو دن بدن بلند کر رہی ہیں“۔

”بجائے اس کے آپ نے“۔ فیجر حمید نے کہا اسی وقت نفیس کے موبائل کی بیل ہوئی۔ نفیس نے فیجر حمید کے ساتھ اپنے آفس میں داخل ہوتے ہوئے موبائل آن کیا۔

”ہیلو نفیس اسپیکنگ“۔ نفیس نے موبائل کان سے لگا کر کہا دوسری جانب سے کوئی جواب نہیں آیا۔

”ہیلو“۔ نفیس کرسی پر بیٹھتے ہوئے دوبارہ بولے تو ان کی نظر ٹیبل پر رکھے سرخ گلابوں کے بوکے پر پڑی وہ چونک گئے۔ ان کا دھیان عینی کی طرف گیا۔

”ہیلو“۔ نفیس نے بے قرار ہو کر کہا اسی وقت لائن کٹ گئی۔ نفیس کے موبائل کی اسکرین پر نمبر موجود تھا انہوں نے نمبر فوراً کاغذ پر لکھا پھر اپنی پاکٹ ڈائری پر نوٹ کیا ان کے ہاتھ میں عینی کا دیا ہوا قلم تھا جو ہر وقت آفس میں ان کے کوٹ کی جیب میں لگا رہتا تھا اس وقت تو نفیس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

”حمید صاحب! یہ نمبر لیں اور مجھے فوراً اس کا ایڈریس ٹریس کر کے بتائیں“۔ نفیس نے کاغذ اٹھا کر فیجر حمید کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”OK سر“۔ فیجر حمید نے کاغذ لے کر کہا۔

”اور ہاں یہ بوکے یہاں کون رکھ گیا ہے؟“۔ نفیس نے بوکے پر لگی Q-N کی چٹ دیکھتے ہوئے بوکے اٹھا کر پوچھا۔

”سر! کوریئر سروس والا تھا شاید“۔

”اوکے پلیز آپ اس نمبر کا ایڈریس فوراً ڈھونڈ کر لائیں“۔

”بہتر سر!“۔ فیجر حمید کمرے سے باہر نکل گئے تو وہ بوکے لے کر بے قراری سے آفس کے کمرے میں ٹہلنے لگے۔

عینی کی پیار بھری دلشیں آواز ان کے کانوں میں آ رہی تھی۔

”تم سرخ گلابوں کو جب بھی پاتا تو یہی سمجھنا کہ میں نے تم کو پیار بھیجا ہے“

”عینی میری جان! مجھے سرخ گلابوں کی نہیں تمہاری ضرورت ہے تم آ جاؤ جان! تم آ جاؤ“۔ نفیس نے سرخ گلابوں پہ لگی اس کے نام کی چٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

”لیجیے سر! یہ فون نمبر مشاہدائی اسکول اسلام آباد کا ہے یہ ایڈریس بھی میں نے لکھ دیا ہے“۔ فیجر حمید کاغذ لئے آفس میں داخل ہوئے اور ان کی جانب کاغذ بڑھاتے ہوئے بتایا تو انہوں نے وہ ایڈریس اپنی پاکٹ ڈائری میں نوٹ کر لیا۔

”تھینک یو ویری میچ حمید صاحب“۔

”یو آر ویلکم سر!“

”حمید صاحب! آپ اسلام آباد کے لیے میری سیٹ بک کرادیں جو بھی پہلی فلائٹ جائے کوشش کریں کہ مجھے اس میں سیٹ مل جائے پلیز فوراً“۔

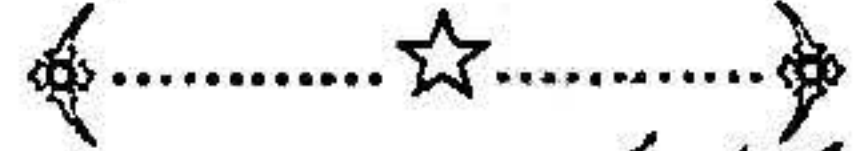
”بہت بہتر سر! میں ابھی سیٹ بک کرادیتا ہوں۔ سر! کوئی پریشانی ہے کیا؟ خیریت تو ہے ناں سر؟“۔ فیجر حمید نے ان کے چہرے سے عیاں بے چینی کو محسوس کرتے ہوئے خلوص سے پوچھا تو انہوں نے سنجیدہ اور نرم لہجے میں کہا۔

”دعا کیجیے حمید صاحب! جو پریشانی ہے وہ ختم ہو جائے سب خیریت ہو اور میں جس مقصد کے لیے اسلام آباد جا رہا ہوں وہ مقصد کامیاب ہو“۔

”آمین! انشاء اللہ سر! آپ ضرور خوشی خوشی اور کامیابی کے ساتھ واپس لوٹیں گے“۔ فیجر حمید نے دل سے کہا۔

”تھینک یو“۔ نفیس نے مسکرا کر کہا اور ان کے جاتے ہی گھر فون کر کے کنول کو اپنا سوٹ کیس تیار کرنے کا کہہ کر بوکے پر نظریں جمالیں۔ ان کا ذہن یہی سوال سوچ رہا تھا۔

تھینک یو انکل! اللہ حافظ!۔ حارث رضانا خوشی سے مسکراتے ہوئے کہا اور چاکلیٹ لے لی۔
”اللہ حافظ بیٹا!۔ وہ سن گلاسز لگا کر اسکول کی عمارت سے باہر چلے آئے۔“



”اف کس قدر سردی ہے ہیٹر کے ساتھ بھی کوئی مسئلہ ہو گیا ہے چل ہی نہیں رہا شاید تار میں گڑبڑ ہو گئی ہے میں دوسری تار لگا کر دیکھتی ہوں ورنہ رات کیسے کٹے گی، کمرہ تو گرم ہو جائے پھر بند کر دوں گی ہیٹر“۔ اس نے لائٹ گرے کلر کا پل ادور پہنچتے ہوئے کہا، پھر جراثیم پہنیں رات کے پونے دس بج رہے تھے باہر گہری دھند چھائی ہوئی تھی اسے لاؤنج میں آہٹ سنائی دی تو وہ اپنے کمرے سے نکل کر لاؤنج میں داخل ہوئی۔ اسے کوئی شخص کھڑا دکھائی دیا، اس کی پشت اس کی جانب تھی اس لیے وہ پہچان نہ سکی کہ کون ہے؟ لیکن ڈر بھی گئی تھی کہ اس وقت اس کے گھر میں کون آ سکتا تھا وہ بھی بغیر اجازت لیے۔

”کون ہیں آپ؟“ اس نے پُر اعتماد لہجے میں پوچھا، مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ گھبرا گئی۔ لہجے کو سپاٹ رکھتے ہوئے دوبارہ پوچھا۔

”میں نے آپ سے پوچھا ہے مسٹر! کون ہیں آپ؟ اور بغیر اجازت کے میرے کمرے میں کیسے داخل ہوئے؟“ اس کی مسلسل خاموشی سے وہ خوفزدہ ہو گئی اس کی نظر ٹیبل پر رکھے فروٹ کٹر پر پڑی اس نے وہی اٹھالیا اپنی حفاظت کے خیال سے اور اس کی طرف اس کا رخ کر لیا۔

”مسٹر! آپ کون ہیں؟ کیوں آئے ہیں بغیر اجازت کے میرے کمرے میں؟“ اس نے غصیلے اور تیز لہجے میں پوچھا تو وہ اس کے سامنے چلے آئے۔

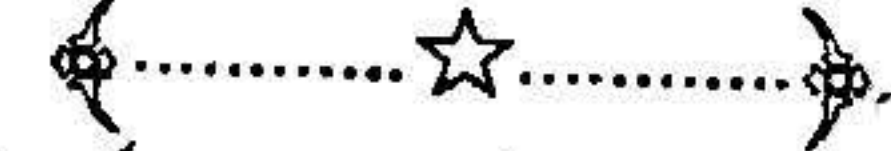
”کیا تمہارے کمرے میں آنے کے لیے مجھے تم سے اجازت لینے کی ضرورت ہے؟“ نفیس نے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے پوچھا تھا وہ حیرت سے ان کا چہرہ نکلے جا رہی تھی اس کا ہاتھ جوں کا توں اٹھا رہا تھا زبان گنگ ہو گئی تھی۔
”یعنی! میں تمہارا مجرم ہوں، مارو مجھے یہ کٹر میرے سینے میں اتار دو کہ میری وجہ سے ہی تم اس جال کو پہنچی ہو میرے حوالے نے بہت دکھ دیئے ہیں تمہیں، بہت رُلا یا ہے نا میں نے تمہیں، تمہارا دل ٹوٹا ہے روح زخمی ہوئی ہے صرف میری وجہ سے، پلیز کچھ بولو عینی! مجھے مارو عینی!“ نفیس نے اس کے شانوں کو تھام کر برنم آواز میں کہا تو اس کے ہاتھ سے کٹر چھوٹ کر نیچے گر گیا اور اس کا ہاتھ بھی بے جان ہو کر پہلو میں آگرا، ان کا لمس اسے ہوش میں لے آیا اور اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے ان کے ہاتھ اپنے شانوں سے ہٹا دیئے۔

”یعنی!“ نفیس نے تڑپ کر اسے دیکھا۔
”آئی ایم ناٹ عینی، مائی نیم از روشنی..... اینڈ آئی ڈونٹ نو دیٹ ہو آریو؟“ عینی نے بہت سنجیدہ اور سپاٹ لہجے میں کہا تو وہ بے چین ہو گئے۔

”یعنی! ایسا مت کہو تم عینی ہو میری عینی..... میری آنکھوں کی روشنی ہو آنکھوں کی ٹھنڈک ہو نام، لباس اور زبان بدلنے سے کیا بدل سکتا ہے، کیا روح تبدیل ہو سکتی ہے عینی؟“ انہوں نے تڑپتے ہوئے کہا۔

”میں عینی نہیں ہوں پلیز جائیے یہاں سے“۔ اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔
”میں تو جہاں سے بھی چلا جاتا لیکن تمہاری دعاؤں نے مجھے بچالیا“۔ نفیس نے نرم لہجے میں کہا تو اس نے تڑپ کر انہیں دیکھا، اس کی آنکھوں کی تڑپ نفیس سے چھپی نہیں رہ سکی تھی انہوں نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔
”تم عینی نہیں ہو تو یہ رونمائی کی انگوٹھی تمہارے ہاتھ کی انگلی میں کیسے آگئی یہ تو میں نے اپنی عینی کو پہنائی تھی“۔ نفیس نے

”یعنی اسلام آباد میں کس کے پاس ہے وہاں کون ہے اس کا؟“
”سر! آپ کی سیٹ کنفرم ہو گئی ہے رات آٹھ بجے کی فلائٹ ہے“۔ منیجر حمید نے آکر بتایا۔
”اوکے تھینک یو ویری مچ“۔ نفیس نے مسکرا کر جواب دیا۔



بلیک ٹراؤزر، میرون شرٹ پر بلیک لیڈیز کوٹ پہنے پاؤں میں بلیک لیڈیز شوز پہنے ہوئے تھے اس نے۔ ہیئر اسٹائل اسٹیلپ اینڈ لیئر کس کٹنگ کے ساتھ اس کے چہرے کو بہت منفرد اور حسین بنا رہا تھا، ہاتھ میں بلیک رنگ کا ہینڈ بیگ اٹھائے تیز تیز قدم اٹھاتی وہ اپنے مطلوبہ کلاس روم کی طرف جا رہی تھی۔ ایک لمحے کو تو وہ اسے دیکھ کر چونک سے گئے تھے مگر دوسرا پل انہیں اس کی پہچان کا رنگ دکھا گیا تھا۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ اسے نہ پہچانتے اسے اپنی زندگی کو اپنی محبت کو اپنی کائنات کو وہ تو ان کی رگ رگ میں خون بن کر دوڑ رہی تھی۔
”ایکسیکوز می بیٹے! ایک منٹ بات سنئے“۔ انہوں نے قریب سے گزرتے ایک بچے کو آواز دے کر کہا۔

”جی انکل فرمائیے“۔ بچے نے مسکراتے ہوئے ان کے چہرے کو دیکھا۔

”بیٹے! یہ ٹیچر جو کلاس روم میں گئی ہیں کیا نام ہے ان کا؟“

”وہ ان کے چہرے سے جو دکھائی دیتی ہے“۔ بچے نے بہت خوشگوار موڈ میں کہا۔

”کیا دکھائی دیتی ہے؟“ انہوں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”روشنی“۔ اس نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

”ان کا نام روشنی ہے“۔
”روشنی تو وہ ہے پیارا اور اعتبار کی روشنی، وقار کی روشنی“۔ انہوں نے خود کلامی کرتے ہوئے کہا۔

”میں جاؤں انکل؟“ بچے نے پوچھا تو انہوں نے پیار سے پوچھا۔

”جی بیٹے! یہ بتائیے کہ یہ مس روشنی آپ کو کب سے پڑھا رہی ہیں؟“

”ابھی دو مہینے پورے نہیں ہوئے مجھے بہت اچھی لگتی ہیں مس روشنی، میرا دل چاہتا ہے کہ میں ساری زندگی ان ہی سے پڑھتا رہوں“۔ وہ بچہ کچھ زیادہ ہی متاثر نظر آ رہا تھا روشنی سے۔

”ہیں..... ہیں بیٹے! ابھی آپ کی عمر ہی کیا ہے، کون سی کلاس میں پڑھتے ہیں آپ؟“ انہوں نے ہنس کر پوچھا

تو اس نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

”کلاس فور تھ میں پڑھتا ہوں میں اور میرا نام حارث رضا ہے“۔

”ماشاء اللہ بہت پیارا نام ہے آپ کا جیتے رہو بیٹا! بس مجھے اتنا بتا دیجیے کہ کیا آپ کو معلوم ہے کہ مس روشنی کہاں رہتی ہیں؟“ انہوں نے اس کا گال پیار سے چھوتے ہوئے پوچھا۔

”جی انکل! مس روشنی وہ سامنے والے بنگلے کے ساتھ جو بنگلہ ہے ناں سفید گیٹ والا وہاں رہتی ہیں“۔ حارث

رضانا بتایا۔

”عباس ولا“ ہے وہ تو“۔ انہوں نے آتے ہوئے دیکھا تو نام ذہن میں رہ گیا۔

”جی انکل! یہ اسکول سرعباس کا ہی تو ہے اور مس روشنی بھی انہیں انکل کہتی ہیں“۔ حارث رضانا مزید بتایا۔

”حارث بیٹا! آپ کا بہت بہت شکریہ خوش رہئے اللہ تعالیٰ آپ کو بہت ساری کامیابیاں عطا فرمائے“ یہ لیں

چاکلیٹ“۔ انہوں نے اس کا گال چوم کر کہا اور اپنے کوٹ کی جیب میں سے چاکلیٹ کا پیکٹ نکال کر دے دیا۔

اس کی انگلی میں چسکتی انگوٹھی کو دیکھتے ہوئے کہا تو اس نے رخ پھیر لیا۔ اس کے گلے میں نفیس کی پہنائی ہوئی سونے کی زنجیر اپنی موجودگی کا نظارہ کرانے لگی تو نفیس نے لاکٹ اس کے پل اور سے باہر نکال کر اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔
”اگر تم نفیس کی عینی نہیں ہو تو یہ کس کا پیار ہے جو اب تک تمہارے گلے سے لپٹا ہوا ہے۔“

”یہ کسی کا پیار نہیں ہے نفرت ہے مجھے آپ سے جائے یہاں سے۔“ وہ چیخ کر روتے ہوئے بولی تو انہوں نے محبت سے اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔

”نفرت تو تمہیں مجھ سے کبھی ہو ہی نہیں سکتی نفرت ہوتی تو مجھے اسپتال میں سرخ گلابوں کا تحفہ نہ بھجواتیں گھر فون کر کے میری خیریت نہ معلوم کرتیں۔“

”میں نے کب فون کیا؟“ وہ شپٹا کر بولی۔

”کیا تم نے فون نہیں کیا تھا تمہارا کل کا فون ہی تو مجھے یہاں تک لایا ہے کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا میں نے تمہیں اور تم ہو کے مجھ سے نفرت کا اظہار کر رہی ہو کیوں ظلم کر رہی ہو اپنے آپ پر کل تو تم نے مجھے اپنا پیار بھیجا تھا سرخ گلابوں کی صورت میں بھیجا تھا ناں عینی؟“ نفیس نے بہت محبت بھرے لہجے میں کہا۔

”نفیس!“ وہ خود پر قابو نہیں رکھ سکی اور دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا کر تڑپ تڑپ کر رونے لگی۔ نفیس نے اس کے چہرے سے اس کے ہاتھ ہٹائے تو ان کے سینے میں چہرہ چھپا کر بلکنے لگی۔ نفیس بھی آج اپنے آنسو اس کے ساتھ شیئر کر رہے تھے۔ ان کی زندگی ان کی محبت انہیں مل گئی تھی ان کا دل شکر کے سجدے ادا کر رہا تھا۔

”عینی جانو! میں تمہیں لینے آیا ہوں چلو گی تا میرے ساتھ؟“ ان کے آنسو تھے تو انہوں نے اس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں بھر کر پیار سے پوچھا تو وہ سنجیدہ ہو کر بولی۔

”نہیں..... میں اب وہاں نہیں جاؤں گی آپ جائیں میں یہاں خوش ہوں۔“

”میرے بغیر تم یہاں خوش ہو عینی! ذرا میرے دل پر ہاتھ رکھ کر یہ بات کہو۔“ ان کا سوال سنتے ہی انہیں یوں محسوس ہوا جیسے اس کی آنکھوں کے پیچھے آنسوؤں کی اور بھی صراخیاں تھیں جو سوال سنتے ہی الٹ گئی تھیں اور یہ آنسو اس کا چہرہ دھوئے جارہے تھے اس نے روتے ہوئے کہا۔

”مجھے آپ کے دل کا حال بھی معلوم ہے اور اپنے دل کی کیفیت بھی جانتی ہوں، لیکن نفیس! میں اس گھر سے جس طرح نکالی گئی تھی جو کچھ میرے ساتھ وہاں ہوتا رہا، میں وہ سب دوبارہ جھیلنا نہیں چاہتی۔ آپ کو کیا معلوم کہ میں کس اذیت سے گزر رہی ہوں، کتنی تکلیفیں اٹھائی ہیں میں نے۔“

”عینی! مجھے اندازہ ہے جانو۔“ وہ اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے بولے۔

”نہیں آپ اندازہ نہیں لگا سکتے آپ کو کیا معلوم کہ اس گناہ کی اذیت کیسی ہوگی جو آپ نے کیا ہی نہ ہو اس جرم کا احساس کیسا ہوگا جو آپ سے سرزد ہی نہ ہوا ہو کیسے گناہ کیسے جرم اور الزام میں میرے پاکیزہ کردار پر لگائے گئے کیسی کیسی ہمتیں مجھ پر دھری گئیں آپ سوچ بھی نہیں سکتے کہ میں کس اذیت اور عذاب سے گزری ہوں گی۔ نہیں نفیس! میں اس گھر میں وہاں نہیں جاؤں گی جہاں میرے کردار کو دغا دیا گیا۔“ وہ بھکیٹی آواز میں بولی۔

”عینی! میں نے تو یقین نہیں کیا تھا ان تصویروں پر کنول اور سلٹی آنٹی کی باتوں پر میرا کیا قصور ہے جانو! مجھے کس جرم کی سزا مل رہی ہے؟“ وہ تڑپ کر ہنسنے لگی۔

”نہ آپ کا قصور تھا نہ میرا تو بتائیے کس کا قصور تھا؟ کنول آپ پر تو آپ کو بہت اعتبار تھا شاید مجھ سے بھی زیادہ۔ آپ نے تو کہا تھا کہ تمہارے ظرف کی بات ہے بتائیے نفیس! میں نے کہاں کم ظرفی دکھائی تھی جو مجھے یہ انعام دیا گیا۔“

آپ نے کہا تھا کہ تم اپنوں کے بیچ ہو کنول آپ پر اعتبار تھا آپ کو اور آئندہ مجھے کچھ کہنے سے منع کر دیا تھا۔ میں نے کچھ نہیں کہا تھا، چپ چاپ ان کے ظلم سہتی رہی، ان کی ہرزادی پر خاموش رہی کہ مجھے آپ کا پیار اور اعتبار حاصل تھا لیکن آپ خود سے کچھ بھی نہ دیکھ سکے کچھ بھی نہ سمجھ سکے۔“

”آئی ایم سوری عینی!“ نفیس نے بے بسی اور شرمندگی سے کہا۔

”میرے اعتبار کا خون ہوا ہے تم سمجھ سکتی ہو کہ میں کس کرب سے گزرا ہوں گا، میرے دل کا کیا حال ہوا ہے تمہارے جانے کے بعد تم جانتی ہو عینی! ان کی باتوں پر یقین کر لیتا تو یوں مارا مارا نہ پھرتا تمہاری تلاش میں۔ دور رہ کر اب تو تمہیں یقین آ گیا ہو گا کہ میں تمہارے بغیر موت کے دہانے پر پہنچ جانے کا جو دعویٰ کیا کرتا تھا وہ غلط نہیں تھا۔ عینی! کنول نے مجھ سے معافی مانگ لی ہے اور میرے پاس اسے معاف کرنے کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا، اس نے احساسِ ندامت میں گھر کر خودکشی کرنے کی کوشش کی تھی لیکن میں بروقت پہنچ گیا اور وہ..... ایک اور جرم کرنے سے بچ گئی وہ بہت نادام ہے اپنے لیے تم سے بھی معافی مانگنا چاہتی ہے اس نے یہ سب کچھ میری محبت میں کیا تھا مجھے کسی اور کے ساتھ شیئر نہیں کر سکتی تھی کچھ اس کی مٹی نے اسے تمہارے خلاف بھڑکایا تھا۔ بہر حال جو کچھ بھی ہوا اس کی تلافی تو نہیں ہو سکتی لیکن معافی تو مل سکتی ہے ناں اسے۔“ نفیس نے نرم مدھم اور سنجیدہ لہجے میں کہا۔

”کتنی جلدی اور کتنی آسانی سے آپ نے انہیں معاف کر دیا آپ کے لیے تو یہ اعزاز ہی بہت ہے کہ انہوں نے آپ کی محبت میں مجھ سے عداوت کی، مرد کے لئے یہی بات اہم ہوتی ہے نا کہ اس کی بیوی اس کی محبت میں سب کچھ کر سکتی ہے اور اس کے اس عمل پر اس کی خطائیں معاف کر دی جاتی ہیں۔“ عینی نے غمی سے کہا۔

”عینی! یہ بات نہیں ہے جان..... مجھے بتاؤ میں کیا کرتا، تم نے جس گھر کی عزت بچانے کے لیے وہ گھر چھوڑنا ضروری سمجھا، میں اس گھر کی عزت کیسے داؤ پر لگا دیتا، میرا دل تو چاہتا تھا کہ کنول کو شوٹ کر دوں یا اسے طلاق دے دوں لیکن جانو! میں ایسا نہیں کر سکتا تھا مجھے جوش اور جذبات میں آ کر نہیں سوچنا تھا، سمجھ اور شعور کے مطابق فیصلہ کرنا تھا، میں نے اس سے کہا تھا کہ وہ اپنی ماں کے ساتھ ہمیشہ کے لیے چلی جائے لیکن وہ نہیں گئی، احساسِ جرم اور احساسِ ندامت نے اسے جانے نہیں دیا۔

وہ مجھ سے محبت کرتی ہے اس طویل رفاقت کے بعد میں اسے طلاق دے دیتا تو لوگ تو یہی کہتے ناں کہ میں نے عینی کی وجہ سے کنول کو طلاق دی ہے۔ میں تم پر کوئی الزام نہیں آنے دینا چاہتا تھا مجھے کنول کی دس گیارہ برس کی خدمتوں اور چاہتوں کا بھی خیال تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ میرے بچوں کی ماں ہے میں اسے طلاق دے کر اپنے بچوں کو ماں سے محروم نہیں کر سکتا تھا۔ ان کی شخصیت کو سخ ہوتا ہوا نہیں دیکھ سکتا تھا عینی! تم بھی تو بچوں کی وجہ سے خاموش رہتی تھیں اس میں ان معصوموں کا کیا قصور تھا جو انہیں ماں سے محروم کر دیتا۔ کنول نے میرا دل توڑا، میرا دل دکھایا، سچ کہتا ہوں اس کے اس عمل سے میرا دل اس کی محبت سے خالی ہو گیا ہے اب میرے دل میں اس کے لیے ہمدردی اور خلوص تو ہے لیکن اعتبار اور پیار نہیں ہے یا شاید اس کی گزشتہ محبتوں کے صلے میں کچھ پیار بھی باقی ہو۔ کیا کروں میں عینی؟ میں نفرت نہیں کر سکتا، نہیں ہوتی، مجھ سے نفرت۔ کنول کو اپنے کیے کی بہت سزا مل چکی ہے اور کیا یہ سزا اس کے لیے کافی نہیں ہے کہ میں نے اس کی اتنی سنگین غلطی پر بھی اسے معاف کر دیا ہے اور غلطیاں تو ہر انسان سے سرزد ہوتی ہیں۔ اس نے دس گیارہ برس کے اس عرصے میں اگر ایک جرم کیا ہے ایک غلطی، ایک زیادتی اس سے سرزد ہو گئی ہے تو اسے اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے معاف کر دینا ہی بہتر ہے۔“

”ہاں ٹھیک کہتے ہیں آپ۔“ عینی نے گہرا سانس لے کر کہا۔

(جاری ہے)

نظیر فاطمہ

افسانہ

دل کی لکڑی دھڑکنے لگی تھی

ام ایبھا نے آفس سے نکل کر سڑک پار کی اور فٹ پاتھ پر چڑھ کر کھڑی ہو گئی۔

”السلام علیکم“ کی آواز پر اس نے اپنے دائیں جانب دیکھا تو ادھر کھڑے ضرغام عباس کو دیکھ کر پہلے اس کے چہرے پر حیرت اور پھر محبت بھری مسکراہٹ ابھر آئی، وہ اسے دو سال بعد دیکھ رہی تھی لیکن اس نے لمحوں میں اسے پہچان لیا اور ”علیکم السلام“ کہہ کر بڑی محبت سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اس کا حال چال پوچھا، ضرغام نے اسے بتایا کہ اس کے چچا کا ٹرانسفر دوبارہ لاہور ہو گیا ہے اور وہ لوگ اس کا لونی کے بی بلاک میں رہ رہے ہیں۔

ام ایبھا نے پچھلے چھ سات سال اچھی ساکھ کے ایک پرائیویٹ اسکول میں پڑھایا تھا، دو سال پہلے ضرغام عباس اس کی کلاس میں پرموٹ ہو کر آیا تھا، اس وقت وہ آٹھویں جماعت کو پڑھاتی تھی، ام ایبھا کو اس گم صم سے بچے سے بہت ہمدردی محسوس ہوتی تھی، پھر جب اسے یہ معلوم ہوا کہ چار سال پہلے اس بچے کے والدین ایک فضائی حادثے میں جاں بحق ہو گئے تھے تو اسے اس بچے کا دکھ اپنے سینے پر محسوس ہونے لگا اور اس کا دل اس بچے کے لئے محبت سے بھر گیا، وہ ضرغام کا پہلے سے زیادہ خیال رکھنے لگی اور اسے زیادہ توجہ دینے لگی تاکہ وہ بچہ زندگی کی دلچسپیوں کی طرف لوٹ آئے، اس کی کوششوں سے ضرغام آہستہ آہستہ مختلف

سرگرمیوں میں حصہ لینے لگا۔ ام ایبھا اس کو زندگی کی طرف لوٹا دیکھ کر بہت خوش تھی، اس کی پوری فیملی ضرغام سے غائبانہ طور پر متعارف تھی، ضرغام عباس کو بھی اپنی اس نیچر سے بہت انسیت ہو گئی تھی۔

ام ایبھا اپنے فری پیریڈ میں بیٹھی چائے پی رہی تھی کہ اسے پرنسپل کے آفس سے بلاوا آ گیا، وہ چائے کا کپ وہیں رکھ کر پرنسپل کے آفس میں آ گئی، وہاں ایک باوقار سی خاتون بیٹھی ہوئی تھیں، وہ انہیں سلام کر کے پرنسپل صاحب کی طرف متوجہ ہوئی تو انہوں نے ان خاتون سے مخاطب ہو کر کہا۔

”میم! یہ ہیں مس ام ایبھا۔“ پھر ام ایبھا سے کہنے لگے۔

”یہ خاتون ضرغام عباس کی دادی ہیں اور آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔“ انہوں نے پرنسپل صاحب سے اس کی بہت تعریف کی اور وہ اس کی بہت شکر گزار تھیں کہ وہ ان کے پوتے کو نارمل زندگی کی طرف واپس لے آئی ہے۔ جب آٹھویں جماعت کے سالانہ امتحان قریب آئے تو ضرغام کے چچا کا ٹرانسفر بہاولپور ہو گیا، امتحانات کے بعد ضرغام عباس نے وہ اسکول چھوڑ دیا لیکن جانے سے پہلے اس کی دادی نے ام ایبھا کو اپنے گھر چائے پر بلایا اور اس کو ایک اچھا سا سوٹ تحفے میں دیا، اس کے بعد ان کا رابطہ ختم ہو گیا، ان دو سالوں میں ام ایبھا ترقی کرتے ہوئے اسی اسکول میں بطور

بیٹا، میں، کام کر رہی تھی، آج اسکو لے
واپس پر ہی اس کی ملاقات ضرغام عباس سے ہوئی تھی۔
اس روز ام ایبھا نے آفس سے ہاف ڈے آف کیا
اور باہر آ کر کسی سواری کی تلاش میں نظریں دوڑانے لگی
اسی اثناء میں ایک گاڑی اس کے پاس آ کر رکی اور
ضرغام گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول کر باہر نکلا اس نے ام
ایبھا کو سلام کیا اور ان سے کہنے لگا۔

”آپ کہاں جا رہی ہیں میں آپ کو چھوڑ دیتا
ہوں۔“ ام ایبھا نے اس کی یہ پیش کش قبول کر لی اور
گاڑی میں بیٹھ کر ڈرائیور کو پتہ سمجھانے لگی۔ ضرغام
کہنے لگا۔

”میں نے دادو کو آپ کے بارے میں بتایا تھا
وہ آپ سے ملنا چاہتی ہیں آپ کسی دن ہمارے گھر
آئیے نا آپ کے آفس کے پیچھے ہی تو ہے ہمارا
گھر۔“ ام ایبھا نے کسی روز ان کی طرف جانے کی
حالی بھرتی، ضرغام نے اس سے موبائل نمبر لے لیا اور
اپنا نمبر اسے دے دیا۔

ام ایبھا آفس میں تین گھنٹے کی میٹنگ بھٹکا کر اپنے
کیبن میں واپس آئی اور اپنا موبائل چیک کرنے لگی
اس کے موبائل پر ضرغام کی چھ مرس کالز تھیں اس نے
کال بیک کی تو ضرغام نے کہا۔

”دادو آپ سے بات کرنا چاہ رہی ہیں۔“ ضرغام
نے فون دادو کو دے دیا، دادو نے فون پر اس کی خیر
خیریت پوچھی اور اسے اپنے گھر آنے کی دعوت پر زور
دیا، ام ایبھا نے جمعہ کے روز ان کے ہاں آنے کی حالی
بھرتی کیونکہ جمعہ کو دو گھنٹے کی لنچ بریک ہوتی تھی، جمعہ کو وہ
لنچ بریک شروع ہوتے ہی ام ایبھا نے اپنا بیک لیا اور
آفس سے باہر آ گئی وہاں ضرغام عباس پہلے سے موجود
تھا وہ دونوں پیدل چلتے ہوئے گھر تک آئے دادو اسے
دیکھ کر بہت خوش ہوئیں اور اسے گلے سے لگا کر پیار
کیا۔ دادو کو شروع سے سادہ سی ام ایبھا بہت بھاتی تھی
وہ اب بھی دو سال پہلے جیسی ہی تھی وہی سیدھے بالوں

کی مانگ، سر پر دوپٹہ دھلا دھلا، فریش چہرہ اور ہونٹوں
پر مسکراہٹ، دادو اس سے اس کی فیملی کا حال چال پوچھنے
لگیں اتنے میں نوکر چائے اور لوازمات سے بھری ٹرائی
لے آیا، ام ایبھا اتنا اہتمام دیکھ کر کہنے لگی۔
”آئی! اس تکلف کی کیا ضرورت تھی۔“ آئی
کہنے لگیں۔

”کوئی تکلف نہیں ہے یہ سب تو میری بیٹی کے لئے
ہے۔“ آئی نے اسے بتایا کہ ضرغام عباس تمہیں اکثر یاد
کرتا تھا اور وہ اب بھی یہ کہتا ہے کہ مس ام ایبھا نہ ہوتیں
تو وہ اپنی محرومی کو اپنے اوپر ہمیشہ سوار رکھتا۔ دو گھنٹے بعد
ضرغام اسے آفس واپس چھوڑ گیا۔



اتوار کے روز ام ایبھا نے واشنگ مشین لگا کر
سارے کپڑے دھوئے اور نہادھو کر فریش ہونے کے
بعد اپنے کمرے میں آ کر ٹی وی دیکھنے لگی اسی دوران
ای اس کے پاس آئیں اور بولیں۔

”کل تمہارے آفس جانے کے بعد تمہارا
اسٹوڈنٹ ضرغام عباس اور اس کی دادی ہمارے گھر
آئے تھے۔“ ام ایبھا نے حیرت سے پوچھا۔
”کیوں؟“ ام ایبھا نے کہنے لگیں۔

”وہ اپنے بیٹے یعنی ضرغام کے چچا کا رشتہ لے کر
آئی تھیں۔“ وہ ہر طرح سے قسلی کر رہی تھیں۔
”لیکن میں نے اور تمہارے ابو نے ان سے
سوچنے کا وقت لیا ہے اس سے پہلے کہ ہم بات آگے
بڑھا میں تم اپنی رائے دو۔“ ام ایبھا نے کہا۔

”جیسے آپ کی مرضی۔“ کہہ کر ٹی وی کی طرف
متوجہ ہو گئی اور ام ایبھا نے باہر چلی گئیں اگرچہ وہ کئی
دفعہ ضرغام عباس کے گھر جا چکی تھیں لیکن ابھی اس کے
چچا حیدر عباس سے نہیں ملی تھی وہ ان کے بارے میں
زیادہ جانتی بھی نہیں تھی اسے اس بات سے کوئی فرق
نہیں پڑتا تھا، ام ایبھا کو اس معاملے میں اللہ کے بعد
اپنے والدین پر بھروسہ تھا کہ وہ اس کے لئے جو کرنا

گے اچھائی کریں گے۔
آج آفس کے بعد وہ اپنی سہیلی کے لئے گفت
خریدنے ”ورائی“ آئی اور اپنی مطلوبہ چیزیں دیکھنے لگی
وہیں پر اسے ضرغام نظر آیا تو اس نے پہلو کہہ کر اسے
متوجہ کیا، اسے دیکھ کر ضرغام کی آنکھوں میں شرارت
ٹاپنے لگی، ام ایبھا نے مانتے دالے انداز میں بھنویں
اٹھا کر پوچھا۔

”کیا بات ہے۔“ ضرغام عباس بولا۔
”آئیے میں آپ کو کسی سے ملاؤں۔“ وہ اسے
لے کر کتابوں والے سیکشن میں گیا اور پینتیس چھتیس
سالہ ایک اونچے لمبے قبول صورت شخص کے پاس جا کر
کہنے لگا۔

”چاچو! دیکھیں یہ مس ام ایبھا ہیں اور مس! یہ ہیں
میرے چاچو عباس۔“ ام ایبھا کو عجیب سی سخت محسوس
ہوئی تاہم اس نے انہیں سلام کیا، حیدر عباس نے ایک
اچھی سی نظر اس پر ڈال کر سلام کا جواب دیا اور ضرغام
سے کہنے لگے۔

”اگر تم فارغ ہو گئے ہو تو آج ہی مل پے کر
دو۔“ ام ایبھا ضرغام کی طرف مڑی اور بولی۔
”ضرغام! یہ بے ہودگی تھی؟ میں آئی سے تمہاری
شکایت کروں گی۔“ ضرغام شرارت سے اس کی طرف
دیکھ کر بولا۔

”کیا شکایت کریں گی دادو سے۔“ ام ایبھا
اسے غصے سے گھورنے لگی۔

ام ایبھا کے گھر والوں نے پوری چھان بین اور قسلی
کے بعد حیدر عباس کے لئے ہاں کر دی، آئی تو جلد از
جلد ام ایبھا کو اپنے گھر لے جانا چاہتی تھیں انہوں نے
ایک ماہ بعد کی تاریخ رکھ لی اور اس کے والدین سے
کہنے لگیں۔

”مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے مجھے تو بس آپ
کے گھر کا یہ اجالا ہی چاہیے۔“ ام ایبھا واقعی اپنے گھر کا
اجالا تھی، کم آمدنی کے باوجود اس کے ابو کا یہ خواب تھا

کہ وہ اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائیں، یہ ام ایبھا ہی تھی جو
تعلیم مکمل کرنے کے بعد جاب کر کے اپنے والد کا سہارا
بن گئی اور اپنے سے چھوٹی دو بہنوں اور دو بھائیوں کو
تعلیم مکمل کرنے میں سپورٹ کیا، ایم اے کرنے کے
بعد اس کی دونوں بہنوں کی شادیاں ہو چکی تھیں اور اس
کے دونوں بھائی تعلیم مکمل کر کے ملٹی نیشنل کمپنیوں میں
اچھی پوسٹ پر جاب کر رہے تھے یہ سب کرنے میں ام
ایبھا نے اپنی زندگی کے دس بہترین سال خرچ کئے تھے
اب اس کی عمر تیس سال تھی، لیکن وہ اتنی دھان پان تھی
کہ اپنی عمر سے پانچ چھ سال چھوٹی ہی دکھتی تھی اس کے
والدین کو اس کی شادی کی بہت فکر تھی، لیکن ام ایبھا کبھی
اپنے رب سے مایوس نہیں ہوئی تھی اس کا یقین تھا کہ
اس کا رب اسے کبھی بے یار و مددگار نہیں چھوڑے گا اور
اب وہ حیدر کے ساتھ زندگی کا نیا سفر شروع کرنے جا
رہی تھی اس کے والدین بہت خوش اور مطمئن تھے اور
اللہ کے شکر گزار تھے جس نے ان کی بیٹی کو اتنے محبت
کرنے والا گھر دیا تھا۔



ام ایبھا رخصت ہو کر حیدر عباس کے گھر آ گئی
اسے لاؤنج میں صوفے پر بٹھایا گیا تو ضرغام عباس اس
کے ساتھ آ کر بیٹھ گیا اور بہت محبت سے کہنے لگا۔

”اب تو میں آپ کو چاہی کہہ سکتا ہوں نا آپ کیا
جانیں اس شادی کے لئے میں نے اور دادو نے کتنے
پاپڑ بیلے ہیں پھر کہیں جا کر چاچو تیار ہوئے تھے شادی
کے لئے۔“ ام ایبھا نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا۔
مختلف رسموں کے بعد اسے حیدر عباس کے کمرے میں
بٹھا دیا گیا، تھوڑی دیر بعد دروازے پر شور و غل کی
آوازیں آنے لگیں، حیدر عباس کی کزنز اس کا راستہ
رو کے نیگ کا مطالبہ کر رہی تھیں خوب ٹکرا رہی تھیں
آخر دس منٹ بعد حیدر نے ان کو ان کی مطلوبہ رقم دی تو
اسے کمرے میں آنے کی اجازت ملی، سب کے جانے
کے بعد حیدر عباس نے دروازہ لاک کیا اور کچھ دیر

کمرے کے وسط میں کھڑے رہے پھر بیڈ پر اس کے سامنے آن بیٹھے ام ایبھا کی ہتھیلیوں میں پسینہ اتر آیا اور اس کا دل دھڑک اٹھا، حیدر عباس نے اس کا گھونگھٹ الٹا اور اسے غور سے دیکھنے لگے، ام ایبھا نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں، لیکن حیدر کی طنزیہ آواز سن کر اس کی آنکھیں حیرت اور دکھ کی زیادتی سے پھیل گئیں حیدر کہہ رہے تھے۔

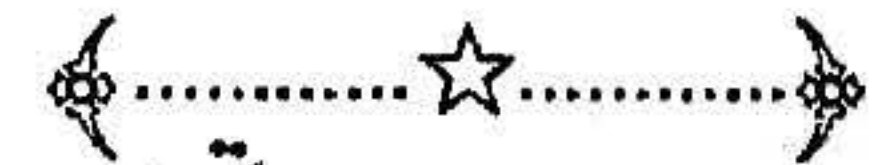
”تو آپ ہیں وہ ہستی جس نے میری ماں اور میرے بھتیجے کو اپنے خلوص کے جال میں پھنسا کر مجھ سے شادی کی ہے، کیا میں آپ کو عقل کا اندھا نظر آتا ہوں کہ میں آپ کی اس چال کو سمجھ نہ سکوں؟ آپ کیا سمجھتی ہیں کہ مجھے معلوم نہیں کہ جب امی اور ضرغام نے آپ کو یہ بتایا ہوگا کہ میں شادی کرنے پر اس لئے رضا مند نہیں ہوتا کہ پتہ نہیں آنے والی میرے بھتیجے کو برداشت کر پائے گی یا نہیں؟ تو آپ نے سوچا میں اسے ہی سیڑھی بنا کر اپنا مطلب پورا کر سکتی ہوں اور آپ نے ایسا ہی کیا؟ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا.....؟“ ام ایبھا اس الزام تراشی پر توہین کے احساس سے زرد ہو گئی اور دھیرے دھیرے لرزے لگی اس نے لب بھینچ کر اپنے آپ کو کچھ بھی کہنے سے روکا، حیدر عباس نے مزید کہا۔

”جائیے جا کر کپڑے بدلنے اور اس بات کو ذہن میں رکھئے گا کہ آپ اس گھر میں صرف میری ماں اور ضرغام کی ضد کی وجہ سے آئی ہیں اور ہاں اس بات کا تو اپنے دل میں خیال بھی مت آنے دیجئے گا کہ آپ کبھی حیدر عباس کے دل تک رسائی حاصل کر سکتی ہیں؟“ ام ایبھا اٹھی اور ڈریسنگ روم کا دروازہ پوری قوت سے بند کیا اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ ہر چیز جس نہس کر دے خود پر قابو پا کر اس نے اپنا زور اتارا، کپڑے بدلے اور منہ ہاتھ دھو کر کمرے میں آ گئی، حیدر عباس لباس تبدیل کر کے بیڈ پر پھیل کر لیٹ چکے تھے، ام ایبھا نے تکیہ اٹھایا اور صوفے پر لیٹ گئی، بے وقوفی کے احساس سے اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب رواں ہو گیا، رات نہ

جانے کس پہر اس کی آنکھ لگی، اچانک کسی کے زور سے ہلانے پر وہ ہڑبڑا کر اٹھی تو حیدر عباس کو اپنے سر پر کھڑے پایا وہ اس سے کہہ رہے تھے۔

”اٹھئے اور جا کر فریش ہو جائیے ناشتے کا بلاوا آیا ہے۔“ وہ جانے لگی تو بولے۔

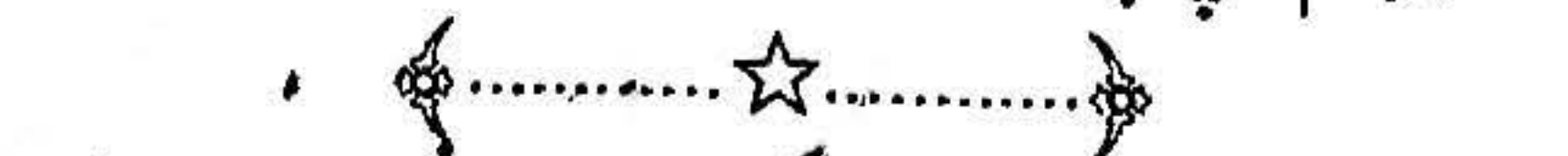
”اور سنیں! اس کمرے کی باتیں اس کمرے میں ہی رہنی چاہئیں ورنہ نتائج کی ذمہ دار آپ خود ہوں گی۔“ ام ایبھا کا دل چاہا ابھی کھری کھری سنا کر ان کی طبیعت صاف کر دے لیکن وہ مڑ کر واش روم میں چلی گئی۔



ویسے کے روز ام ایبھا پریشان تھی کہ نہ جانے حیدر عباس اس کے گھر والوں سے کیسا سلوک کریں لیکن وہ یہ دیکھ کر مطمئن ہو گئی کہ حیدر عباس اس کے گھر والوں سے بہت اچھے طریقے سے مل رہے تھے، ویسے کے بعد رسم کے مطابق ام ایبھا اپنے والدین کے گھر آ گئی، اگلے روز آنٹی، حیدر عباس اور ضرغام عباس اسے لینے آ گئے۔ گھر پہنچ کر ام ایبھا نے سب سے پہلے زیورات اور میک اپ سے نجات حاصل کی، اس کے بعد نسبتاً ایک ساڑھ سا جوڑا پہن کر آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر بالوں میں کنگھی کرنے لگی، اسی اثناء میں حیدر عباس کمرے میں آئے اور اس پر ایک سردی نظر ڈال کر واش روم میں چلے گئے، ام ایبھا نے سر جھٹکا، بالوں کو کچر لگایا اور لاؤنج میں چلی آئی، جہاں آنٹی اور ضرغام بیٹھے باتیں کر رہے تھے وہ بھی ان کے ساتھ شامل ہو گئی، تھوڑی دیر بعد حیدر عباس بھی وہیں چلے آئے، کچھ دیر گپ شپ کے بعد سب اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے تو وہ بھی اپنے کمرے میں چلی آئی، حیدر بیڈ پر لیٹ چکے تھے لہذا وہ تکیہ اٹھا کر صوفے پر لیٹ گئی۔

اگلے چند روز دعوتوں میں گزر گئے، اس کے بعد حیدر عباس نے آفس جوائن کر لیا، ام ایبھا نے نوکری چھوڑ دی تھی وہ پورا وقت اپنے گھر کو دینا چاہتی تھی وہ صبح

سورے اٹھ کر سب کا ناشتہ خود بناتی، حیدر کے آفس اور ضرغام کے کالج جانے کے بعد ماسی سے سارے گھر کی صفائی کرواتی اور کچھ وقت آنٹی کے ساتھ باتوں میں گزارتی اور پھر دوپہر کا کھانا بناتی، حیدر دوپہر کا کھانا کھانے گھر نہیں آتا تھا، لہذا وہ آنٹی اور ضرغام دوپہر کا کھانا اکٹھے کھاتے، شام کو جب ضرغام اکیڈمی سے واپس آتا تو وہ دونوں ڈھیروں باتیں کرتے، ٹی وی دیکھتے اور کبھی کبھار آکس کریم کھانے قریبی مارکیٹ تک پیدل ہی چلے جاتے، اب وہ ضرغام عباس سے پہلے کی نسبت زیادہ محبت کرنے لگی تھی اور اس کا ایک ماں کی طرح خیال رکھنے لگی تھی، وہ اس گھر میں ہر طرح سے ایڈجسٹ ہو چکی تھی اور ہر کسی کے دل میں اپنی جگہ بنا چکی تھی سوائے حیدر عباس کے، وہ ابھی تک اس سے روز اول کی طرح فاصلے پر تھے، ام ایبھا کو یہ چیز بہت دکھ دیتی تھی، وہ پریشان ہو کر اپنے اللہ سے دعا کرتی تھی کہ وہ حیدر عباس کے دل میں اس کی محبت ڈال دے، حیدر عباس کی بے رخی کے باوجود ام ایبھا کو ان سے محبت ہو چکی تھی اور اس کا دل بچوں کی طرح ہمک ہمک کر ان کے پاس جانے کی ضد کرتا تھا، لیکن حیدر عباس اس بات سے بے خبر تھے ان کی بے اعتنائی کے باوجود وہ ان کا ہر کام اپنے ہاتھوں سے کرتی تھی۔



ایک شام حیدر عباس گھر آئے تو انہیں بخار تھا، وہ اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گئے، آنٹی نے ام ایبھا کو بتایا تو وہ چائے اور بخار کی ٹیبلٹ لے کر کمرے میں گئی اور کہنے لگی۔

”یہ چائے اور ٹیبلٹ لے لیجئے۔“ انہوں نے کوئی جواب نہ دیا تو ام ایبھا نے دوسری بار اپنی بات دہرائی، نہ جانے حیدر عباس کو کیا ہوا وہ اٹھے اور دھاڑ کر بولے۔

”کیوں میرے سر پر سوار ہیں، جائیے یہاں سے میں یہ سب خود لے سکتا ہوں آؤٹ۔“ ام ایبھا کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں وہ یکدم مڑ کر کمرے سے

باہر نکل گئی، اس کی انا پر بہت گہری چوٹ پڑی تھی اس دن ام ایبھا نے خود کو بہت سمجھایا اور حیدر عباس کو ان کے حال پر چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ ام ایبھا پہلے ہی حیدر سے بہت کم بات کرتی تھی اب بالکل نہیں کرتی تھی، بلکہ اب وہ ان کے سامنے آنے سے بھی گریز کرتی تھی، رات کو اس وقت کمرے میں آتی جب وہ سو چکے ہوتے، لیکن اس سب کے باوجود وہ ان کی ہر ضرورت اور ہر چیز کا خیال رکھتی تھی، حیدر عباس اس کے اس رویے پر جربز ہو رہے تھے۔

جمعے کی شام کو ضرغام، ام ایبھا کو ٹینس کھیلنا سکھا رہا تھا لیکن اسے کھیلنا ہی نہیں آ رہا تھا، ضرغام کی صورت پر بے چارگی اور جھنجھلاہٹ دیکھ کر وہ گھاس پر بیٹھ گئی اور زور زور سے ہنسنے لگی، اسی وقت حیدر اپنی گاڑی سے اترے، انہوں نے ام ایبھا کو اس طرح ہنستے ہوئے دیکھا تو وہاں سے سیدھا لان میں آئے، انہوں نے ام ایبھا کا بازو پکڑ کر اسے جھٹکے سے اٹھایا اور اس پر برس پڑے۔

”یہ کیا جاہلوں کی طرح تہقہ لگائے جا رہے ہیں بجائے اس کے کہ آپ ضرغام کی تربیت کریں آپ اسے بگاڑ رہی ہیں۔ آپ بچی نہیں ہیں کہ سب باتیں آپ کو سمجھانا پڑیں، آئندہ میں یہ سب برداشت نہیں کروں گا، سمجھیں۔“ وہ اسے جھٹکے سے چھوڑ کر اندر کی جانب بڑھ گئے، وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی اور نیچے گر گئی، ضرغام بھاگ کر اس تک آیا اور گھٹنوں کے بل اس کے پاس بیٹھ گیا، دکھ اور احساسِ ندامت سے ام ایبھا گھٹنوں میں سر دے کر رونے لگی، ضرغام کچھ دیر اسے روتے ہوئے دیکھتا رہا پھر بولا۔

”آئی ایم سوری چاچی! پلیز چپ کر جائیے، اگر آپ یونہی روتی رہیں تو میں داد کو لے آؤں گا۔“ کچھ دیر رونے کے بعد اس نے گھٹنوں سے سر اٹھا کر اپنے آنسو صاف کئے اور اندر کی جانب بڑھ گئی، ضرغام کچھ سوچنے لگا۔

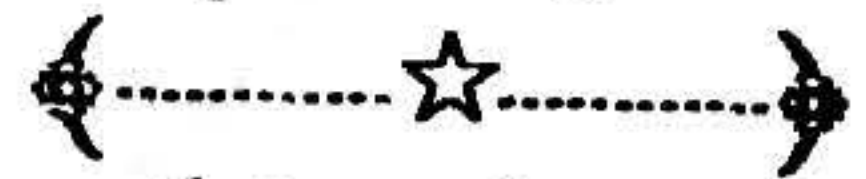
ام ایبھا رات کا کمانا تیار کرتے ہوئے آنکھوں

مجھے بہت افسوس ہے کہ تم میری اولاد ہو کر اس طرح کر رہے ہو اس سے تو بہتر تھا تم اس شادی سے انکار پر ڈٹے رہتے۔ حیدر عباس نے اپنی امی کے گلے میں بازو ڈال کر کہا۔

”ای! مجھے معاف کر دیجئے اب آپ کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔“ آنٹی بولیں۔

”مجھے نہیں اب ام ایسا کو تم سے کوئی شکایت نہیں ہونی چاہئے ورنہ میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔“

رات ام ایسا دو الے کر آنٹی کے پاس ہی لیٹ گئی اور تھوڑی دیر میں گہری نیند سو گئی حیدر عباس کافی دیر اس کا انتظار کرتے رہے آخر اٹھ کر اسے دیکھنے آئے تو اسے ای کے ساتھ سوتے دیکھ کر واپس چلے گئے۔



اگلی صبح حیدر عباس کے جانے کے بعد ام ایسا نے آنٹی سے دو دن کے لئے اپنی امی کے گھر جانے کی اجازت مانگی تو آنٹی نے اس کی طبیعت کے پیش نظر اجازت دے دی امی کے گھر آ کر ام ایسا کا موڈ بحال ہو گیا اور اس نے گھر والوں کو اپنے اور حیدر عباس کے جھگڑے کی ہوا بھی نہیں لگنے دی۔ شام کو حیدر عباس گھر آئے تو انہیں ضرغام باہر لان میں بیٹھالا اس وقت عمو نا ام ایسا بھی اس کے ساتھ ہی ہوتی تھی آج جب وہ نظر نہ آئی تو اس نے ضرغام سے پوچھا۔

”کیوں ابھی آج تمہاری پارٹنر کہاں ہیں؟“ ضرغام بولا۔

”اپنی امی کے گھر گئی ہیں۔“ حیدر عباس کو محسوس ہوا کہ کچھ دنوں سے ضرغام عباس اس سے بات نہیں کر رہا بلکہ اگر وہ خود کوئی بات کرتے تو اس کا جواب دے کر خاموش ہو جاتا تھا وہ جانتے تھے کہ وہ اس سے کیوں ناراض ہے اس لئے وہ اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئے اور بولے۔

”شہزادے..... کیا بات ہے اپنے چاچو سے ناراض ہو.....؟“ وہ چپ رہا تو حیدر عباس نے

شرمندہ سا بیٹھا تھا وہ اس سب کے لئے اپنے آپ کو ذمہ دار سمجھ رہا تھا کیونکہ اسی کی خند پر دادو نے حیدر عباس کی شادی ام ایسا سے کی تھی آنٹی نے اسے گرم دودھ پلا کر لیٹا دیا دوپہر تک وہ بخار میں جل رہی تھی مغرب کے وقت جا کر اس کی طبیعت تھوڑی بحال ہوئی تو وہ اٹھ کر لاؤنج میں آ بیٹھی آنٹی مغرب کی نماز پڑھ کر اس کے پاس آ بیٹھیں اور اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر اسے تسلی دی ام ایسا بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

”آنٹی! میں بہت شرمندہ ہوں کہ میں آپ کی امیدوں پر پورا نہیں اتر سکی میں پچھلے چھ مہینوں سے حیدر عباس کا رویہ برداشت کر رہی ہوں لیکن اب میں یہ سب برداشت نہیں کر سکتی کہ وہ بار بار مجھ پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ میں نے آپ اور ضرغام کو سیر می بنا کر ان سے شادی کی ہے آنٹی! خدا گواہ ہے میں نے ایسا کچھ نہیں کیا میں یہ سب کیسے کر سکتی تھی میں نے تو شادی سے پہلے اپنی سوچوں اور جذباتوں تک کو اپنے شوہر کی امانت سمجھ کر بہت سنبھال کر رکھا تھا اور کبھی اس میں خانت کرنے کا سوچا بھی نہیں تو پھر میں اس کام کے لئے کسی کو کیسے چھانسنے لگی تھی میں شادی کے بعد محبت کی قائل تھی اور میں اپنے اس دعویٰ میں سچی ہوں مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی عار نہیں ہے کہ میں اپنے شوہر سے دل و جان سے محبت کرنے لگی ہوں لیکن شاید ان کی محبت میرا نصیب نہیں ہے۔“ آنٹی نے اسے گلے سے لگالیا اور لاؤنج کے دروازے پر کھڑے حیدر عباس یہ سب سن کر خود کو ہواؤں میں اڑتا ہوا محسوس کر رہے تھے کہ انہیں اتنی خالص سوچ رکھنے والی شریک حیات ملی ہے اور اس کا اعتراف محبت سن کر ان کی مردانہ انا بھی سرخرو ہو گئی تھی اور چپ چاپ اپنے کمرے میں چلے گئے۔ رات کھانے کے بعد آنٹی نے ان کی خوب کلاس لی اور بولیں۔

”حیدر عباس! تم نے مجھے بہت مایوس کیا ہے تم اس بچی پر جو الزام لگا رہے ہو وہ میں سن چکی ہوں اور

جھنجھلائے ہوئے سے تھے اسی لئے چھوٹی چھوٹی باتوں کو بنیاد بنا کر ام ایسا کو ڈانٹنے لگے تھے۔ ساری رات جب بھی حیدر عباس کی آنکھ کھلی انہیں ام ایسا کی سسکیوں کی آواز سنائی دیتی رہی اگلی صبح ام ایسا ان کے کپڑے بند پر باہر رکھ کر جانے لگی تو حیدر عباس نے اسے بازو سے پکڑ کر اپنے سامنے کیا اور اس کی سوجی ہوئی سرخ آنکھوں میں دیکھتے ہوئے چبا چبا کر بولے۔

”آپ کیا سمجھتی ہیں اس طرح رو دھو کر آپ میرے دل میں جگہ بنالیں گی میں آپ کو اول روز ہی بتا چکا ہوں کہ حیدر عباس کے دل تک آپ بھی نہیں پہنچ سکتیں انڈر اسٹینڈ۔“ آج ام ایسا کی برداشت بھی جواب دے گئی اس نے ایک جھٹکے سے اپنا بازو حیدر عباس کی گرفت سے چھڑوایا اور روتے ہوئے چلا کر بولی۔

”کیا چاہتے ہیں آپ؟“ کیوں میرے ساتھ ایسا کر رہے ہیں.....؟ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ میں آپ پر مرثی تھی؟ تو آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ مجھے تو یہ تک معلوم نہیں تھا کہ ضرغام کے چچا شادی شدہ نہیں ہیں اور نہ ہی میں آپ سے کبھی ملی تھی آنٹی اپنی رضامندی سے میرے والدین کے پاس گئی تھیں اس میں میری کسی کوشش کا عمل دخل نہیں تھا اس بات کی تصدیق آپ آنٹی اور ضرغام دونوں سے کر سکتے ہیں اگر مجھے اس بات کی بھٹک بھی پڑ جاتی کہ آپ اس شادی کے لئے رضامند نہیں تھے تو میں خود انکار کر دیتی اور رہی آپ کے دل تک پہنچنے کی بات تو مجھے کوئی ایسا شوق نہیں ہے سمجھئے آپ یہ تو آنٹی اور ضرغام کی محبتیں ہیں جو میں اب تک یہاں رو رہی ہوں لیکن اب میں آپ کے ہاتھوں مزید ذلیل نہیں ہو سکتی۔ ابھی وہ کچھ اور بھی کہتا چاہ رہی تھی کہ آنٹی ایک دم دروازہ کھول کر اندر آئیں اور حیدر عباس پر ایک ناراض نظر ڈال کر ام ایسا کے کندھے پر بازو رکھ کر اسے باہر لے گئیں۔

ام ایسا کا رورو کر رہا حال تھا ضرغام اس کے پاس

میں بار بار بھر جانے والے آنسوؤں کو بڑی مشکلوں سے پیچھے دھکیل رہی تھی لیکن پھر بھی کچھ آنسو اس کے گالوں پر پھسل رہے تھے جنہیں وہ بار بار صاف کر رہی تھی حیدر عباس پانی پینے کچن میں آئے تھے اور اسے یوں روتے دیکھ کر واپس اپنے کمرے کے حیدر کے آنے اور جانے سے بے خبر رہی حیدر ٹی وی لاؤنج میں جا بیٹھے ضرغام بھی اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا اور کہنے لگا۔

”چاچو! مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔“ حیدر اس کی طرف متوجہ ہوئے اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”چاچو! آج آپ نے چاچی کے ساتھ بالکل اچھا سلوک نہیں کیا۔“ حیدر نے تیوری چڑھا کر پوچھا۔

”کیا مطلب.....؟“ لیکن مقابل بھی انہی کا بھیجا تھا کہنے لگا۔

”مطلب یہ کہ شام کو آپ کو چاچی کے ساتھ اس طرح بی ہو نہیں کرنا چاہئے تھا ان کا کوئی قصور نہیں تھا میں ہی انہیں زبردستی بیٹھ کھانا کھا رہا تھا ان سے بار بار کوشش کے باوجود صحیح ہٹ نہیں لگ رہی تھی اسی بات پر وہ ہنس رہی تھیں لیکن مجھے سمجھ نہیں آئی کہ آپ کو آخر ہوا کیا تھا آپ نے انہیں اتنی بری طرح ڈانٹ دیا آپ کو ان سے سوری کرنا چاہئے۔“ ضرغام یہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا اور جاتے جاتے پلٹ کر بولا۔

”آپ نے ہی مجھے یہ سکھایا ہے کہ اپنی غلطی کی معافی مانگنا بہادروں کا کام ہے امید ہے آپ اپنی اس بات پر خود بھی عمل کریں گے۔“ اب حیدر عباس ضرغام کو کیا بتاتے کہ انہیں کیا ہوا ہے؟ وہ خود اپنی اس بدلتی ہوئی کیفیت پر حیران تھے پہلے جب ام ایسا ان کا بہت دھیان رکھتی تھی تو بھی انہیں برا لگتا تھا اور اب جب وہ انہیں نظر انداز کر رہی تھی تو بھی یہ سب ان سے برداشت نہیں ہو رہا تھا وہ عجیب مشکل میں گرفتار تھے ام ایسا نے آہستہ آہستہ ان کے دل پر قبضہ جمالیا تھا اور وہ یہ بات تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھے اور اس حقیقت پر

مسکراہٹ ہونٹوں میں دبا کر کہا۔

”یار! اگر میں تمہاری چاچی کو منالوں تو یہ ناراضگی ختم ہو سکتی ہے.....؟“ ضرغام عباس نے حیرت اور خوشی سے سراٹھا کر حیدر عباس کو دیکھا اور اثبات میں سر ہلادیا تو حیدر بولے۔

”چلو! پھر تمہاری چاچی کو لینے چلتے ہیں۔“ ضرغام بولا۔

☆.....☆.....☆

”لیکن وہ تو دو دن کا کہہ کر گئی ہیں۔“ حیدر بولے۔
”چلو تو سہی ہم انہیں آج ہی لے آئیں گے۔“
رات کے آٹھ بج رہے تھے ام ایبھا عشاء کی نماز پڑھ کر فارغ ہوئی تو امی نے بتایا۔

”حیدر عباس اور ضرغام عباس تمہیں لینے آئے ہیں وہ بتا رہے ہیں کہ ضرغام کی دادی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور وہ تمہیں بلارہی ہیں۔“ بات ہی ایسی تھی کہ ام ایبھا فوراً چلنے کو تیار ہو گئی گاڑی میں خاموشی تھی جب ضرغام عباس بولا۔

”چاچو! اب آئیں کریم تو کھلا دیں پلیز.....“
حیدر عباس نے گاڑی آئیں کریم پارکر کے سامنے روکی تو ضرغام عباس نیچے اتر کر آئیں کریم لینے چلا گیا حیدر عباس نے اپنے برابر بیٹھی ام ایبھا کو غور سے دیکھا جو کسی سوچ میں گم باہر دیکھ رہی تھی۔ گھر آ کر حیدر اپنے کمرے میں چلے گئے اور وہ آنٹی کے کمرے میں ان کی طبیعت پوچھنے آ گئی اور انہیں ٹھیک ٹھاک دیکھ کر حیران ہوئی لیکن بولی کچھ نہیں کمرے سے باہر آ کر وہ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھ گئی ضرغام بھی اس کے پاس بیٹھ گیا اور بولا۔

”چاچی! یہ میرا اور چاچو کا پلان تھا آپ کو واپس لانے کے لئے اور پلیز چاچو آپ سے اپنے رویے کی معافی مانگیں تو انہیں معاف کر دیجئے گا۔“ ام ایبھا حیران ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگی کہ یہ کیا کہہ رہا ہے اس سے پہلے کہ وہ اس سے کچھ پوچھتی وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا اب اکیلا بیٹھنا بے کار تھا سو وہ بھی

اپنے کمرے میں چلی آئی۔

حیدر عباس کوئی کتاب کھولے بیٹھے تھے ام ایبھا نے ان کی سائیڈ سے تکیہ اٹھایا اور صوفے پر لیٹ کر بازو اپنی آنکھوں پر رکھ لیا حیدر عباس نے ایک نظر اسے دیکھا کتاب سائیڈ پر رکھی اٹھے اور صوفے کے پاس جا کر اسے زبردستی اٹھا کر صوفے پر بٹھا دیا اور خود بھی اس کے ساتھ بیٹھ گئے ام ایبھا اس حرکت پر بہت جزبز ہوئی اور منہ دوسری طرف کر کے ان سے دور ہونے کی کوشش کی۔

”ام ایبھا! ادھر دیکھو۔“ وہ ان کے پکارنے کے انداز پر چونکی ضرور لیکن اس نے وہاں سے اٹھنے کی کوشش کی جس پر حیدر عباس نے اس کا بازو تھام کر دوبارہ بٹھا دیا اور یہ شعر پڑھا۔

”کون پکارے گا یوں تجھ کو دیکھ نہ جا
دل کی اک اک دھڑکن تیرا نام ہوئی“
حیدر عباس نے اس کے شانوں پر بازو رکھا اور بولے۔

”پلیز معاف کر دو۔“ ام ایبھا نے ایک نظر انہیں دیکھا اور پھر دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رونے لگی حیدر عباس نے اسے کھل کر رونے دیا ام ایبھا چپ ہوئی تو وہ کہنے لگے۔

”معاف کر دیا ہے نا مجھے.....؟“ ام ایبھا نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلا کر اپنے آنسو صاف کئے حیدر عباس شرارتی انداز میں کہنے لگے۔

”اچھا تو آپ کو اپنے شوہر سے محبت ہو گئی ہے نا.....؟“ ام ایبھا نے گھبرا کر دوبارہ وہاں سے اٹھنے کی کوشش کی لیکن حیدر عباس نے اس کی اس کوشش کو ناکام بنادیا اور بولے۔

”تو تیں جناب..... آپ کے شوہر نامدار آپ کے سامنے ہیں اپنی محبت کا عملی مظاہرہ کیجئے۔“ ام ایبھا شرم سے سرخ ہو کر انہی کے سینے میں منہ چھپا گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

انعم خان

قسط نمبر 14۔

مکمل ناول

السی دلی میں دلی

”کیوں.....؟“ ادینہ بے یقین ہوئی۔
”شکر ہے“۔ جبکہ مہ روش سنتے ہی دل میں شکر بجالائی۔

”آفس میں کام بہت ہے اور تم جانتی ہو کام میں مجھے کوتاہی برداشت نہیں، ویسے بھی بکواس لگتا ہے یہ سب مجھے ٹائم اور پیسے کا زیاں ہے۔“ توجہ ڈرائیونگ پر رکھے وہ صاف بولا۔ ادینہ نے حیرانگی سے اُسے پھر مہ روش کو دیکھا۔
”مجھ ہی دن کی تو بات ہوگی مراد“۔ ادینہ نے آہستگی سے کہا۔ جرح مراد کو پسند نہ تھی۔
”فائدہ کیا ہے اس سب کا تم بتاؤ مجھے؟“
”فائدے کی بات اس میں کہاں سے آگئی تھوڑی آؤ تنگ ہو جائے گی“۔ ادینہ بری پھنسی تھی پوچھ کر بے نکاسا جواز دیا۔ ماہی جسے ہنی مون پر جانے میں قطعاً کوئی دلچسپی نہیں تھی شانت سی بیٹھی رہی۔
”مجھے قطعاً کوئی شوق نہیں ہے گھومنے پھرنے کا نہ مہ روش کو ہونا چاہیے ویسے بھی شادی میں کافی فنکشنز تھے میری تو اب تک تھکاوٹ بھی نہیں اتری“۔ اس کا ارادہ سرے سے جانے کو نہیں تھا۔
”ہاں ادینہ! میں بھی نہیں جانا چاہتی ویسے بھی ساری جگہیں تو دیکھی ہوئی ہیں“۔ ماہی نے بھی گویا انکار کیا۔
”تم دونوں بھی عجیب ہو بٹ جیسے تم دونوں کی مرضی اب میں کیا کہہ سکتی ہوں“۔ ادینہ نے بھی بات سمیٹنی مناسب سمجھی۔



کے ساتھ جیسا کرے گا ویسا ہی تمام عمر کاٹے گا، مجھ میں اور تمہارے بھائی میں کوئی فرق نہیں ہاں البتہ اس نے بویا تھوڑا تھا مگر اب کاٹے گا زیادہ۔“ مراد کے لہجے میں کچھ نام کو نہ تھی۔ اب کے مہروش وقار کے مسلسل ذکر سے بیزار ہوئی۔

”آپ اپنا کھیل اپنے طریقے سے جاری رکھیں، نہ میں کہیں بھاگی جارہی ہوں نہ ہی میرا بھائی۔ آپ کا انتقام میری بے بسی کو اتنا بے بس نہیں کرے گا کہ میں آپ سے اچھے کی امید کروں، میں کبھی آپ کے سامنے نہیں روؤں گی نہ اپنی وجہ سے کسی کو مجبور کروں گی کہ وہ میرے لیے آپ کے سامنے جھکے۔“ سنجیدگی سے کہتی آخر میں وہ دل ہی دل میں اس سے مخاطب ہوئی تھی اور پھر بہری بنی باقی تمام راستے لب سینے خود کو باہر محو کیے رہی البتہ مراد منصور اپنی عادت سے مجبور اسے سنانے میں مصروف رہا۔

☆.....☆.....☆
اس کا عزم ناکام ہو چکا تھا۔ سوچیں گہرے قفل کے باوجود مسلسل منتشر ہوتی جارہی تھیں اسے بے بس کرنے، علی کی یادیں ہر وقت اس کے تعاقب میں رہتیں۔ اس کے ہر ارادے کو مات دینے کے لیے بے قرار رہتیں اور وہ لاکھ جدوجہد کے باوجود تھک ہارسی جاتی تھی۔
”پلیز علی.....!“

فری پیریڈ میں اسکول کے لان کے تنہا گوشے میں بیٹھے اس نے سر کو دونوں ہاتھوں میں لیتے ہوئے گویا علی کے تصور سے استدعا کی تھی جو گزرے ہر لمحے کے ساتھ اس کے ذہن پر حاوی ہوتا جا رہا تھا۔
”کیوں نہیں چھوڑ رہے تم میرا پیچھا..... کیوں تنگ کر رہے ہو مجھے، میں تمہیں سوچنا نہیں چاہتی۔ میرا تم سے کوئی واسطہ نہیں رہا پھر کیوں مجھے ماضی میں قید کرنا چاہ رہے ہو۔“ اس کے سر میں درد کی شدید لہریں اٹھ رہی تھیں۔ کسی سے اس بارے میں شیئر بھی نہیں کرنا چاہتی تھی اور نہ اکیلے اس عجیب ہوتی صورتحال سے نمٹ پارہی تھی۔
”بے شک مجھے تمہیں فریب نہیں دینا چاہیے تھا۔“ اندر ہی اندر وہ اعتراف کرنے لگی مگر یہ اعتراف وہ محض اپنی جان چھڑانے کے لیے کر رہی تھی۔ اسے ذہنی سکون چاہیے تھا جو تین ماہ سے نہیں ملا تھا۔
”میں جانتی ہوں کہ تمہارے بے لوث جذبات کو میرے جھوٹے محبت کے نائک سے ٹھیس پہنچی ہے مگر میں مجبور تھی..... کیسے بتاتی میں تمہیں۔ میرے بتانے پر تم کبھی اپنے قدم پیچھے نہ لیتے۔ جو ہوا وہ گزر گیا ہے اور گزرا ہوا وقت راہیں جدا کر دیتا ہے۔ پھر تم کیوں میرے تعاقب میں ہو۔ ہماری راہیں شروع سے جدا تھیں۔“

معلوم نہیں مستشرقہ، علی آیا ان کو سمجھا رہی تھی یا خود کو تسلی دے رہی تھی البتہ محو حیرت تھی کہ اس کے تصور کا ہر فیصلہ دماغ سے قبولیت کی سند لیتا دل کی طرف سے رد کیوں کیا جا رہا تھا۔ کیا اس کا دل دماغ سے اختلاف رکھنے کی وجہ سے مسلسل اس کی ناکامی کی وجہ بن رہی تھی یا شاید اس کا دل دماغ سے بدلہ لے رہا تھا۔
وہ عجب صورتحال میں پھنسی دل دماغ کے چکر میں نئے سرے سے گھن چکر بنی۔ ایک مرتبہ پھر بہت سے سوال اس سے جواب کے منتظر تھے۔ دماغ کے الجھاؤ کے باوجود کیوں اس کا دل شانت تھا.....؟

کیا اس کا دل دماغ کی بے سکونی پر شاد علی کی یادوں کی روانی پر مطمئن ہو کر بے خبر رہنا چاہتا تھا.....؟
کیا اس کا دل اس لیے دماغ کی بھرپور نفی میں سرگرداں تھا کہ علی کو فریب دے کر محبت کی راہوں سے پیچھے ہٹانے کے فیصلے پر اسے نظر انداز کر کے محض دماغ کی رائے مانی گئی تھی۔
اور اب دل دماغ کے اسی فیصلے کے غلط ثابت کرنے پر مصروف تھا۔

آدھے گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد مراد نے گاڑی ادینہ کے گھر کے سامنے روکی۔ ادینہ کے ساتھ وہ اندر تو نہیں جانا چاہتا تھا مگر ساتھ میں سامان وغیرہ زیادہ تھا سو ماہی کو گاڑی میں ہی چھوڑ کر سامان اٹھائے اندر گیا۔ پھپھو کو دور سے ہی سلام کیا اور الٹے قدموں واپس آ گیا۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی پہلی نظر ماہی پر ڈالی جس نے اس کی آمد پر خاص توجہ نہ دی تھی۔

”دل کے ارمان آج دل میں ہی دبائے پڑے تمہیں؟“ گاڑی اشارت کرتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔ مانی مون ٹرپ پر اس نے جان بوجھ کر جانے سے انکار کیا تھا، مقصد ماہی کے جذبات پر وار تھا مگر وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ ماہی کے تمام احساسات و جذبات اس نے شادی کی پہلی رات ہی اپنی سفاکیت سے چل ڈالے تھے اب شاید وہ مراد سے متعلق کوئی خاص جذبہ دل میں نہیں رکھنا چاہتی تھی۔
”مجھے ایسا کوئی ارمان نہیں تھا۔“

”کمال ہے، خود سے زیادہ چاہا ہے تم نے مجھے، پھر بھی نہیں تھا؟ تعجب ہے من چاہے شوہر کے ساتھ بھی تمہارے ارمان سوئے ہوئے ہیں۔“ ماہی کے منہ سے اگلوائے جملے کو ذہن میں رکھے وہ طنز سے باز نہ آیا۔ وہ لب بھنجے باہر دیکھنے لگی۔ اس لمحے مراد سے اعتراف محبت اسے اپنی زندگی کی سب سے بڑی حماقت لگی۔
”دل تو تمہارا بہت چاہتا ہوگا کہ سب کے سامنے چیخ چیخ کر مجھے برا بھلا کہو اپنی بے چارگی ظاہر کرو۔“ وہ پھر سے بولا تھا۔

”یہ آپ کی غلط فہمی ہے، میں ایسا کچھ نہیں کروں گی۔“
”کب تک ڈیر! آخر کب تک؟“ وہ لطف اندوز ہوا۔
”جب تک ہونسکا۔“

”چلو دیکھتے ہیں تمہاری برداشت کی حد کہاں تک ہے۔“ وہ چیلنج پر اتر آیا۔
”برداشت کی حد جہاں تک بھی ہوئی مگر ایک بات تو طے ہے، اپنے عمل کو زبان آپ خود دیں گے۔“ ماہی بنا کسی سوچ یا مستحکم ارادے کے برجستہ بولی۔
”پاگل سمجھا ہے مجھے۔“ وہ تمسخرانہ ہنسا۔

”نہ میں اپنے ماں باپ کو اپنی وجہ سے کوئی دکھ دوں گی نہ آپ کی وجہ سے اپنے بھائی کو ان کی نظروں میں گر بنے۔“
دووں کی وقار بھائی میرے لیے ہر صورت قابل محترم ہیں۔“ ماہی نے اسے چڑانے اور غصہ دلانے کے لیے مضبوط آواز میں وقار کا ذکر کیا۔

”ایک بات بتا دوں میں تمہیں، میرا بے بہت برا ہے، جس شخص سے مجھے نفرت ہو اس کے ساتھ میں اس سے جڑے رشتوں کو بھی نہیں بچتا۔“ مراد نے جواباً ٹھہرے ہوئے لہجے میں اسے ڈرانا چاہا۔
”اب مجھے پرواہ نہیں۔“ ماہی کا لہجہ آج مضبوط تھا۔ نڈر آواز میں بولتی بے خوف انداز میں کندھے اچکائے۔
گاڑی سست روی سے مین روڈ پر دوڑ رہی تھی۔

”تمہیں پرواہ ہونی چاہیے، تم وقار کی بہن ہو۔“ وہ تلخ ہوا۔
”اس میں میرا کوئی قصور ہے نہ میں اپنے بھائی کو قصور وار سمجھتی ہوں، مجھے تقدیر کے لکھے پر انسان کے فیصلے سے زیادہ یقین ہے، انسان بدلہ لے سکتا ہے لیکن تقدیر کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔“
”بولتی اچھا ہو تم مگر بے کار مجھے ایسی باتوں سے کوئی غرض نہیں۔ یہ دنیا مکافات عمل کے گرد گھومتی ہے، جو جس

گزرنا ہوا تو مجبوراً اسے آواز دی۔

”ارم!“ آواز پر وہ مڑی اور اس کے قریب چلی آئی۔

”تم فری ہوا بھی؟“ مستبشرہ نے سوالیہ پوچھا۔

”ہاں کیوں؟“ وہ بولی اور اسے دیکھتے ہوئے مزید اضافہ کیا۔

”تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی کیا ہوا ہے؟“ ارم نے بلند آواز لگاتے ہوئے پوچھا۔ مسلسل سوچنے سے

مستبشرہ کا چہرہ واقعی الجھن آمیز تاثر دے رہا تھا۔

”سر میں بہت درد ہے اسی لیے تمہیں بلایا کہ پلیز اگر تم فری ہو تو میری کلاس لے لو“ نیاس نے کہا۔

”کیوں نہیں ضرور..... تم یہاں بیٹھو میں جاتے ہوئے نواسے کہتی جاؤں گی کہ تمہارے لئے چائے لے آئیں

اور باقی پیریڈز کی بھی فکر مت کرنا میں یا ماریہ جو بھی فری ہوئی تمہارا پیریڈ لے لے گی۔“ ارم نے خالص دوستانہ انداز

میں کہا تو مستبشرہ تشکر سے مسکرائی۔

”تھینک یو سوچ!“

جواباً ارم نے ایک پیاری سی اسمائل اس کی طرف پاس کی اور چلی گئی۔ مستبشرہ نے اس کے جانے کے بعد ریلیکس

ہو کر بیٹھنا چاہا مگر پُرسوج انداز میں۔

”مجھے کسی کی نظروں میں نہیں آنا، اماں تو مجھے یوں گم صم پریشان دیکھ کر ضرور مجھ سے وجہ پوچھیں گی میں انہیں پھر

کیسے قائل کروں گی انہیں تو ویسے بھی میری صحت کی فکر رہتی ہے میری نیچنگ انہیں میری ڈسٹرکشن کی وجہ لگے گی اور

میں نہیں چاہتی کہ وہ پریشان ہوں مجھے کمزور نہیں پڑنا۔ اماں اور بابا کی نظروں میں علی کے ہاتھوں مشکوک نہیں بن سکتی

میں نہ علی کو خود پر حاوی رکھ کر اپنی زندگی کا سکون داد پر لگا سکتی ہوں محض علی کی یاد مجھے دل سے نکالنی ہے پھر میں اسے

سوچوں گی بھی نہیں۔“ ایک اور عزم خود سے کرتی وہ شانت ہونے کی سعی کرنے لگی مگر شاید..... نہیں بلکہ یقیناً علی کی یاد

دل سے نکالنے کا عزم اس کے لیے نہایت مضبوط مگر دراصل بہت کمزور تھا اس کے شعور پر مکمل طور پر واضح ہونے

سے قبل علی کی یادیں اس کے دل میں بسیرا کر چکی تھیں جن سے چھکارا اب اس کے بس کی بات نہ تھی۔

پُر فریب محبت کا نائیک تین ماہ بعد پُرسوجر انداز میں چھاننے لگا تھا۔

☆.....☆.....☆

”اب تک کتنی نفرت کرنے لگی ہو مجھ سے؟“ مہروش کے ہاتھ سے چائے کا کپ لیتے ہوئے اس نے بغور اسے

دیکھا ساتھ ہی سوال داغا، کلثوم بیگم محلے میں کسی کی عیادت کو گئی ہوئی تھیں مراد لان میں بیٹھا تھا اور اب چائے کا

کپ لیتے ہوئے جواب طلب نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا مہاشی نے کچھ پل کو اسی کے انداز میں اُسے دیکھا فرار کا

کوئی ارادہ اب وہ بھی نہیں رکھتی تھی ہاں جواب دے کر مراد منصور کے کھیل میں برابر ساتھ ضرور دے رہی تھی۔

”جتنی آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں۔“

”یعنی دیوانگی کی حد تک!“ وہ محظوظ ہوتا ہوا۔

”آپ نے بہت بڑی غلطی کی ہے۔“ جیسی وہ بولی۔

”تم سے شادی کر کے..... یا..... انتہا کی محبت کر کے۔“ غیر سنجیدہ انداز میں سوال مراد کے استفہامیہ لہجے سے

ملاپ کرتا مہاشی سے پوچھا گیا۔

”اپنی اعلیٰ ظرفی پر پردہ ڈال کر۔“ تیسرے ہفتے وہ سنبھل چکی تھی تحمل سے معنی خیز انداز اپنایا۔

رداؤ انجسٹ [197] جولائی 2012ء

”اگر تھا تو کیوں تھا.....؟“

”یوں تو وہ خود بے قرار رہ سکتا ہے؟“

مستبشرہ جمال نے کوئی تسکین بخش جواب نہ پایا تو خود پر بھگ گئی۔

”کیا ہوتا جا رہا ہے مجھے؟“ ناگجی میں بیٹھ کر ہنسی ہوئی وہ نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبائے غیر مرئی نقطے کی طرف

دیکھنے لگی جیسی ایک جملہ سماعتوں سے دھماکا بن کر نکرایا۔ اس کے کان سائیں سائیں کرنے لگے۔ کان میں ابھرتی

آواز اس کی دو سنبھلنے والی تھی۔

”کہیں ایسا نہ ہو کہ کل تمہیں اپنے دماغ کے اس فیصلے کی وجہ سے اپنے دل کے لیے پچھتانا پڑے۔“ مہاشی کے

تب کے دوستانہ لہجے میں کچھ بات نے مستبشرہ کو اس لمحے بری طرح جھنجھوڑ کر سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر شاید کچھ دیر پہلے

ذہن میں ابھرتے دل دماغ کے اختلافات میں پھنسے سوالات کے جواب جاننے کی راہ دکھا کر اُسے حواس باختہ

کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ بھنویں سکیر کرفنی میں سر ہلاتی وہ بے یقین تھی۔

”ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔“ وہ ماننے سے انکاری ہوئی۔

اگر یہ انکشاف تھا تو اس کے لیے بہت برانا قابل ستائش تھا اگر یہ سچ تھا تو اس کی ہارتھی۔ اس کی تمام تر جدوجہد

کی ناکامی تھی فسانے کی حقیقت تھی تو پھر مستبشرہ جمال کی بے یقینی لازم تھی۔ اپنے ہی کھیل میں بازی خود پر اٹلتے وہ

برداشت کیسے کرتی..... محبت اس کے دل کا روگ نہ تھی پھر اعتراف محبت کیسے کرتی۔

”نہیں..... میرے ساتھ ایسا نہیں ہو سکتا، یہ سنگین مذاق میزی تو ہیں نہیں کر سکتا، ایسا ہو ہی نہیں سکتا، میں پیچھے مڑ کر

دیکھنے والوں میں سے نہیں ہوں۔ میں نے بابا جان کا اعتبار ملتان واپسی تک نہیں ساری عمر خود پر سلامت رکھنا

ہے..... علی میری زندگی میں کسی صورت تمہاری منجائش نہیں نکلتی۔“ بیچ سے اٹھ کر وہ باقاعدہ نفی میں سوچتی چھوٹے

چھوٹے چکر کاٹتی اپنے اندر لچک لانے کا قطعاً کوئی ارادہ نہیں رکھتی تھی مگر ایسے میں شاید بہت سی چیزیں اور باتیں اس

کے خلاف اس کی راہ فرار میں روڑے اٹکانے کے لیے مسلسل تنگ و دو کر رہی تھیں۔

”میری یادیں تمہارا سکون تباہ کر دیں گی۔“ یہ علی کا جملہ تھا۔ اس کی کرب میں بھیگی آواز مستبشرہ کو اپنے بے حد

قریب سنائی دی۔

کیا واقعی..... علی کا کہا سچ ہو رہا تھا۔ مستبشرہ اپنا سکون کھوئے جا رہی تھی مگر اسے تو علی سے نہ تپ لگاؤ تھا نہ اب۔

پھر اس بے سکونی کی وجہ..... پچھتاوا تھا..... مگر نہیں..... اسے اب بھی اپنے کیے پر کوئی پچھتاوا نہیں تھا وہ اپنے حق

بجانب ہونے پر اب بھی قائم محض چھٹکارے کی خواہاں تھی تو پھر یہ سب کیا ہو رہا تھا؟ اس کی بے قراری کیوں بڑھتی جا

رہی تھی کیوں اس کا دماغ سوچوں پر مضبوط قفل ڈالنے میں ناکام ہو رہا تھا۔

”کہیں اس سب کی وجہ اس کا دل تو نہ تھا؟“

جہاں بناء اسے خبر ہوئے کچھ نہ کچھ بدلتا جا رہا تھا کیا اس کے جذبات دھیرے دھیرے اس سے بغاوت پر آمادہ

ہوتے جا رہے تھے کیا اس کے احساسات علی کا خط پڑھنے کے بعد کچھ بہت خاص محسوس کرنے لگے تھے؟

”نہیں!“ مستبشرہ نے دل ہی دل میں چیختے ہوئے کھلے بالوں کو جوڑے کی شکل دی۔ اب کے اسے دماغ کی ہر

بات پُرسوج ہر فیصلہ میلوں دور ہوتے دکھائی دیئے۔ دھیان تھا تو صرف دل کی طرف مائل جیسی تھیری چکر اگر گرنے

کو ہوئی مگر اس سے پہلے کہ وہ کسی حتمی نقطے کو صحیح یا غلط قرار دیتی پیریڈ اور ہونے پر بھتی زور دار گھنٹی اسے باہر کی دنیا میں

واپس لائی۔ اسے اپنا سر بھاری ہوتا محسوس ہوا۔ پیریڈ لینے کو ذرا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ کچھ ہی پل میں قریب سے ارم کا

رداؤ انجسٹ [196] جولائی 2012ء

بے تاب گزرتا ہو، بیٹے کا انداز اور مہ روش کے لیے پیار دیکھ کر کلثوم بیگم نہال سی ہو جاتیں۔
 ”شکر ہے اب یہ بھی زیادہ تر خوش رہتا ہے اللہ تم دونوں کو یونہی شاد و آباد رکھے، مراد کے غصے کو کم کرے، تم دونوں سدا خوش رہو مجھے اور کیا چاہیے۔“ جس کا اظہار وہ مہ روش کے سامنے کرتیں تو وہ ان کے سامنے مسکراتی۔
 دن ایک ایک کر کے گزر رہے تھے۔ مہ روش نے ایک دو دفعہ امی کی طرف رہنے کی بات مراد سے کلثوم بیگم کے سامنے کی مگر وہ اپنے ہی انداز میں اسے روک گیا۔

”کچھ دن رک جاؤ، ابھی مہمان بھی آ جا رہے ہیں اور بائیس سال ماموں کے یہاں گزارے ہیں تم نے، یہاں ایک مہینہ ہوا ہے ابھی، ہمیں بھی اپنی خدمت کا موقع دو، کیوں ای؟“ انداز ہلکا پھلکا، لہجہ مسکراتا تھا۔
 ”کچھ دن بعد چلی جانا، میں اتنا ظالم تو نہیں کہ تمہیں روکوں گا۔“ بات جاری رکھتے ہوئے بولا، ماہی اس کی دغلی، جھوٹی باتوں اور محبت بھرے انداز پر دل ہی دل میں سوچ کر رہ جاتی۔

”کاش..... میں ابھی کے ابھی آپ کے چہرے سے اچھائی و محبت کا نقاب اتار سکوں، آپ کا اصلی روپ کم از کم پھپھو کے سامنے لاسکوں۔“

”ہاں بیٹا! کچھ دن بعد چلی جانا، اب ہمیں بھی تمہاری عادت سی ہو گئی ہے۔“ پھپھو نے بھی بیٹے کی بات پر یہی کہنا مناسب سمجھا۔

”پھپھو! جیسے آپ چاہیں۔“ وہ اتنا ہی بولی۔

چار پانچ دن گزرے تو پریشے کی کال آئی۔

”کیسی ہو پریشے بیٹا؟“

”میں ٹھیک ہوں پھپھو! آپ کیسی ہیں؟“

”اللہ کا شکر ہے بیٹا! ٹھیک ہوں، سعید بھائی کیسے ہیں؟“

”ابو بھی ٹھیک ہیں، پھپھو! ماہی کو کچھ دنوں کے لیے بھیجیں ناں۔ سب اسے بہت یاد کرتے ہیں اور پکچرز بھی Develop ہو کر آ گئی ہیں، میں نے اسے بتایا بھی تھا کہ آ کر دیکھے۔“ وہ فوراً ہی اصل مدد کی طرف آئی تھی۔

”کیوں نہیں بیٹا! میں مراد سے کہوں گی وہ ماہی کو تمہاری طرف کچھ دنوں کے لیے چھوڑ آئے گا۔“ انہیں بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔

”تھینک یو سوچ پھپھو! وہ خوشی سے گنگنائی۔“

”مہ روش کہاں ہے اس وقت اس سے بات ہو سکتی ہے؟“

”میں ابھی اسی کی طرف سے آرہی ہوں، اس کے سر میں درد تھا ابھی ٹیبلٹ وغیرہ دی ہے اسے آرام کر رہی ہے، کہو تو اسے بلا لاتی ہوں۔“ انہوں نے بتایا۔

”نہیں پھپھو! پھر رہنے دیں، ویسے بھی اب آئے گی تو پھر کر لوں گی اس سے ڈھیر ساری باتیں۔“ اس نے منع کیا۔

”چلو ٹھیک ہے۔“ وہ ہنسیں۔

”اچھا پھپھو! اب میں فون رکھتی ہوں اللہ حافظ۔“ پریشے نے نفیسہ بیگم کے بلانے پر اجازت چاہی۔

”اللہ حافظ بیٹا۔“ الوداعی کلمات کے بعد انہوں نے ریسور کریڈل پر واپس رکھا۔ شام کو جب مراد گھر آیا تو انہوں نے پہلا کام یہی کیا اسے ماہی کو لے جانے کے لیے کہا۔

”مطلب.....؟“ مراد نے چائے کا سب لیتے ہوئے سوالیہ اسے دیکھا۔

”چار دیواری میں وار آپ کے غصے کو کم کر سکتا ہے نہ آپ کو آپ کے مقصد میں کامیابی دلا سکتا ہے۔“ وہ دو ٹوک بولی۔

”تم نے کیا مجھے پاگل سمجھ رکھا ہے جو میں خود کو سب کی نظروں میں برابر بناؤں گا۔“ وہ کپ ٹیبل پر رکھتا اس کے برابر آیا۔

”دکھ دالم کی صورت میں بھی نہیں بنوں گی۔“ وہ اب کمزور بالکل نہیں ہونا چاہتی تھی۔

”تم شاید ابھی تک مجھے ٹھیک سے جان نہیں سکی کہ میں کتنا خراب بندہ ہوں۔“ بڑھتی جرح کے ساتھ مراد کا لہجہ اپنے اندر سختی لے آیا تھا۔

”جان کے کوئی فائدہ نہیں ہے۔“ ماہی نے انکوری کیا۔

”اب تک میں ایک حد کے اندر تم سے برتاؤ کر رہا ہوں، تمہارا چیلنجنگ انداز تمہیں نقصان پہنچا سکتا ہے سوا احتیاط برتو ورنہ ایک ایک لمحہ تنگ گزرے گا تمہاری سانسوں پر۔“ وہ مقابل کو سننے کی اتنی ہی سکت رکھتا تھا، شہادت کی انگلی اس کی آنکھوں کے سامنے لہراتا اسے تنبیہ کرنے لگا۔

”ایک مرتبہ اعتبار و محبت کر کے نقصان اٹھا لیا ہے۔ اب زندگی کی حقیقت اور کتنی بربادی لاسکتی ہے میں اس کے متعلق سوچنا نہیں چاہتی۔“ وہ چپ نہ ہوئی۔

مراد کے ہاتھوں محبت کے نام پر دھوکا کھانے کے بعد وہ دل تو سنبھال نہیں سکی تھی۔ محبت، محبوب کی محبت کے نام پر دھڑکتا دل ایک زوردار چھنا کے سے ٹوٹ گیا تھا۔ وہ بھی صبر کرتی اپنے ہی لیے بے حس بنی۔ ٹوٹے دل کی کرچیاں تھمیں نہ کھل کر روئی۔ ابھی تک باقاعدہ پلان اگرچہ اس نے نہیں بنایا تھا مگر سوچ لیا تھا کہ اب مراد کے سامنے کمزور نہیں پڑے گی۔

”میرے سامنے اڑنے کی غلطی کبھی مت کرنا ماہی!“ مراد کو اگرچہ اس کی بات طیش دلا چکی تھی مگر وہ کنٹرول کر گیا۔ مہ روش اب کے بناء کچھ بولے اندر کی جانب بڑھ گئی۔ فی الحال وہ کسی سوچ پر عمل کی پکڑ کو نہیں لے سکی تھی۔ مراد کے سامنے اسے عجب کوفت ہوتی، صبح وہ آفس جاتا تو کچھ ریلیکس فیل کرتی، شام کو وہ واپس آتا تو اُسی کے کہنے پر اسے چائے بنا کر دیتی پھر اُس کی نظروں سے اوجھل ہونے کی تنگ و دو کرتی، کبھی پھپھو کے ساتھ باتوں میں لگتی تو کبھی بہانے سے کچن میں ان کے ساتھ کھڑی ہو جاتی۔ ڈنر کے بعد ٹی وی لگا کر بیٹھ جاتی مگر رات کے وقت فرار کے تمام راستے اس کے لیے مفقود ہو جاتے، مراد روز اول کی طرح اس سے برتاؤ کرتا۔ ماہی اس کے لمس سے گھبراہٹ محسوس کرتی مگر مراد اپنا حق بڑی شان سے وصول کرتا، ساتھ کئی طعنے، طنز اسے سناتا، ماہی کے لیے اس کی قربت سے جان چھڑانا تو ناممکن تھا مگر ایک دو دفعہ کی برداشت کے بعد وہ برابر اُس سے اُسی کے انداز میں گفتگو کرتی، ہر رات کا ایک ایک منٹ گزرتا اسے بھاری لگتا۔

شادی سے پہلے کے دیکھے خواب سننے، مراد کی قربت کا خوشگوار تصور، پیار محبت کی باتیں سوچتی تو انجانی اذیت کا شکار ہوتی۔

”کتنی بے وقوف تھی میں..... کیوں با آسانی دھوکا کھا گئی۔“ اپنی ہی سوچوں کے محور میں وہ پھنستی تو بے چارگی سے سوچ کر رہ جاتی۔ مراد کا شاطر دماغ نہ پڑھ سکے کا اسے بے حد افسوس تھا۔ شادی کو ایک مہینہ ہونے کو تھا اس دوران کمرے سے باہر ماں کے سامنے وہ اسے بے حد محبت سے باتا، یوں ظاہر کرتا جیسے ماہی کو دیکھے بناء ہر لمحہ اس کا

عزیز

افسانہ

کتنی دیر لگتی ہے

”اب آئے ہو تو شادی کروا کے جاؤ۔“ رخشدہ نے اسے گھبراہٹ سے کہا۔

”اماں! آپ کی مرضی لیکن مجھے شادی سے بہت ڈر لگتا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”خاور! سب کے نصیب ایک جیسے نہیں ہوتے۔ اب بڑے بھیا کو ہی دیکھ لو وہ ماشاء اللہ کتنے خوش باش ہیں۔“ آمنہ بولی۔

رخشدہ نے آمنہ کو دیکھا، اس کے چہرے پر یاسیت کی لہر آئی، رخشدہ کو اس کی آنکھیں نم محسوس ہوئیں۔

”چلیں چھوڑیں اماں! میں آج آپ کو اپنے ہاتھ کی کوئی مزیدار چیز کھلاتا ہوں۔“ خاور موضوع تبدیل کرنے کے لئے بولا۔ پھر وہ بیٹے، لگے خاور کے لئے لڑکی کی تلاش زوروں پر تھی ایک جاننے والی کے توسط سے لاہور میں رشتہ طے ہوا۔ لڑکی کا باپ نہیں تھا، اس لئے جہیز نہیں لیا گیا، اس نے نیا گھر خریدا اسے سجاایا۔ صائمہ نے خاور کے گھر میں قدم رکھا تو اسے یوں لگا کہ جیسے اس کا خوبصورت گھر کا پناہ گزین بن گیا ہو، اس گھر میں اسے بے حد عزت و احترام ملا لیکن صائمہ کی ماں فساد برپا کرنے والی خاتون تھیں، وہ اپنی بیٹی کو غلط بیٹیاں بڑھانے لگیں، صائمہ وہ سب نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن اس کی ماں اسے مجبور کرتی اور اسے بدتمیز بنا پڑا۔

رخشدہ تقسیم پاکستان کے وقت نئی نویلی دہلی تھی، گوڈ میں شیر خوار بچے کو اٹھائے ایک لٹے پٹے قافلے کے ہمقدم اس نے اس سرزمین پاک پر 28 اگست 1947 کو قدم رکھا، اس کا شوہر سکھوں کی یلغار میں مارا گیا، زخم تازہ تھے لیکن وطن ملنے کی خوشی بھی تھی اور اسے ابھی اپنے بیٹے کے لئے بھی جینا تھا، وقت اس کے لئے سب سے بہترین مہم ثابت ہوا اور رفتہ رفتہ اس کے زخم مندمل ہوتے چلے گئے۔

یہاں اپنے بچے کے درخشاں مستقبل کے لئے اس نے دوسری شادی کی اور خداوند کریم نے اسے چار بچوں سے نوازا، سب بچے بڑے ہوئے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا، کما کر لانے لگے تو بوڑھے ماں باپ کا سہارا بنے، اسی اثناء میں باپ فوت ہو گیا۔ بڑے بیٹے کی شادی کی اسے علیحدہ کر دیا، وہ لاہور چلا گیا، اس کے بعد باقی تین کی شادی کے بعد دیگرے کی، لیکن ان میں سے ایک بیٹی دو بچوں کے بعد ہی بیوہ ہو گئی، وہ میکے آنے کی بجائے ایک اسکول میں نوکری کر کے اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالنے لگی، ایک بیٹا خاور سعودی عرب چلا گیا، اس کے بعد ایک اور بیٹی آمنہ کی شادی کی لیکن اس کی سسرال والوں سے نہ بھسکی اور وہ جلد ہی طلاق لے کر گھر واپس آ گئی، اب خاور واپس آ رہا تھا، بہت دیر بعد کسی خوشی نے ان کے گھر میں قدم رکھا۔

”ٹھیک ہے میں اسے لے جاؤں گا مگر وہاں رہنے کی کیا ضرورت ہے، کل صبح میں آفس جاتے ہوئے اسے ڈراپ کر دوں گا اور واپسی پر لے آؤں گا۔“ حای بھرنے کے علاوہ کچھ دن مامی کے وہاں قیام کا سن کر ساتھ ہی دو بولا۔

”بات ضرورت کی نہیں ہوتی، ماں باپ کے گھر بیٹیاں جاتی ہیں رہنے ابھی اوہیہ بھی تو یہاں رہ کر گئی تھی اور مہ روش کی شادی کو صرف ایک ڈیڑھ مہینہ ہی ہوا ہے، اتنی جلدی میکے کی یاد پیچھا نہیں چھوڑتی، اس کا دل بھی چاہتا ہوگا بے چاری پہلے بھی تمہارے کہنے اور روکتے پر رک گئی تھی، کچھ بولی بھی نہیں، اب جائے گی اور دو تین دن رہ کر واپس آ جائے گی۔“ انہوں نے کہا۔

”اب میں کیا کہہ سکتا ہوں۔“ اس نے کندھے اچکائے۔

”کچھ دیر بعد اسے لے جانا میں نے اسے تیار ہونے کو کہہ دیا ہے۔“ وہ اسے ہدایت دینے لگیں۔

”اوکے!“ وہ اٹھ کر اپنے کمرے کی جانب بڑھا، مہ روش تیار تھی اسے کمرے میں داخل ہوتا دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”آخر موقع مل رہا ہے تمہیں، خوب۔“ سب اپنی زبانی کہہ سنا، میری طرف سے مکمل اجازت ہوگی۔“ وہ پہلا قدم اندر رکھتے کے ساتھ ہی بولا۔

”میں باہر ہوں آپ ڈریس چن کر لیں، دیر ہو رہی ہے، پریشے کا بار بار فون آرہا ہے۔“ مامی نے سنی ان سنی کرنے کی کوشش میں آہستگی سے کہا اور جانے لگی تھی، فی الحال وہ مراد سے ہرگز نہیں الجھتا چاہ رہی تھی۔

”آں ہاں۔۔۔!“ مراد نے فوراً اسے لپک کر اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے اپنے قریب کر لیا۔ مہ روش نے اچانک افتاد پر سنبھلنے کی سعی میں نگاہ جھکائے اس کی قربت میں بنا حرکت کے ہونٹ کاٹے۔

”تمہیں اتنی چاہ سے اس لیے پیادہ کر لایا تھا کہ تمہیں اپنی بانہوں میں سمیٹوں مگر تم تو فرار کے چکر میں رہتی ہو، اتنی بیزاریت کیوں ڈیر ڈانف۔۔۔ یو نو آئی لو یو اینڈ آئی کانٹ لیو د آؤٹ یو۔“ مراد نے اس کے بالوں کو چھیڑتے ہوئے کہا ارادہ محض اسے تپانے کا تھا۔

”پلیز!“ وہ واقعی الجھے انداز میں ایسا تاثر دے کر مراد سے دور ہٹ کر وہ ہنسے بغیر نہ رہ سکا۔

”حد ہوتی ہے جھوٹ فریب کی مت کریں مجھ سے ایسی باتیں۔“ وہ مزید بھڑکی۔

”تم سے نہ کروں تو اور کس سے کروں ڈیر!“ وہ ڈھٹائی سے بولا۔

”اپنی اس ناکام محبت سے کریں جو کم از کم آپ کے معیار محبت پر پوری اترے، میں آپ کے گھٹیا جذبات اور عروش کا مقابلہ کھلی بے شرمی سے نہیں کر سکتی، ہاں البتہ عروش نے آپ کو آپ کے ہی انداز میں جواب دے کر آپ کی محبت کا حق دار ہونے کا پورا ثبوت دیا ہے تو پھر آپ اپنے تمام جذبے اسی کے لیے بجا کر رکھیں۔ کسی دن اس کے بھی اور آپ کے بھی کام آجائیں گے۔“ وہ بولی تو بڑے دھڑلے اور بے خوف انداز میں تھی مگر اگلے ہی لمحے گال پر پڑنے والے زوردار چھڑنے اس کے قدموں کو جگہ سے ہلایا تھا، گرنے سے بچنے کے لیے دیوار کا سہارا لیتی وہ بے یقین بالکل بھی نہ تھی البتہ چہرے پر سرکتے بالوں کی اوٹ میں اس کی آنکھیں نمی سے تر ہونا چاہتی تھیں مگر بڑی دقتوں سے اس نے خود پر قابو پا لیا تھا۔

”شٹ اپ۔۔۔ جسٹ شٹ اپ۔“ بے حد غصہ ہوتا وہ دہلی آواز میں پھر کر دھاڑا تھا، آج مامی کی باتوں نے اس کا ایک اور سفاک دروہ اس کے سامنے لایا تھا، مامی کا انداز اس کی برداشت سے باہر نکل گیا تھا۔

”تمہیں میں نے کہا تھا کہ میرے سامنے اس انداز میں اور عروش کے متعلق کچھ غلامت بولنا، میں برداشت نہیں کر سکوں گا۔“ وہ مامی کو یاد دلانے کی کوشش میں کھینچ کر اپنے سامنے لایا، مامی کو فوراً خود کو سنبھالنا پڑا۔ (ب۔ن۔ب۔)

سازشی جال بن رہی تھیں، معلوم نہیں کیوں وہ اپنی بیٹی کا گھر اجاڑ رہی تھیں؟ وہ روزانہ صائمہ کا سرکھائیں اور واویلا کرتیں۔

”تمہارا خاوند اب واپس نہیں آنے والا وہ بد بخت تمہیں چھوڑ کر چلا گیا“ ہائے میری ہیروں جیسی بیٹی اکیلی رہ گئی۔ وہ بس ہر وقت یہی کہتی رہتیں۔

”بی بی! کس کا انتظار کرتی ہو.....؟ بس کرو انتظار خاور کو واپس بلاؤ یا خود میرے ساتھ چلو“۔ اس کے دل میں ہوک اٹھتی آ خر کار وہ ایک دن بلبلا اٹھی۔

”اماں! کبھی تو بس کیا کرو، کبھی تو چپ کر جایا کرو ہر وقت ڈراتی رہتی ہو، خاور وہاں کمانے گئے ہیں، آپ انہی کے پیسوں کا پکا کھاتی ہیں اور انہی کی باتیں بنائے جا رہی ہیں، اگر وہ واپس آ گئے تو بھوکے مرجائیں گے۔“

”لڑکی! ہم تو تمہارا بھلا ہی چاہ رہے تھے“
تمہیں نہیں منظور تو نہ سہی، آج کل تو بھلائی کا دور ہی
نہیں، اولاد کے تیور دیکھو ماں کی کس طرح تذلیل
کر رہی ہے، ہم آج ہی واپس چلے جاتے ہیں۔“ یہ
کہہ کر وہ مگر مجھ کے آنسو بہانے لگیں اور صائمہ پیر
پنختی چلی گئی۔

شام میں جب کمرے سے باہر آئی تو دیکھا اماں
سامان تیار کئے گلی میں سے کسی رکشے کے گزرنے کا
انتظار کر رہی تھیں۔

”اماں.....“ صائمہ بولی وہ پیچھے مڑیں اور سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگیں۔

”اماں! نہ جانتیں۔“ یہ کہہ کر وہ ان کے گلے لگ گئی، اماں نے بھی اسے گلے لگایا اور بولیں۔

”بٹیا! ایک ماں سے بڑھ کر اپنی اولاد کا بھلا کون چاہے گا.....؟“

”ہاں ہاں..... پتا ہے آپ کا بھی آنٹی جی!

معلوم ہے مجھے کہ یہاں آ کر کیوں بیٹھیں؟ بیٹے

[جولائی 2012ء]

”خاور! میں مزید آپ کی اماں کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔“ - صائمہ بستر کی سلوٹیں درست کرتے ہوئے بولی۔

”لیکن کیوں.....؟“ وہ دوستوں سے میل ملاقات کے بعد واپس آیا تو صائمہ عجب موضوع بحث لئے بیٹھی تھی۔

”خاور! میری بھی کوئی زندگی ہے وہ ہر وقت میری پہرہ داری پر مامور نظر آتی ہیں یہ نہ کرو وہ نہ کرو ہونہہ.....“ صائمہ چہرے پر نخوت طاری کرتے ہوئے بولی۔ خاور پلک جھپکے بنا اس کا چہرہ تک رہا تھا اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ کوئی نئی نویلی دلہن بھی ایسے بولتی ہے۔

”ٹھیک ہے، اگر اسی میں تمہاری خوشی ہے تو کہہ دیتا ہوں اماں سے کہ آپ کی بہو کو آپ کا یہاں رہنا پسند نہیں۔“ خاور نے رخ پھیرا اور بستر پر جا کے لیٹ گیا۔

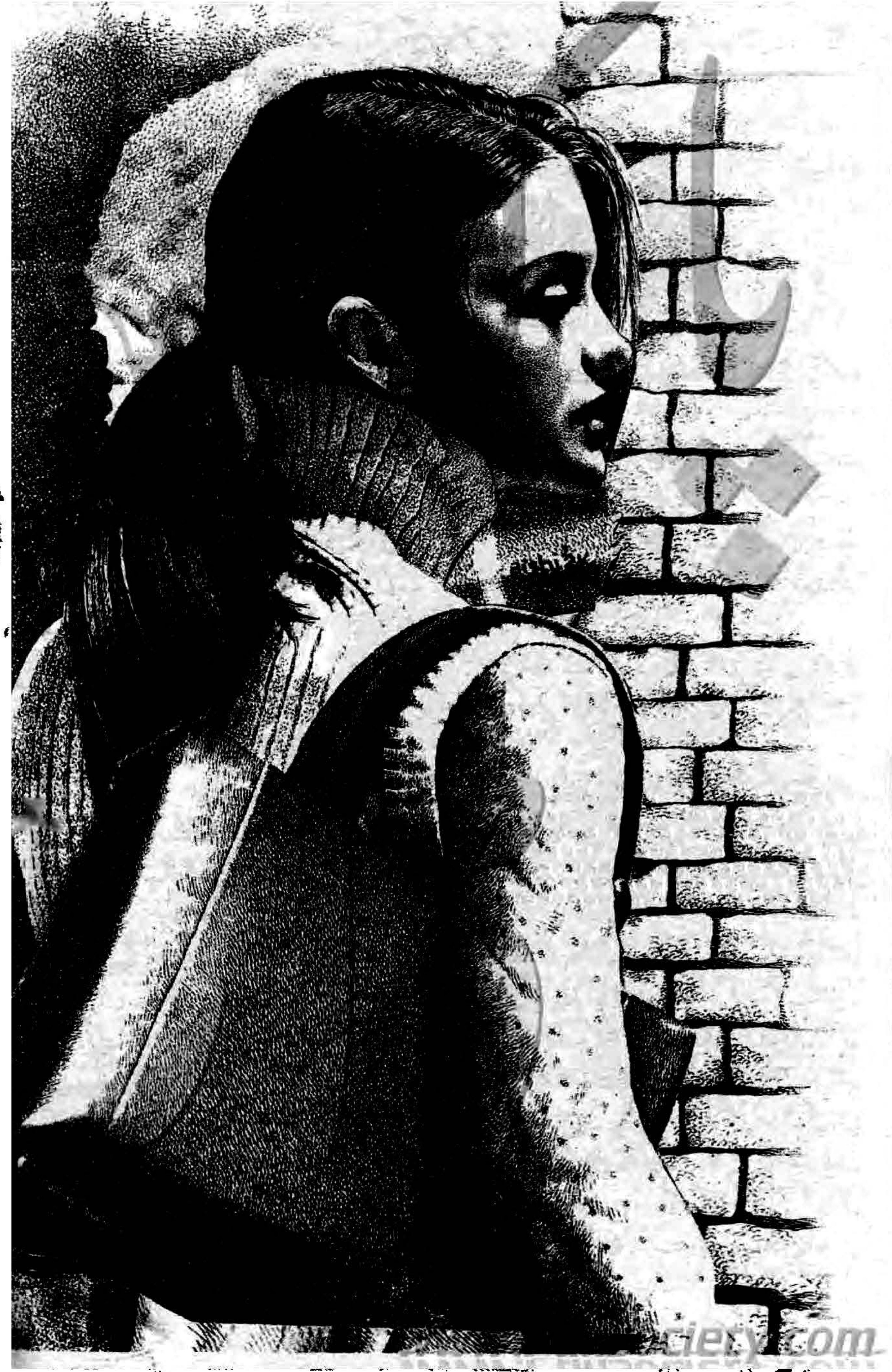
رخشندہ کو اس گھر سے تو ویسے ہی جانا تھا، وہ کچھ دیر کے لئے رکی تھیں، اگلے دن وہ چلی گئیں، صائمہ سمجھی کہ شاید خاور نے رخشندہ کو کہا ہے اس لئے وہ چلی گئیں، کافی دن وہ خاور کی نگاہوں سے نگاہیں نہ ملا پائی، خاور بھی روٹھا روٹھا معلوم ہوتا تھا، لیکن کب تک ایسے چلتا، اس نے اپنے مسئلے کا تذکرہ اپنی اماں سے کیا تو انہوں نے اسے جھڑک دیا۔

”ساس کو ہمیشہ ساس ہی سمجھو اور کبھی بھی اس کی زیادہ خاطر مدارات نہ کرو ورنہ وہ سر چڑھ کر بولے گی۔“ صائمہ لب بھیج کر رہ گئی۔

کچھ عرصہ بعد خاور واپس چلا گیا، صائمہ کی ماں اس کے پاس آ کر رہنے لگیں، اماں اسے روزانہ اس کی سسرال کے خلاف اکساتیں اور خاور کی کمائی پر مفت گزارہ بھی کرتیں۔

خاور کو گئے چند ماہ ہی ہوئے تھے اب اماں ایک نیا

رداؤا نجسٹ 3



کھاتے نہیں، کھائیں گی کہاں سے۔۔۔؟ کھانا داما دل گیا تو ادھر کا رخ کر لیا اور میرے بھائی کی وی ہوئی رقم پر پلنے لگیں۔ جس پر اماں چلا اٹھیں۔

”ارے چپ کر جا! اب ادھر نظر آئی تو پھر دیکھنا۔“ اماں سے سچ کہاں برداشت ہوتا تھا اس لئے ہاتھ نہ جاتی بولیں اور دمکی دے ڈالی۔

”بڑی آئیں مجھے سنانے والیں ہوتی کون ہیں؟ اگر اتنی ہی عزت والی ہوتیں ناں تو یوں بیٹی کے گھر آ کے نہ بیٹھتیں۔“ آمنہ نے بھی حساب برابر کیا۔

”اور ہاں مجھے طلاق یافتہ کہنے سے پہلے سن لیں کہ تمہاری بیٹی پر بھی یہ نوبت آ سکتی ہے کیونکہ گود تو اس کی ہری ہوئی نہیں اس لئے بھیا کی دوسری شادی کرنا ہی پڑے گی۔“ یہ کہہ کر وہ وہاں سے چلتی بنی اور پیچھے لماں اور صائمہ کلس کے وہ گئیں آمنہ کو نہیں معلوم تھا کہ صائمہ پر کیسٹ ہے۔

”گود دیکھ لو۔۔۔ جس کی حمایت میں تو اتنا بول رہی تھی اس کی بہن تجھے کتنا بے عزت کر کے گئی۔“ لماں اپنی بے عزتی کا غصہ اس پر اتارنے لگیں۔ وہ ہاتھوں کو آپس میں رگڑنے لگی۔

”اور تیرے منہ میں زبان نہیں تھی اس کو کچھ کہنے کے لئے؟ میرے سامنے تو بڑی چلتی ہے۔“ صائمہ لماں کی طرف دیکھے گی۔

”چل اب منہ کیا دیکھتی ہے؟ کر خاور کو فون۔۔۔ کہہ اسے کہ اب تو نہیں رہے گی اس گھر میں اس سے زیادہ ہماری اور کیا بے عزتی ہو سکتی ہے۔“ لماں غصے سے بھری بیٹھی تھیں۔

صائمہ اٹھی اور لماں کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے اس نے خاور کو فون کیا اور مرچ مصالحہ لگا کر ساری رو دوا د خاور کو سنائی اس نے خاور کو روتے ہوئے کہا کہ وہ اب اس گھر میں نہیں رہ سکتی جب وہ واپس آئے گا تب ہی واپس آئے گی یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا سامان

باندھا اور ماں کے ساتھ چل دی۔

☆

ادھر آ منہ گھر پہنچی تو اس نے بھی ساری کتھا رخشندہ کو الف سے بے تک سنائی رخشندہ یہ سب کہاں برداشت کر سکتی تھیں اس نے بھی خاور کو فون کیا اور فوراً واپس آنے کو کہا خاور دوہری صورتحال کا سامنا کر رہا تھا ادھر صائمہ روزانہ خاور کو فون کر کے اس کے کان کھاتی اور ادھر آ منہ بھی اپنی بے عزتی کا بدلہ لینے کا سوچ رہی تھی۔

☆

وہ واپس آیا تو آمنہ ایک کی دو کر کے بتانے لگی کہ کس طرح اس دن اس کے بے داغ کردار پر انگلیاں اٹھائیں گئیں یہ سن کر خاور کی سانولی سی رنگت غصہ سے سرخ ہو گئی اس نے آمنہ کے سر پر ہاتھ رکھ کے اس کو دلاسا دیا آمنہ کو معلوم ہو گیا کہ تیرنٹانے پر لگا ہے۔ اب وہ روزانہ خاور کو بھڑکانی اوپر سے رخشندہ نے بھی راگ الاپنا شروع کر دیا کہ اسے پوتا چاہئے خاور کو آئے ہوئے کافی دن ہو گئے لیکن مسئلہ تھا کہ حل ہونے کی بجائے بڑھتا ہی چلا گیا صائمہ کے ہاں بیٹا پیدا ہوا رخشندہ اور آمنہ کی تو چال ختم ہو گئی اور ان کی زبان بند ہو گئی لیکن صائمہ تو اور شیر ہو گئی اور اسے حرید موقع مل گیا وہ آنے کا نام تک نہیں لے رہی تھی۔

”صائمہ! واپس آ جاؤ۔“ خاور نے صائمہ کو دوبارہ فون کیا۔

”میں نے کہا تھا کہ میں اس وقت تک نہیں آؤں گی جب تک آپ اپنی بہن اور باقی گھر والوں سے قطع تعلق نہیں کر لیتے یا وہ لوگ آ کر میری ماں سے معافی نہیں مانگ لیتے۔“ صائمہ نے تقریباً چلاتے ہوئے کہا۔

”صائمہ! دیکھو قصور میرے گھر والوں کا نہیں اور جہاں تک بات قطع تعلق کی ہے تو قطع تعلق کرنا گناہ

ہے۔“ خاور اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔

”میں کچھ نہیں جانتی بس آپ کو میری شرط پر عمل کرنا ہوگا۔“ صائمہ ضدی لہجہ میں بولی۔

”صائمہ! میرے گھر والے تو بالکل بھی نہیں آئیں گے اور قطع تعلق اس سے اسلام میں منع فرمایا گیا ہے یہ حرام ہے اور یہ کس طرح ممکن ہے کہ جن لوگوں کے ساتھ میں نے اپنا بچپن اور لڑکپن گزارا انہیں چھوڑ دوں۔۔۔؟ یہ کس طرح ممکن ہے کہ جس ماں نے اپنا پیٹ کاٹ کر مجھے پالا پوسا میری پرورش کی اور مجھے اس مقام پر کھڑا کیا اس سے منہ موڑ لوں نا ممکن۔۔۔“

”تو بھر ٹھیک ہے آپ مجھے چھوڑ دیں۔“ صائمہ نے خاور کی بات کاٹی۔

”میں تمہاری یہ خواہش پوری کرنے کے لئے تیار ہوں میں تمہیں چھوڑ سکتا ہوں لیکن اپنے گھر والوں اور اپنی ماں کو نہیں اور ویسے بھی تم نے مجھے آج تک دیا ہی کیا ہے سوائے دکھ و تکلیف کے۔“ خاور غریبا اور اس نے فون چھ دیا۔

☆

انہی دنوں جائیداد کی تقسیم کا وقت آ گیا بڑے بھائی اور بیٹھے بھائی نے ملی بھگت سے زیادہ حصہ خود رکھ لیا اور باقی ماندہ دوسرے بہن بھائیوں کو بانٹ دیا سوائے خاور کے اسے یہ کہہ کر حصہ نہیں دیا گیا کہ وہ پہلے ہی مشترکہ بیسوں سے مکان لے چکا ہے اب وہ بے جارائے صورتحال کا سامنا کر رہا تھا مایوسی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔

”ہیلو۔۔۔“ فون سے خاور کی آواز ابھری۔

”ہیلو۔۔۔“ دوسری جانب سے صائمہ کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی۔

”صائمہ! میں آخری بار کہہ رہا ہوں اپنی شرط ختم کر دو اس فضول کی لڑائی سے کوئی فائدہ نہیں واپس آ جاؤ۔“ خاور بے بسی سے بولا۔

”میری شرط برقرار ہے میں اس سے پیچھے کیوں ہوں۔۔۔؟“

”ٹھیک ہے تم اپنی شرط اور اپنا بھرم قائم رکھو لیکن کل جب تم میرے مرنے کی خبر سنو تو تب بھی نہ آنا آئی سمجھ۔“ خاور نے فون بند کر کے بستر پر اچھال دیا وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

”آج رات بس آج رات اگر کل تک حالات ٹھیک نہیں ہوتے ہیں تو میں واپس چلا جاؤں گا کبھی نہ آنے کے لئے۔“ خاور نے سوچتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔

☆

خاور پٹری پر لیٹا تھا ٹرین کے بارن کی آواز فضا میں گونجی اس نے آنکھیں بند کر لیں اور کلمہ شہادت کا ورد کرنے لگا ٹرین کے قریب آنے کی آواز آنے لگی ٹرین بہت تیزی سے اس کی گردن کے قریب پہنچی اور صائمہ فوراً چیخ کے اٹھ بیٹھی اس کا پورا بدن پسینے سے شرابور تھا چیخ کی آواز سن کر اماں بھی جاگ گئیں۔

”کیا ہوا۔۔۔؟“

”اماں! وہ خاور۔۔۔“ اس کی سانسیں پھولی ہوئی تھیں۔

”آئے ہائے رات کو تو سکون کر لینے دے۔“ اماں غصے سے بولیں۔

”اماں خاور خود کو کچھ کرنے والے ہیں مجھے ان کے پاس جانا ہے۔“ صائمہ بچوں کی طرح بولی۔

”شرط تو اس نے تیری مانی نہیں اور تو اس کے پاس جانے کی بات کر رہی ہے کچھ نہیں ہونے لگا اسے سو جا۔“ اماں کروٹ لے کر بولیں۔

”خاور سچ کہتے ہیں یہ لڑائی بے کار ہے۔“ صائمہ نے خود کلائی کی۔

”کیا۔۔۔؟“ اماں کو شاید سنائی نہیں دیا تھا۔

”اماں! میں یہ فضول اور بے کار جنگ لڑنے کے

تھک چکی ہوں! اماں! مجھ پر رحم کھاؤ! میں تنہا رہ جاؤں گی۔ اس نے ماں کے آگے ہاتھ جوڑے۔

”اچھا چل اب سو جا صبح اٹھ کر بات کریں گے۔“ اماں کو شاید نیند زیادہ پیاری تھی! اس لئے منہ تک چادر لی اور سو گئیں! لیکن صائمہ کی وہ رات کاٹے نہیں کٹ رہی تھی! اسے کیا ہو گیا تھا.....؟

صرف ایک خواب ہی تو تھا پھر اتنا ڈر کیوں.....؟

نہیں شاید وہ خواب بہت بھیانک تعبیر پاسکتا تھا! اس کا دل ڈوبا جا رہا تھا! خاور کو فون کر رہی تھی لیکن اس کا فون بندل رہا تھا! جس سے وہ مزید گھبرا گئی! وہ رات اس نے جاگتے اپنے مجازی خدا کی سلامتی کی دعائیں مانگتے گزاری۔

☆.....☆

اگلے دن ہر فون کال پر اس کا دل دہل جاتا! ناشتے کے بعد اس نے اماں سے بات کرنے کی ٹھانی۔

”ہوں.....“ اماں وضو کرنے جا رہی تھیں۔

”اماں! مجھے واپس جانا ہے۔“

”کیوں.....؟“ اماں نے ابرو چڑھائے۔

”اماں! یہ بے کار کی جنگ لڑنے کا کوئی فائدہ نہیں بلکہ اس سے خاور کے دل میں میرے لئے میل ہی آئے گا اور ویسے بھی اسلام میں قطع تعلق کرنا گناہ ہے تو ہم خواجواہ کیوں گناہ کے مرتکب ہوں۔“ اس نے اماں کو قائل کرنے کی کوشش کی۔ اماں خاموش رہیں۔

”اماں! مجھے بتاؤ کیا فائدہ اس جنگ کا.....؟ کوئی فائدہ نہیں۔“ صائمہ بولی لیکن اماں پھر بھی خاموش رہیں! صائمہ جھلا گئی۔

”اماں! آپ کو نہیں لے کے جانا تو نہ لے کر جائیں میں خود ہی چلی جاتی ہوں۔“ صائمہ وہاں سے جانے لگی تو اماں بولیں۔

”چل میں بھی تیرے ساتھ چلتی ہوں۔“ صائمہ

خوشی سے اچھل پڑی۔ پھر وہ تیار ہو کے اماں کے ساتھ چل دی اور خاور کے مکان کے سامنے ہی جا کر اتری! ابھی وہ مکان کے سامنے کھڑی خوشی سے سرشار اسے دیکھ رہی تھی کہ اندر سے وہ دشمن جاں گیٹ کھول کباہر آیا! خاور بھی صائمہ کو اپنے سامنے دیکھ کر دنگ رہ گیا! اس نے پلکیں جھپکیں آیا کہ وہ کوئی سپنا ہی نہ دیکھ رہا ہو لیکن وہ حقیقتاً اس کے سامنے موجود تھے! بادامی رنگ کی شلوار قمیص پہنے دھوپ کی تمازت سے اس کی رنگت سرخ ہو رہی تھی اور خاور سن گلاسز تھامے ہلکے نیلے رنگ کی شرٹ میں آستین اوپر کئے کتنا خوبود دکھائی دے رہا تھا! صائمہ دیکھتی رہ گئی۔

”السلام علیکم۔“ صائمہ کے مدھر سروں نے فضا پر طاری سکوت کو توڑا۔ خاور نے جواب دیا اور انہیں گزرنے کو راستہ دیا! اندر بیٹھا یا اور ابھی آنے کا کہہ کر باہر نکل گیا! ایک گھنٹہ گزرا دو گزرنے اسی طرح دوپہر ہو گئی! صائمہ نہایت پریشان ہو گئی اور اماں کی زبان پھر چلنے لگی۔

”لو..... تمہیں ہی آنے کی پڑی تھی ادھر ان صاحبزادے کو کوئی خیال نہیں! معلوم نہیں بیوی کتنے دن بعد گھر واپس آئی ہے چلو اسے چھوڑو! بیٹا پہلی دفعہ آیا ہے اسے دیکھنا بھی گوارہ نہیں کیا اور.....“

”اوہو اماں! آپ تو چپ کر جائیں پہلے ہی آپ کی وجہ سے نوبت یہاں تک پہنچی ہے! معلوم ہے خاور مجھے چھوڑنے کی بات کر رہے تھے۔“ آج اس نے اماں کے سامنے اس اہم راز سے بھی پردہ اٹھایا۔ اماں نے مزید اسے لتاڑ دیا۔

”اور تو ایسی بے شرم پھر یہاں چل پڑی۔“ صائمہ نے انہیں ٹوکا۔

”اماں! اب بس چپ کر جائیں کیوں میرے بے ہوئے گھر کے پیچھے پڑی ہیں.....؟ مائیں اپنی بیٹیوں کا گھر بساتی ہیں اجاڑتی نہیں۔“ وہ چلائی۔

خاور سر شام گھر آیا اور آتے ہی کمرے میں بند

ہو گیا پھر تو یہ معمول بن گیا! خاور اس کے کمرے میں جانے سے پہلے ہی سو جاتا یا اتنی دیر سے گھر لوٹتا کہ تب تک صائمہ سو چکی ہوتی! چھٹی والا دن ہی آ منا سامنا متوقع ہوتا لیکن اس دن خاور بیٹے کو گھر سے لے کر باہر نکل جاتا اور صائمہ گھر میں بولائی بولائی پھرتی۔ خاور بیٹے کو پا کر بے حد خوش تھا! وہ اسے رخشنده سے بھی ملا کر لایا! رخشنده اور آمنہ نے بچے کو تو ہاتھوں ہاتھ لیا! لیکن خاور کو بھی ساتھ ہی تنبیہ کر دی کہ وہ اس وقت تک خاور کے گھر نہیں آئیں گے جب تک صائمہ ان سے معافی نہ مانگ لے۔

☆.....☆

یہ انتظار بھی کیسا ظالم ہے.....؟ اس دنیا کی سخت ترین سزاؤں میں سے ایک انتظار بھی ہے! انتظار کی سولی پر تو نیند بھی کوسوں دور بھاگتی ہے! یہ سزا یا تو انسان خود چننا ہے یا پھر بھی اس کے اپنے ہی اسے اس کرب میں مبتلا کر دیتے ہیں! صائمہ کو بھی تو انتظار ہی تھا! اپنے من میت کے ادٹ آنے کا۔

محبوب پاس ہو لیکن وہ نظر ملانا بھی گوارہ نہ کرتا ہو! اور پھر بھی اس کی جانب نگاہیں مرکوز رکھنا! یہ انتظار ہی تو ہوتا ہے۔ ساجن پاس ہو لیکن وہ بات نہ کرتا ہو اور پھر بھی اس کی آواز سننے کے لئے کان کھڑے رکھنا! یہ بھی تو انتظار ہوتا ہے۔

”ہائے رے یہ انتظار..... کب تک چلے گا ایسے شاید جب تک یہ زندگی ہے۔“ یہ سوچ کر وہ دہلا گئی۔ کوئی اس کے اندر بہت زور سے چیخا۔

”اس انتظار کو ختم کیوں نہیں کرتی ہو! ختم کر دینا انتظار! ورنہ یہ انتظار کسی امر بیل کی طرح تمہارے جسم و روح سے چپک جائے گا اور انہیں مردہ دکھو کھلا کر دے گا لیکن حاصل کچھ بھی نہ ہو گا سوائے ہجر و فراق کے نصیب میں خسارہ ہی خسارہ ہوگا۔“

”مجھے آج ہی خاور سے بات کرنی ہوگی۔“ یہ سوچ کر اس نے اپنے آنسو پونچھے اور کھانا پکانے کے لئے

اٹھ کھڑی ہوئی۔

اس دن خاور شام کو ہی گھر واپس آ گیا! اور کمرے میں بند ہو گیا۔ حمزہ کو سلا کر وہ اپنے کمرے کی جانب چل دی۔ وہ کمرے میں جاتی جھک جھک رہی تھی! لیکن اسے یہ ہمت بھی کرنا تھی وہ اندر داخل ہوئی۔

”خاور۔“ اس نے خاور کو مخاطب کیا! خاور نے پلٹ کے اسے دیکھا اور پھر جا کر بستر پر لیٹ گیا۔

”اب کیوں واپس آئی ہو.....؟“ وہ رخ پھیر کر بولا۔

”میں نے آپ کے متعلق بے حد برا خواب دیکھا خاور! دل گھبرا گیا۔“

”اور تم اپنے دل کی تسلی کے لئے چلی آئیں۔“ خاور نے اس کی بات اچک لی۔

”نہیں خاور! یہ بات نہیں! میں واقعی اپنے کئے پر شرمندہ ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھیں چھلک پڑیں اور وہ خاور کے قدموں میں بیٹھ کر زار زار رونے لگی۔

”خاور! مجھے معاف کر دیں خاور میں بہک گئی تھی مجھے بہکا یا گیا تھا۔“ خاور تو بوکھلا گیا اس نے صائمہ کو فوراً کاندھوں سے تھاما اور اپنے برابر بیٹھ کر بٹھالیا! اور اسے اپنی نگاہوں کا مرکز بنایا! ان تین سالوں میں وہ نہایت کمزور و لاغر دکھائی دینے لگی تھی! آنکھوں کے گرد گہرے حلقے تھے! رنگت میں زردی نمایاں تھی! جیسے جدائی نے اس کا خون ہی چوس لیا ہو۔ حالت تو خاور کی بھی اچھی نہ تھی! کپڑے ملگجے ہوئے تھے اور بے ترتیب بال لئے آنکھوں پر چشمہ ٹکائے وہ نہایت عجیب دکھائی دے رہا تھا! گویا دونوں طرف ایک قیامت صغریٰ نازل ہوئی ہو۔

”خاور! میں آپ کی گناہ گار ہوں! آپ مجھے ماریں پیٹیں جو مرضی کریں میں ہر سزا کے لئے تیار ہوں لیکن مجھ سے بات تو کریں انتظار کی بھینٹ مت چڑھائیں۔“ اس نے خاور کے آگے ہاتھ

جوڑے۔

اس کے نین کٹورے پھر آنسوؤں سے بھرنے لگے خاور نے آگے بڑھ کر اسے اپنے پہلو میں بٹھایا، صائمہ نے اس کے کاندھے پر سر رکھا اور بے آواز رونے لگی، لیکن آنسوؤں کی ندیاں تھیں کہ بہتی جا رہی تھیں خاور کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔

”چلو اب چپ بھی کر جاؤ، اتنی دیر بعد ملے ہیں مجھے خوش کرنے کی بجائے رلا رہی ہو“۔ خاور نے پہل کرتے ہوئے اس کا چہرہ سامنے کیا اور اس کی نازک ستواں ناک دبائی جہاں ایک باریک چمکدار لونگ موجود تھا۔

”آپ نے مجھے معاف کر دیا.....؟“

”ہوں معاف تو کر دیا لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آرہی۔“

”کوئی بات.....؟“ صائمہ کو دور کہیں خطرے کی گھنٹی بجتی محسوس ہوئی۔

”تم نے کہا کہ تمہیں کسی نے بہکایا، کس نے بہکایا.....؟“ خاور نے پوچھا، صائمہ نے ٹھنڈی آہ بھری۔

”خاور! میں یہ بتاتے ہوئے حد درجہ شرمندہ ہوں کہ بہکانے والی کوئی اور نہیں میری اپنی ماں تھیں، اس دن آمنہ باجی کے ساتھ اماں نے جان بوجھ کر لڑائی کو طول دیا، اس وقت میں بھی بہک گئی، میں اماں کے ساتھ چل دی، لیکن اماں کے گھر جا کر اور اک ہوا اس دل بے چین کو وہاں قرار کب تھا، میں جب بھی اس بات کا ذکر اپنی ماں کے سامنے کرتی وہ مجھے جھڑک دیتیں۔ یہ کہہ کر وہ اپنی انگلیاں مروڑنے لگی۔ خاور اسے مسلسل دیکھے گیا۔

”لیکن انہوں نے ایسا کیوں کیا.....؟“ اس نے دریافت کیا۔

”میں خود بھی نہیں جانتی، بخدا خاور! مجھے کوئی شوق نہیں تھا آپ کو ستانے اور آپ کو چھوڑنے کا، لیکن اماں

مجھے ایموشنل بلیک میل کرتیں اور مجھے یہ سب کرنا پڑتا۔“ اس نے سر اٹھا کر خاور کی طرف دیکھا اور خاور نے اسے مضبوط پناہوں میں لے لیا۔

☆.....☆.....☆

اگلے دن ان دونوں کی آنکھ دیر سے کھلی، وہ دونوں نیچے آئے تو اماں نے پھر بولنا شروع کر دیا۔

”آگے تم دونوں نہ نماز روزے کی فکر نہ کچھ اور بس سو رہے گھوڑے بیچ کر.....“

”فائدہ تو آپ کے بھی کسی نماز و روزے کا نہیں۔“ خاور منہ ہاتھ دھو کر آیا اماں کی بات کاٹی۔

”آئے ہائے لڑکے یہ تو کیا بول رہا ہے.....؟“ اماں نے اسے گھورا۔

”خالہ جی! میں آپ کو بتاتا ہوں، صائمہ! جاؤ تم ناشتہ تیار کرو میں نے ان سے کچھ بات کرنی ہے۔“

خاور نے صائمہ کو وہاں سے بھیجنا مناسب سمجھا اور پھر لٹاں کی طرف متوجہ ہوا۔

”خالہ جی! میں کوئی لمبی چوڑی تمہید نہیں باندھوں گا، ہر طرف پتلا پوچھوں گا کہ آپ صائمہ کی زندگی کیوں اجاڑ رہی ہیں.....؟“

”اے میاں! زبان سنبھال کر بات کرو، ہم اپنی بیٹی کی زندگی کیوں اجاڑیں گے۔“ اماں نظر چرا گئیں اور پان دان بند کرنے لگیں۔

”پہلے میری پوری بات سن لیں، صائمہ نے مجھے خود بتایا کیوں کیا آپ نے ایسا.....؟ اس نے آپ کو کیا فائدہ دیا.....؟“ خاور نے دو ٹوک بات کی۔

”اچھا اس نے تمہیں سب سچ بتا دیا۔“ اماں کی تیوری پر بل آ گئے۔

”خالہ جی!“ اس سے پہلے کہ خاور کچھ کہتا اماں نے مزید گل فشانی شروع کر دی۔

”جب سے یہ میرے گھر میں آئی ہے مجھے سکون کب ہے.....؟ میری زندگی بٹی ہے یہ۔“ خاور ہمہ تن گوش ہوا۔

”اس کی ماں کے مرنے کے بعد اس کا باپ اسے ہمارے گھر چھوڑ گیا میں کیوں اپنا رزق اس سے بانٹتی، لیکن اس سے پہلے اس نے اپنی نحوست کا رنگ دکھانا شروع کیا، پہلے اپنی ماں کو اس نے نگلا اب میرا شوہر کھا گئی۔ میری بیٹی پیدا ہوئی وہ بھی چند دن کے بعد مر گئی، اس کے بعد تو میں اسے بالکل بھی نہ پیار دے سکی، جب جوان ہونے لگی تو لوگوں کے سمجھانے بچھانے پر جیسے تیسے کر کے اس کا جہیز تیار کیا اور اسے تمہارے ساتھ رخصت کر دیا۔“ اماں سانس لینے کو رکیں اور خاور اپنا اوپری ہونٹ کاٹنے لگا۔ لیکن اسی دوران صائمہ آندھی طوفان کی طرح اندر داخل ہوئی۔

”اماں! منحوس میں نہیں تمہارے اپنے بیٹے تھے جن کے غلط کاموں سے ماموں کو دل کا دورہ پڑا اور وہ فوت ہو گئے اور مرنے والی بیٹی میرے آنے سے پہلے مر گئی تھی۔“ اماں ہونٹ بنی بیٹھیں تھیں۔

”ویسے ہی آپ کو اپنی نند سے ازلی پر خاش تھی، اس لئے تم مجھے پیار نہ دے سکیں، نہ اپنی بیٹی بنا سکیں، لیکن جب بیٹے بالکل ہی بگڑ گئے اور تمہیں انتہی پتہ نہ تھا رکھنے کے قابل نہ تھے تو تم میرے ساتھ چل پڑیں، لیکن تمہاری نند کی بیٹی جو تھی اس لئے پھر مختلف حیلوں بہانوں سے گمراہ کر کے میری زندگی تباہ کرنے لگیں، لیکن افسوس تمہاری چال کا میاں نہ ہوئی۔“ صائمہ بولنے پر جو آئی تو چپ نہ کر رہی تھی اور خاور نے بھی اسے چپ کرانے کی ضرورت نہ محسوس کی، وہ خاموش تماشا بنی بنا یہ سب تماشا دیکھتا رہا۔

اس سے پہلے کہ اماں کچھ کہنے کے لئے لب و لہجہ کرتیں خاور اسے وہاں سے لے گیا، کمرے میں جا کر صائمہ پھر رونے لگی، خاور نے اسے سکون آور دوا دی اور گھر سے نکل گیا۔

دو پہر میں جب وہ باہر آئی تو اماں کو ان کے کمرے میں بے ہوش پایا، ان کا شوگر لیول کم ہو گیا

تھا، اس نے خاور کو فون کیا، اماں کو جلدی سے اسپتال پہنچایا گیا علاج معالجے پر کافی خرچ آیا، اماں کو جب ہوش آیا تو ایک وجود ان کے پاس بیٹھا آنسو بہا رہا تھا اور دوسرا تسلی دے رہا تھا، یہ صائمہ اور خاور تھے پھر انہوں نے دیکھا کہ صائمہ کس طرح ان کی تیمارداری میں رات دن ایک کئے ہوئے تھی اور خاور وہ بھی بہت محبت و اپنائیت سے پیش آیا، اماں صحیح معنوں میں شرمندہ تھیں انہوں نے صائمہ و خاور سے معافی مانگ لی، صحت یاب ہونے کے بعد وہ صائمہ کو ساتھ لئے رخشندہ کی طرف آ گئیں، وہاں آمنہ اور رخشندہ سے معافی مانگی، انہوں نے کھلے دل سے معاف کیا کیونکہ دلوں میں بغض اور کینہ رکھنے سے کیا فائدہ.....؟ وہاں سے آتے ہوئے صائمہ زبردستی رخشندہ کو اپنے ساتھ لے آئی۔ اس عمل سے خاور بے حد خوش ہوا، اس نے بھی صائمہ کو پاکستانی فرم میں ہی ملازمت ملنے کی خوشخبری سنائی، وہ مسرت سے اس کے گلے میں بانہیں ڈال گئی۔

”میں آپ سے ایک بات پوچھوں.....؟“ وہ اس کے گرد بازو جامل کئے ہوئے بولی۔

”ہوں.....“ خاور مدھم لہجے میں بولا۔

”جب میں واپس آئی تو آپ گھر میں کیوں نہیں نکلتے تھے.....؟“ وہ ذرا آخر دیکھتے ہوئے بولی۔

”میں تمہیں انتظار کی لذت چکھانا چاہتا تھا۔“ خاور نے اس کے چہرے پر آئی آوارہ لٹ پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا اس نے خاور کے سینہ پر مکا جڑنے پر اکتفا کیا۔

”آپ نے مجھے معاف کر دیا نا.....؟“ وہ غزال نین اس کے چہرے پر گاڑے بولی۔

”تم نے تو غصے کی کوئی گنجائش باقی ہی نہیں رہنے دی، جس حالت میں تم معافی مانگ رہی ہو۔“ خاور شرارتاً بولا تو اس کے گالوں پر لالی بکھر گئی۔

☆.....☆.....☆

عائشہ الیاس

افسانہ

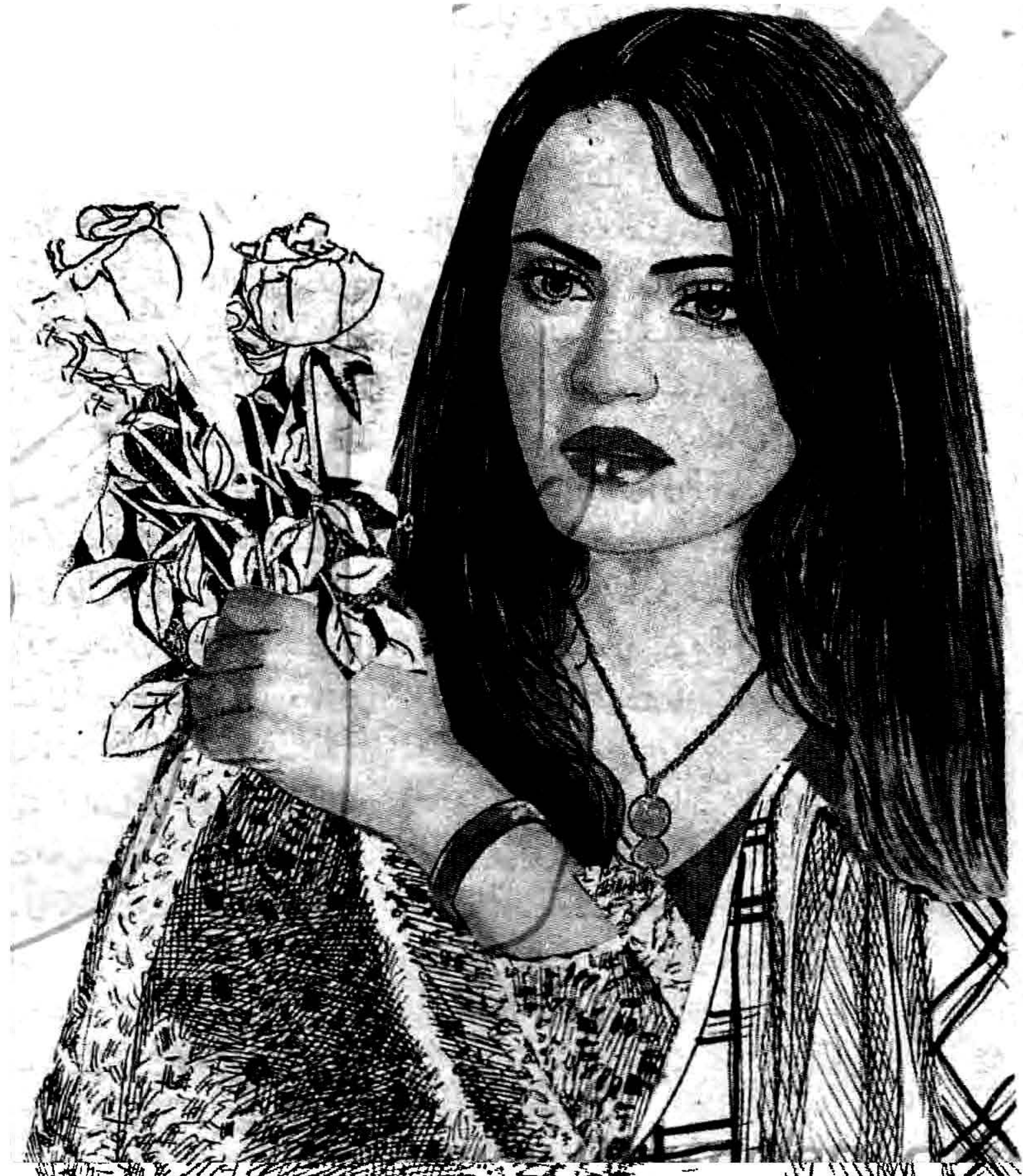
سوچا نہ تھا

وہ پڑھنے کی غرض سے لان میں کتابیں لے کر بیٹھی تھی اور جیسے ہی لیکچر والا رجسٹر کھولا تو اس میں سے ایک گلاب کی کلی اور خط برآمد ہوا۔ وہ پریشان سی ہو گئی یہ خط اور کلی ساٹھویں مرتبہ ملی تھی، پچھلے کئی دنوں سے وہ

سے لاعلمی ظاہر کی۔ وہ تو سر پکڑ کر ہی بیٹھ گئی کہ آخر کون ہے وہ.....؟ وہ سوچ رہی تھی کہ لیکچر رجسٹر اس نے کس کو دیا تھا، کافی دیر سوچ پیچار کے بعد یاد آئی گیا۔

”ہاں میں نے رئیس کو دیا تھا، تو کیا رئیس.....؟“ نہیں وہ کیسے ہو سکتا ہے پر کیا مصیبت ہے کون ہو سکتا ہے.....؟“ وہ خود سے سوال کرتے کرتے جھنجھلا گئی۔ رئیس اس کا کلاس فیلو تھا، اچھا خاصا بینڈ سم، اس سے اس کی کافی اچھی ہائے ہیلو تھی، پر وہ کوئی دل پھینک شخص نہیں تھا، کافی سنجیدہ تھا، مائرہ کو یقین نہیں آیا کہ وہ ہو سکتا ہے وہ کافی دیر بیٹھی سوچتی رہی پر کچھ سمجھ نہ آ رہا تھا،

پریشان ہو کر رہ گئی تھی، نجانے کون تھا جو اکثر اس کی کتابوں اور ہینڈ بیگ میں چپکے سے ایک خط اور کلی ڈال دیتا؟ خط میں ہمیشہ رومانوی غزلیں یا پھیر بڑے خوبصورت الفاظوں کے چناؤ سے اپنی محبت کے بارے میں اظہار لکھا ہوتا تھا، پہلے پہل تو وہ یہ سمجھی کہ کوئی شرارت کر رہا ہے اس کے ساتھ، پر یہ شرارت اب کافی طویل ہو گئی تھی وہ پریشان ہو کر رہ گئی تھی، آخر کون ہے جس نے خط میں اپنا نام تک نہ لکھا تھا، اس نے اپنی سب ہی فرینڈز سے پوچھ لیا، کہ کہیں وہ تو اس کے ساتھ یہ شرارت نہیں کر رہیں پر سب ہی نے بڑی حیرت



و عجیب فکر میں مبتلا ہو گئی تھی۔

☆.....☆.....

وہ کینٹین میں فرینڈز کے ساتھ بیٹھی تھی جب اس نے چائے سمو سے کے پیسے دینے کے لئے بینڈ بیگ کھولا تو اوپر ہی ایک خط اور گلاب کی کلی رکھی تھی وہ پریشان سی ہوئی۔

”کیا ہوا یہ اچانک چہرے پر بارہ کیوں بج گئے.....؟“ سامنے بیٹھی اریم نے اس کے فق پڑھتے چہرے کو دیکھ کر کہا تو اس نے خط اور گلاب سامنے کر دیا پھر سب متوجہ ہو گئیں۔

”ارے پھر ایک خط اور گلاب“ ساتھ بیٹھی ماریہ نے کہا۔

”مارہ آخر یہ ہے کون.....؟“ حرا کو بھی تجسس ہوا۔

”اگر مجھے پتا ہوتا تو ابھی میرے ہاتھ میں یہ خط اور گلاب نہ ہوتا۔“ وہ تنک کر بولی۔

”پر پھر بھی مارہ! تم کوئی اندازہ نہیں کر پائیں کہ یہ کس کی حرکت ہے.....؟“ اریم سنجیدگی سے بولی۔

”یہی تو سمجھ نہیں آ رہا کہ آخر بنے کون“ کہتے ہوئے اچانک سامنے کی طرف اس کی نظر اٹھی سامنے رمیس اپنے گروپ کے لڑکوں کے ساتھ باتیں کر رہا تھا اس کے دل میں اچانک پھر وہی خیال آیا 'نجانے کیوں اس کی چھٹی حس اسے رمیس کی طرف گنجل دے رہی تھی' پر پھر اس نے اپنے اس خیال کو جھٹک دیا 'کوئی ثبوت جو نہ تھا اس کے پاس۔'

☆.....☆.....

آج اس نے اپنی فرینڈز کے ساتھ اپنے گھر میں کمپائن اسٹڈی کا پروگرام بنایا تھا سب ہی ایک اہم موضوع کو دلچسپی سے ڈسکس کر رہی تھیں تبھی اس نے کچھ پوائنٹس نوٹ کرنے کے لئے بک کھولی تو ایک لیئر اور گلاب کی کلی گری کلی کچھ مرجھاسی گئی تھی 'نجانے کب کی اس کی بک میں رکھی تھی' اس نے تو دھیان ہی نہ دیا تھا 'اچانک سب کی بھی بے اختیار نظر اٹھی' مارہ پھر

پریشان سی ہو گئی۔

”مارہ یار! سمجھ میں نہیں آتا یہ آج کے اتنے ماڈرن دور میں اتنے دقیانوسی طریقے سے اظہار محبت کیوں کر سکتا ہے۔“ حرا نے مسخراڑایا۔

”بدھو! اسے دقیانوسی نہیں بلکہ سادگی کہتے ہیں۔“ اریم کو اس کی بات اچھی نہ لگی۔

”تم اسے سادگی کہہ رہی ہو یہ سادگی نہیں بلکہ ایک گھٹیا مذاق ہے کسی دل سے کھیلنا کوئی شریف حرکت نہیں ہوتی۔“ ماریہ سنجیدگی سے بولی۔

”ضروری نہیں ہے کوئی مذاق کر رہا ہو ہو سکتا ہے کوئی واقعی سنجیدہ ہو بس سامنے اظہار کرنے سے ڈرتا ہو۔“ اریم نے دلیل دی۔

”ناممکن..... کم سے کم مجھے ایسا نہیں لگتا۔“ ماریہ اٹل تھی اور مارہ پریشان سی خاموش تھی۔

”مارہ! تم فکر مت کرو مجھے نہیں لگتا کوئی تمہارے ساتھ مذاق کر رہا ہے دیکھ لینا بہت جلد سب کچھ تمہارے سامنے آ جائے گا۔“ اریم نے اسے دلا سادیا۔

”یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو.....؟“ ماریہ کو یقین نہ تھا۔

”بس یقین ہے میرا۔“ وہ اٹل تھی کچھ دیر تک ماحول میں گہری خاموشی چھا گئی پھر ان لوگوں نے اپنا ذہن دوبارہ بڑھائی میں مگن کر لیا پر مارہ کا ذہن نہ بٹ سکا وہ الجھ کر رہ گئی۔

☆.....☆.....

کتنے ہی دن اسی طرح الجھتے ہوئے گزر گئے خطوط کا وہی معمول تھا اب وہ کم پریشان ہوتی اور زیادہ سنجیدگی سے سوچتی اس نے جب وہ غزلیں غور سے پڑھیں تو ان کا چناؤ اسے کافی اچھا لگا۔

”مارہ! جب جب تمہیں دیکھتا ہوں تمہیں سوچتا ہوں اور سوچتا ہوں کیا تم کبھی میری ہو سکو گی.....؟ کیا میں تمہارے دل میں کبھی جگہ بنا پاؤں گا 'نجانے تم مجھے دیکھو گی تو کیساری ایکٹ کرو گی پر تم جو بھی کر د میں اپنے دل سے تمہاری محبت کبھی نہیں نکال سکتا اور تم سے ایک

دندہ بھی کرتا ہوں' میں ایک دن تمہارے سامنے آ کر اپنی محبت کا اظہار کروں گا اور تمہیں منانے کی ہر کوشش کر ڈالوں گا باقی میری قسمت تم مجھے ملو یا نہ ملو۔“ اس طرح کے کہنے ہی خط تھے اور اپنی سچی محبت کے دعوے بھی۔

نجانے اسے کیا کشش محسوس ہو رہی تھی وہ روزانہ خطوط کو لے کر بیٹھ جاتی اور ان کو بار بار پڑھتی 'نجانے کیسی خوشی سی ہونے لگی تھی گلاب کی کلیوں کی خوشبو اسے خوش کر دیتی۔

☆.....☆.....

اب وہ بار بار خود اپنی چیزیں چیک کرتی کہ کہیں کوئی خط تو نہیں ہے اور جب ہوتا تو دل بے اختیار زور سے دھڑکنے لگتا دل میں عجیب طوفان اٹھ رہا تھا اسے خود بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا وہ کیوں اتنا زیادہ محسوس کرنے لگی تھی۔

☆.....☆.....

ایک دن اچانک یونیورسٹی میں بارش شروع ہو گئی وہ یونیورسٹی میں ہی تھی اور اتفاق سے اس کے گروپ کی کوئی لڑکی نہ آئی تھی اسے ٹینشن ہو رہی تھی کہ اتنی طوفانی بارش میں وہ گھر کیسے پہنچے گی کبھی اسٹوڈنٹ جانے کی تنگ و دو میں لگے ہوئے تھے کچھ اپنی اپنی کنونینس کے ذریعے جارہے تھے تو کچھ بارش تھم جانے کا انتظار کر رہے تھے کہ بارش ہلکی ہو تو وہ جائیں وہ بھی ایک درخت کے نیچے کھڑی پریشان سی ادھر ادھر دیکھ رہی تھی اور انتظار کر رہی تھی کہ کسی طرح بارش ہلکی ہو تو وہ جائے تبھی اس کے پاس ایک بلیک کرولا آ کر رک کر کی مارہ چونکی گاڑی کے شیشے نیچے ہوئے تو سامنے حیدر کو دیکھ کر کچھ مطمئن ہوئی۔

”آؤ مارہ گھر ڈراپ کر دوں۔“ وہ ہمیشہ کی طرح اپنی سوہرہ شخصیت کے مطابق رسانیت سے بولا مارہ نے اسے منع کرنا مناسب نہ سمجھا اور گاڑی میں بیٹھ گئی اس وقت وہ اس کے لئے بڑا غنیمت ثابت ہوا تھا حیدر اس کا خالہ زاد تھا عمر میں اس سے دو تین سال بڑا تھا پر وہ

اپنی عمر سے زیادہ سنجیدہ اور بڑا لگتا تھا وہ بھی اسی یونیورسٹی میں پڑھتا تھا پر اس کا ڈپارٹمنٹ اور سبجیکٹ الگ تھے مارہ سے بھی کبھی کبھار ہی ملاقات ہوتی تھی حیدر کی شہیت بھی ایسی تھی کہ وہ زیادہ کسی سے فیری بھی نہیں ہوتا تھا زیادہ تر کزنز بھی اس سے ریزور ہی رہتے تھے خود مارہ بھی مشکل سے مخاطب ہوتی تھی اس سے۔

”گھر میں سب کیسے ہیں.....؟“ حیدر نے گہری خاموشی کو توڑا۔ مارہ جو کھڑکی سے باہر تیز ہرتی بارش کو دیکھنے میں محو تھی ایک دم چونکی۔

”جی ٹھیک ہیں۔“ وہ بامشکل بول پائی اس کے بعد ان کے بچ میں کوئی بات نہ ہوئی سارا سفر خاموشی سے کٹا۔

”اندر آئیے نا حیدر بھائی۔“ جب وہ گاڑی سے اتری تو مروٹا کہا۔

”نہیں پھر کبھی ابھی موسم کافی خراب ہے جلد ہی گھر پہنچنا ہے۔“ اس نے سہولت سے منع کر دیا۔

”ٹھیک ہے جیسی آپ کی مرضی بانی دادے گھر ڈراپ کرنے کا شکریہ۔“

”اس میں شکریہ کی کوئی بات نہیں میرے پاس کنونینس تھی تو تمہارے کام آ گیا۔“ مارہ اس کی بات پر ہلکا سا مسکرا دی۔

”خالہ جان کو اور باقی سب کو میرا سلام کہنا۔“

”جی۔“ وہ کہہ کر اندر آ گئی اور وہ تیزی سے سبھاڑی لے گیا۔

☆.....☆.....

روز بروز کے ملتے خطوط نے اس کے اندر اچھا تنک ہل چل مجا دی تھی وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اگر معاملے کو سوچنے لگی تھی یہ زندگی میں اس کے ساتھ پہلا ایسا اتفاق ہوا تھا چاہے جانے کا احساس اتنا خوبصورت ہو گا وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی وہ جو کوئی بھی تھا اس کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہو گئی تھی اور اب نجانے کتنی شہت سے یہ احساس جاگ اٹھا تھا کہ وہ کی طرح اس

کے سامنے آجائے۔

آج جب اسے رئیس نے اس کے نوٹس واپس کئے تو ان میں سے ایک خط برآمد ہوا اس کے تو پاؤں سے جیسے زمین کھسکنے لگی یہ سب خط رئیس دے رہا تھا اسے یقین نہ آ رہا تھا پر وہ کیوں چپکے چپکے ایسا کر رہا تھا اگر اس کے دل میں کچھ تھا تو وہ سامنے آ کر بھی تو کہہ سکتا تھا اس کا تو جیسے دماغ ہی ماؤف ہونے لگا کتنے ہی دن سوچتے ہوئے گزر گئے خط اسی طرح اسے روز مل رہے تھے وہ رئیس کے ایک ایک مودمنت کو غور کرتی کہ وہ اسے دیکھ کر کیساری ایکٹ کرتا ہے پر اس کا انداز ہمیشہ کی طرح فرینک ہوتا اور مائرہ کو کچھ سمجھ نہ آتا ایک سال پورا اسی طرح گزر گیا وہ پڑھائی میں خود کو پوری طرح مصروف کر دینا چاہتی تھی پر جب کوئی نیا خط ملتا تو وہ پھر ڈسٹرب ہو جاتی اب تو وہ بس اس انتظار میں تھی کہ ایک بار رئیس اس کے سامنے اظہار کرے تو وہ اسے خوب سنائے گی پر ایسا کچھ ہو ہی نہ سکا انہی گزرتے دنوں کے ساتھ اچانک ایک دن اس کی اماں کی طبیعت بے حد خراب ہو گئی گھر میں گویا کھرام ساچ گیا اس کے تو سبھی بہن بھائی شادی شدہ تھے بس ایک وہ بچی تھی۔ وہ تو تھی بھی پروین بیگم کی لاڈلی پروین بیگم کی دل کی تکلیف نے انہیں ہولا دیا تھا انہیں مائرہ کی بہت پریشانی تھی اگر ان کو کچھ ہو گیا تو ان کے بعد اس کا کیا ہوگا؟ ایسی صورتحال میں وہ چاہتی تھیں کہ کسی طرح اس کی شادی ہو جائے پر ایسے وقت میں اتنی جلدی مناسب رشتہ ماننا ناممکن تھا بچے ماں کو دلا سہ دے رہے تھے پر انہیں تسلی نہ ہو رہی تھی ایسے وقت میں ان کی بڑی بہن آگے بڑھیں اور حیدر کے لئے مائرہ کا ہاتھ مانگ لیا پروین بیگم کی تو خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی اور انہوں نے جھٹ ہاں کر دی مائرہ اس سب کے لئے بالکل تیار نہ تھی اس نے تو ایسی سچویشن کا خواب میں بھی نہ سوچا تھا وہ لاکھ منع کرتی پر ماں کی حالت اور آنسوؤں نے اسے کمزور کر دیا اس کے خواب ادھورے کے ادھورے رہ

گئے اس کے نئے جاگتے احساسات نے وہیں دم توڑ دیا جب وہ مائرہ سجاد سے مائرہ حیدر بن گئی۔ ان کی شادی بے حد سادگی سے ہوئی ان کی شادی کے چار ماہ بعد ہی پروین بیگم اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔

☆.....☆.....☆

اس کی زندگی نے اچانک ہی پلٹا کھایا تھا حیدر بہت اچھا تھا پر ابھی ان دونوں کے بیچ میں وہ بے تکلفی کا تعلق نہ بن سکا تھا حیدر نے اسے اس رشتے کو قبول کرنے کے لئے کافی ٹائم دے دیا تھا حیدر کی اسٹڈیز ختم ہو گئی تھیں اور وہ اپنی جاب میں مکمل مصروف ہو گیا تھا اور اس نے تو شادی کے بعد ہی تعلیم چھوڑ دی تھی اس کا وقت مکمل سوچوں اور خاموشی کی نظر کٹ رہا تھا گھر والے اس سے بہت اچھے سے پیش آتے پر اس کا دل پرسکون نہ تھا پہلے تو پروین بیگم کی موت کا صدمہ الگ تھا دوسرا اس شخص کا جس نے اس کے دل میں محبت کے دیپ جلائے تھے وہ تو اب بھی صحیح سے معلوم بھی نہ کر سکی تھی کہ وہ انسان رئیس ہے؟ اور اچانک سے یہ سب ہو گیا اس کے اندر اداسیوں نے ڈیرے جمائے تھے۔

☆.....☆.....☆

”حیدر بیٹا! میرے خیال میں تمہیں اور مائرہ کو کوئی مون پر جانا چاہئے۔ حیدر رات میں اسٹڈی روم میں بیٹھا آفس کا کچھ کام کر رہا تھا جب نرگس بیگم نے اسے گھیرے میں لیا وہ تو چونک سا گیا۔

”بیٹا! میں اس لئے کہہ رہی ہوں جتنی اچانک تم دونوں کی شادی ہوئی ہے اور جن حالات میں ہوئی ہے ایسے میں تم دونوں کو گھومنے پھرنے کے بہانے ایک دوسرے کو سمجھنے کا موقع ملے گا دیکھو بیٹا کہنے کو تم دونوں کی شادی کو دس مہینے ہو گئے ہیں لیکن مائرہ مجھے آج بھی اول روز کی طرح غمگین لگتی ہے بیٹھنی مون کے بہانے ہو سکتا ہے مائرہ ماحول میں تبدیلی پائے گی تو شاید کچھ بہل جائے گی۔“ نرگس بیگم نے بیٹے کے چونکنے پر رمانیت سے سمجھایا حیدر ماں کی بات پر کچھ خاموش سا

ہو گیا اور کچھ توقف کے بعد بولا۔

”ٹھیک ہے مجھے کوئی اعتراض نہیں آپ مائرہ سے پوچھ لیں۔“

”تم فکر مت کرو مائرہ کو میں منالوں گی بس تم جانے کی تیاری کرو۔“ وہ خوشی سے بولیں اور اٹھ کر چلی گئیں ان کے جانے کے بعد حیدر نے تھکے ہوئے انداز میں کرسی کی پشت سے سر نکا دیا نجائے آگے کیا ہونا تھا؟ اس کی زندگی کا کیا مستقبل تھا؟ اسے کچھ اندازہ نہ تھا مائرہ کا اداس اداس چہرہ اسے فکر مند سا کر دیتا۔

☆.....☆.....☆

نرگس بیگم نے سچ کہا تھا انہوں نے مائرہ کو جانے کے لئے منالیا تھا وہ لوگ گھومنے آسٹریلیا روانہ ہوئے تھے ان کا پورا سفر خاموشی کی نظر گزرا حیدر کچھ بول لیتا تو وہ جواب دے دیتی ورنہ وہ خاموش رہتی وہ دونوں کافی جگہ گھومے پر دونوں کے اندر خاموشی کے گہرے سناٹے تھے حیدر کافی کوشش کر رہا تھا اسے بہلانے کی پر اس کی کیفیت ہنوز برقرار تھی ابھی بھی وہ اسے ایک مال میں شاپنگ کروانے کے لئے لایا تھا تب حیدر کے موبائل پر ایک ضروری کال آ گئی وہ مائرہ سے تھوڑی دیر کے لئے ایکسکیوز کر کے وہاں سے ہٹ گیا وہ ہاتھ باندھے خاموشی سے کھڑی ارد گرد پر رونق ماحول کو دیکھ رہی تھی اچانک اس کی نظر کچھ فاصلے پر شاپنگ کرتے ہوئے رئیس پر پڑی گزرتے ہوئے ماضی نے دوبارہ ایک کروٹ لی تھی ایک تکلیف کی ٹیسیں اٹھ رہی تھی اس کے اندر۔ وہ خود کو لاکھ ضبط کرنے کے باوجود رئیس سے بات کرنے سے نہ روک سکی وہ صرف ایک بار اس سے پوچھنا چاہتی کہ اس نے کیوں اس کے ساتھ یہ خاموشی کا گھیل کھیل کیا؟ کیوں وہ اس کے دل کے ساتھ کھیلنا؟ کس نے اسے یہ حق دیا تھا رئیس اسے بھی یہاں دیکھ کر چونکا تھا وہ بہت خوش اخلاق کے ساتھ اس سے پیش آیا تھا پر مائرہ کے جارحانہ رویے پر وہ حیران رہ گیا تھا وہ کیا کہہ رہی تھی اس پر کیا الزام لگا رہی تھی اسے کچھ سمجھ نہ آ رہا تھا۔

”سنو مائرہ! تم آرام سے بات کرو تم کیا کہہ رہی ہو؟ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔“

”ہاں اب تو تم انجان ہی بنو گے کیونکہ تمہارا کھیل جو ختم ہو گیا ہے۔“ وہ اس وقت اپنے آپے میں نہیں تھی اور رئیس اس کی باتوں پر حیران تھا۔

”مائرہ! آؤ کہیں بیٹھ کر آرام سے بات کریں تم مجھے کھل کر بتاؤ بات اصل میں ہے کیا۔“ اس نے محل سے اسے سمجھایا مائرہ بھی کچھ ٹھنڈی ہو گئی وہ دونوں مال میں بنے ایک چھوٹے سے ریسٹورنٹ میں بیٹھ گئے رئیس کے فورس کرنے پر اس نے ساری کہانی اس کے گوش گزار کر دی وہ تو حق دق سارہ گیا۔

”مائرہ! میں تو تمہیں بہت میچورڈ سمجھتا تھا تم خود غور کرو اسٹوڈنٹ لائف میں اس طرح کے توندناق ہو جاتے ہیں اور تم اسے اتنا سیریس لے لوگی حیرت ہے۔“ رئیس نے سنجیدگی سے کہا اور مائرہ کچھ کنفیوژ سی ہو گئی۔

”دیکھو مائرہ! اس بات کو سوچ کر اپنی زندگی خراب مت کرو تمہاری شادی ہو گئی ہے تمہیں اپنے پریزیڈنٹ پر توجہ دینی چاہئے ناکہ پاسٹ میں اور رہی میری بات میری تو بچپن میں ہی ماموں کی بیٹی کے ساتھ ایجنٹ ہو گئی تھی اور میں اسے بہت پسند کرتا ہوں اس کے علاوہ کسی اور کا سوچ بھی نہیں سکتا۔“ اس نے اس کی بات کاٹ کر اسے سمجھایا مائرہ کو تو اب الگ پریشانی لگ گئی وہ تو خود سے نجائے کیا سوچے جا رہی تھی اور اسے کس صورتحال کا سامنا کرنا پڑا۔

”اپنا خیال رکھنا اور میری بات پر غور ضرور کرنا“ ٹیک کیئر چلتا ہوں۔“ رئیس ایک سو برسی مسکراہٹ پاس کرتا ہوا وہاں سے چلا گیا اور پیچھے مائرہ کو حیرانی کے سمندر میں چھوڑ گیا گلاس ڈور کی دوسری طرف حیدر نے یہ منظر صاف اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور وہ بھی کسی گہری سوچ میں پڑ گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

ود کھڑکی کی چوکت پر سر نکالے شام کے گھرے
سایوں کو دیکھنے میں محو تھی تب حیدر کی آمد نے اسے چونکا
یا وہ رئیس سے ملنے کے بعد اپنے حیدر کے ساتھ دوپٹے
پر کافی شرمندہ تھی اس سارے معاملے میں تو اس کا کہیں
بھی قصور نہ تھا پھر اسے کیوں سزا دی؟ رئیس ٹھیک کہہ رہا
تھا وہ شاید کسی کی شرارت ہی تھی اور اس نے بلا وجہ اتنا
سیریس لے لیا تھا اس نے نرمی سے حیدر کی طرف
دیکھا حیدر کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی حیدر نے
ایک کاغذ مارہ کی طرف بڑھایا جسے مارہ نے حیران
ہوتے ہوئے تھام لیا اور حیرت کا دوسرا جھٹکا اس میں
لکھی تحریر کو دیکھ کر ہوا ہو ہو ہی لکھائی وہی محبت بھرے
خوبصورت الفاظ وہ شاکد ہو گئی تھی۔

”سب.....؟“ وہ بمشکل بولی۔

”مجھے معاف کر دو میں تمہارا مجرم ہوں مجھے
احساس ہے میں نے تمہارے ساتھ بہت غلط کیا پر کیا
کرتا مجھے کوئی اور طریقہ سمجھ نہ آیا یا شاید مجھ میں اتنی
ہمت نہ تھی کہ اپنی محبت کے اظہار کے بعد تمہارے منہ
سے انکار سنوں۔ اس نے صاف گوئی سے کہا اور مارہ
اسے حیرت سے تنک رہی تھی کیسے کیسے شاکد ملے اسے
وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

”آپ کو ذرا شرم نہ آئی اس طرح کا گھٹاؤ نا کھیل
کھیلے ہوئے۔“ وہ پیش میں آ گئی۔

”نہیں مارہ! میرا یقین کرو میں نے کوئی کھیل نہیں
کھیلا میں تم سے سچ میں بہت محبت کرتا ہوں۔“ اس نے
نرمی سے کہتے ہوئے مارہ کے کندھوں پر ہاتھ رکھے
مارہ نے تیزی سے اس کے ہاتھ جھٹکے۔

”کسی کو چپکے چپکے اس طرح کے لیٹرز دینا
رومانوی باتیں کرنا اور سامنے نہ آنا کھیل ہی ہوتا ہے
آپ کو کس نے حق دیا تھا یہ سب کرنے کا؟ کیوں کیا
آپ نے ایسا؟“ وہ زار و قطار روتے ہوئے بولی اس کی
انا کو پیروں تلے روند ا گیا تھا۔

”مجھے معاف کر دو مارہ پلیز! ایک بار۔“ وہ

الٹا پیہ بولا۔

”معاف کر دوں۔۔۔۔۔؟ کیسے کر دوں آپ نے
ایک بار بھی نہ سوچا مجھے کتنی تکلیف ہوگی یہ سب جاننے
کے بعد اور اوپر سے آپ مجھے اب بتا رہے ہیں اتنا
وقت گزر جانے کے بعد۔“

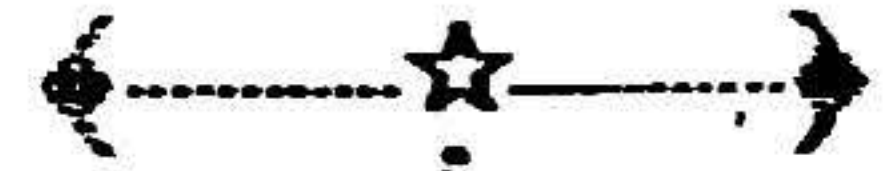
”میں تمہیں بتانا چاہتا تھا پر اچانک آنا نا ہماری
شادی ہو گئی اور بعد میں میں نے کتنی بار ہمت کی پر نجائے
کیوں تمہاری اداس صورت دیکھ کر ہمت ٹوٹ سی جاتی
کہ نجائے جب تمہیں اس بات کا علم ہوگا تو تم کیساری
ایک کرو گی؟ مجھے اریم نے بہت فورس کیا کہ تمہیں سب
بتا دوں پر۔۔۔۔۔“ وہ ایک دم کہتے کہتے رکا اسے لگا بے
اختیار اس کے منہ سے کچھ غلط نکل گیا اس نے خوف
سے مارہ کو دیکھا اس کا چہرہ حرید حیرت میں مبتلا
ہو گیا تھا۔

”اریم۔۔۔۔۔ کیا مطلب اریم؟ یہ اریم اس معاملے
میں کہاں سے آ گئی؟ حیدر! مجھے سچ سچ پوری بات
بتائیں اور کیا کیا آپ نے مجھ سے چھپایا ہے اور کتنے
دھوکے دینے باقی رہ گئے ہیں۔“ وہ چیختی حیدر نے اسے
نرمی کے ساتھ بیڈ پر بٹھایا۔

”مجھے غلامت سمجھو مارہ! میں نے تمہیں کوئی دھوکا
نہیں دیا شاید یہ سب میری بزدلی کا نتیجہ ہے اور رعنی
بات اریم کی وہ مجھے تم سے ملانے کی کڑی نین تھی میں
مانتا ہوں وہ لیٹرز میرے ہی کہنے پر وہ تم تک پہنچاتی تھی
پر یقین کرو ہمارا مقصد تمہیں ہرٹ کرنے کا نہیں تھا۔“

اس نے نرمی سے کہا۔
”واہ۔۔۔۔۔ کتنی آسانی سے آپ نے کہہ دیا آپ کا
مقصد ہرٹ کرنے کا نہیں تھا میری بیٹ فرینڈ کے
باتوں مجھ تک خط پہنچا سکتے ہیں پر آپ مجھ سے نہیں کہہ
سکتے یہ کیسی بزدلی ہے آپ کی حیدر! مجھے آپ کی کسی بھی
بات پر یقین نہیں آ رہا پلیز مجھے کچھ دیر کے لئے اکیلا
چھوڑ دیں۔“ اس کے لہجے میں کراہٹ واضح تھی اور
حیدر اس کی اس کیفیت سے پریشان ہو رہا تھا۔

”بر۔۔۔۔۔“
”پلیز۔۔۔۔۔ کچھ دیر کے لئے مجھے اکیلا چھوڑ دیں۔“
اس نے اس کی بات سننا حرید گوارہ نہ کیا حیرتوں کے
جنگلوں نے اس کا دماغ بالکل ماؤف سا کر دیا حیدر نے
اسے کچھ دیر کے لئے اکیلا چھوڑنا ہی مناسب سمجھا۔



ان کا ہنی مون ٹریپ ختم ہوا اور وہ دونوں اداس
اداس گھر واپس آ گئے۔ سچ میں حیدر نے کئی مرتبہ اس
سے بات کرنے کی کوشش کی پر اس نے بے رخی سے
صاف منع کر دیا کہ وہ کوئی بات کرنا نہیں چاہتی زندگی
واپس اپنے معمول پر چلنے لگی اب وہ اپنے آپ کو
معروف رکھنے کے لئے گھر کے کاموں میں مصروف
رہنے لگی تھی حیدر بھی اپنی جگہ خاموش سا ہو گیا تھا اریم کو
جب اس واقعہ کا علم ہوا تو اس نے معافی کے ساتھ اسے
سمجھایا بھی پر اس کے دماغ پر تو ایک ضدی سوار ہو گئی تھی
وہ اس حقیقت کو قبول ہی نہیں کر پار ہی تھی اس پر اریم کی
باتوں کے سمجھانے کا بھی کچھ اثر نہ ہوا الٹا اس سے
تاراض ہو گئی دن خاموشی کے ساتھ تیزی سے گزرنے
لگے جب وہ ان خطوں کو دیکھتی تو پھوٹ پھوٹ کر روتی
اسے یہ سب دھوکا لگ رہا تھا پھر آہستہ آہستہ اس نے
اس حقیقت کو تسلیم کر لیا پر دوسری طرف حیدر کی گہری
خاموشی اسے افسردہ کرنے لگی۔ اسے بہت رونا آتا
زندگی نجائے کیا امتحان لے رہی تھی اب جب وہ
چاہتی کہ حیدر اسے منائے تو وہ چپ سا دھ کر بیٹھ گیا ہر
گزرتا دن اسے اذیت میں مبتلا کر رہا تھا پھر ایک دن
خود ہی حیدر سے الجھ پڑی۔

”آپ کیوں میرے ساتھ ایسا کر رہے ہیں؟ اور
کتنی سزا دینی ہے مجھے آپ نے۔۔۔۔۔؟“ حیدر اس کی
بات پر اسے حیرت سے دیکھنے لگا۔

”ایسا کیوں کہہ رہی ہو میں بھلا کیوں سزا دوں گا
تمہیں۔“ اس کے لہجے میں میٹھا سنجی جس نے مارہ کو
بھی نرم کر دیا۔

”تو پھر آپ نے کیوں میرے ساتھ اتنا سرد رویہ
رکھا ہوا ہے۔“ حیدر کو اس کے زود ٹھے پن پر ہنسی آئی وہ
سمجھ گیا اس نے سب کچھ ایک سیٹ کر لیا ہے!
”میں تمہیں وقت دینا چاہتا تھا مارہ مجھے یقین تھا
کہ تم مجھ پر اعتبار ضرور کرو گی اس لئے میں نے تمہارے
ساتھ زبردستی نہیں کی۔“

”ہونہہ۔۔۔۔۔ پر آپ کو کیا پتہ آپ نے مجھے کتنی
تکلیف دی ہے۔“ اس نے پھر طنز کیا۔
”میں ماننا ہوں میری غلطی تھی تو کیا اب تم میری
اس غلطی کی ساری عمر سزا دو گی۔۔۔۔۔؟“ اس نے اپنا جرم
قبول کرتے ہوئے مصومیت سے اس کی آنکھوں میں
جھانکتے ہوئے پوچھا مارہ کو اس کی اس ایکٹنگ پر
مصنوعی غصہ آیا۔

”آپ بہت برے ہیں مجھے تو چاہئے تھا کہ آپ کو
ساری عمر سزا دوں۔“

”ارے یار! اتنی بھی بے رحم نہ بنو اس معصوم سے
انسان کو ایک بار معاف کر دو۔“ وہ بڑی عاجزی سے بولا تو
اسے ہنسی آ گئی اور دھیرے سے اس کے سینے پر سر رکھ دیا۔
”یعنی کے معافی مل گئی۔۔۔۔۔؟“ حیدر نے اس کے
گرد بازوؤں کا گھیرا ڈالتے ہوئے کہا۔

”میں نے ایسا تو نہیں کہا۔“ وہ اسے تنگ
کرنے لگی۔

”تو کہہ دو یار! میں ترس رہا ہوں۔“
”کس چیز کے لئے۔۔۔۔۔؟“ اس نے چھیڑا اسے۔
”بتاؤں کس چیز کے لئے۔“ حیدر نے بازوؤں
کے گھیرے کو مزید تنگ کر کے اس کا چہرہ اپنی طرف موڑا
تو وہ جڑبڑی ہو گئی۔

”حیدر پلیز۔۔۔۔۔“ اس نے خود کو چھڑانا چاہا پر اس کی
مضبوط گرفت سے خود کو آزاد نہ کروا پائی حیدر نے اس
کی کیفیت سے خوش ہوتے ہوئے فضا میں ایک جاندار
قبہ چھوڑا وہ بھی اس کے ساتھ مسکرا دی۔



صدف سعد

رواکی ڈائری

حناعلی کی ڈائری سے

سیماسراج کی نظم

دیکھ گردش زمانہ میں
کوئی فرق نہیں آیا
سورج کی کرنیں
آج بھی

دیوار سے اتر کر
میری کھڑکی تک آتی ہیں
چاند بھی

ساری رات میرے صحن میں چمکتا ہے
مرجھائے ہوئے پھولوں کی جگہ
تازہ گلاب کھلتے ہیں
فرق صرف اتنا ہوا ہے
وہ لڑکی

جو سرشام
تمہاری آہٹ کی منتظر رہتی تھی
رات بھر
اپنے بکھرے ہوئے خوابوں کی
کرچیاں چنتی رہتی ہے

دھنک ناز کی ڈائری سے

نازیہ کنول نازی کی نظم ”بنت حوا“
دنیا کے لئے ”رونق بازار“ ہوئی ہے

خود اپنے لئے باعث آزار ہوئی ہے
ہو کر کبھی کالی، کبھی کاری، کبھی وئی
فرسودہ روایات کا شکار ہوئی ہے
بیٹی جنے کو کون سے اس کا نصیب ہیں
میٹے کو جن کے بھی سدا خوار ہوئی ہے
اپنی مرضی، کبھی اس کی نہیں رہی
یہ خون کے رشتوں پہ ہی نثار ہوئی ہے
زندہ کبھی زمین میں دیا جاتا ہے اس کو گاڑ
ہو کر کبھی سستی یہ نذر نار ہوئی ہے
جیون کے ہر اک موڑ پر خود کو مٹا کر
اس بنت حوا کی سدا ہار ہوئی ہے
صدیوں پرانی بات ہو یا آج کا قصہ!
ہر عہد کی عورت سدا لاچار ہوئی ہے
اسنے بھی جذبے بھی ارمان دفنا کر
بھائی تو کبھی باپ پر نثار ہوئی ہے
کر کے فنا خود کو رکھتی ہے سب کو خوش
وائے نصیب پھر بھی گنہگار ہوئی ہے
ہے حسن کا نجات اور جنت کا وسیلہ
پھر بھی یہ ہمیشہ تار تار ہوئی ہے
ہر رشتے نے تکلیف سے اس کو کیا دوچار
ہر آن مصائب سے ہمکنار ہوئی ہے

عانیہ نیازی کی ڈائری سے

نوشی گیلانی کی غزل

اب کس سے کہیں اور کون سے جو حال تمہارے بعد ہوا

رداؤ انجسٹ [218] جولائی 2012ء

اس دل کی جھیل سی آنکھوں میں اک خواب بہت جبراد ہوا
یہ جبر ہوا بھی دشمن ہے اس نام کے سارے رنگوں کی
وہ نام جو میرے ہونٹوں پر خوشبو کی طرح آباد ہوا
اس شہر میں کتنے چہرے تھے کچھ یاد نہیں سب بھول گئے
اک شخص کتابوں جیسا تھا وہ شخص زبانی یاد ہوا
وہ اپنے گاؤں کی گلیاں تھیں دل جن میں ناچتا گا نا تھا
اب اس سے فرق نہیں پڑتا ناشاد ہوا یا شاد ہوا
بے نام ستائش رہتی تھی ان گہری سانولی آنکھوں میں
ایسا تو کبھی سوچا بھی نہ تھا دل اب جتنا بے داد ہوا

بسمہ علی کی ڈائری سے

قتیل شقائق کی غزل

اس ادا سے بھی ہوں میں آشنا تجھے اتنا جس پہ غور ہے
میں جیوں گا تیرے بغیر بھی مجھے زندگی کا شعور ہے
نہ ہوں مجھے مئے ناب کی نہ طلب صبا و سحاب کی
تری چشم ناز کی خیر ہو مجھے بے پیئے ہی سرور ہے
جو سمجھ لیا تجھے بے وفا تو پھر اس میں تیری بھی کیا خطا
یہ خلل ہے میرے دماغ کا یہ مری نظر کا قصور ہے
کوئی بات دل میں وہ ٹھکان کے نہ لہجہ پڑے تری شان سے
وہ نیاز مند جو سر بہ خم کئی دن سے تیرے حضور ہے
میں نکل کے بھی ترے دام سے نہ گروں گا اپنے مقام سے
میں قتیل جو رستم سہی مجھے تم سے عشق ضرور ہے

علشبہ ملک کی ڈائری سے

عبید اللہ علیم کی غزل

بنا گلاب تو کانٹے چھا گیا اک شخص
ہوا چراغ تو گھر ہی جلا گیا اک شخص
تمام رنگ مرے اور سارے خواب مرے
فسانہ تھا کہ فسانہ بنا گیا اک شخص

میں کس ہوا میں اڑوں کس فضا میں لہراؤں
دکھوں کے جال ہر اک سوچا گیا اک شخص
پلٹ سکوں میں نہ آگے ہی بڑھ سکوں جس پر
مجھے یہ کون سے رستے لگا گیا اک شخص
محبتیں بھی عجب اس کی نفرتیں بھی کمال
مری طرح کا ہی مجھ میں سا گیا اک شخص
وہ ماہتاب تھا مرہم بدست آیا تھا
مگر کچھ اور سوا دل دکھا گیا اک شخص
کھلا یہ راز کہ آئینہ خانہ ہے دنیا
اور اس میں مجھ کو تماشا بنا گیا اک شخص

شفیق خان کی ڈائری سے

تحسن نقوی کی غزل

پچھڑ کے مجھ سے بھی تو نے یہ بھی سوچا ہے
ادھورا چاند بھی کتنا اداس لگتا ہے
یہ ختم وصل کا لمحہ ہے رائیگاں نہ سمجھ
کہ اس کے بعد وہی دور یوں کا صحرا ہے
کچھ اور دیر نہ جھڑنا اداسیوں کے شجر
کے خبر تیرے سائے میں کون بیٹھتا ہے
یہ رکھ رکھاؤ محبت سکھا گئی اس کو
وہ روٹھ کر بھی مجھے مسکرا کے ملتا ہے
کچھ اس قدر بھی تو آساں نہیں ہے عشق تیرا
یہ زہر دل میں اتر کر ہی راس آتا ہے
میں تجھ کو پا کے بھی کھویا ہوا سار ہتا ہوں
کبھی کبھی تو مجھے ٹھیک تو نے سمجھا ہے
اسے گوا کے میں زندہ ہوں اس طرح محسن
کہ جیسے تیز ہوا میں چراغ جلتا ہے

☆☆☆☆☆
☆☆☆

رداؤ انجسٹ [219] جولائی 2012ء

اشعار

انجم..... رحیم یار خان
ملنے آئے ہو چھوڑنے کے لئے
اس تکلف کی کیا ضرورت ہے
ام فردہ..... کراچی
اب کے تجدید وفا کا نہیں امکاں جاناں
یاد کیا تجھ کو دلائیں تیرا پیاں جاناں
یوں ہی موسم کی ادا دیکھ کر یاد آیا ہے
کس قدر جلد بدل جاتے ہیں انسان جاناں
دھنک ناز..... کراچی
تیری صورت کو ترستی ہے تجھے کیا معلوم
روز یہ آنکھ بدست ہے تجھے کیا معلوم
ناز دلدار کبھی تو نے اٹھایا ہی نہیں
عشق کرنے میں جو مستی ہے تجھے کیا معلوم
عانیہ نیازی..... ربوہ
قدیم انسان راتوں کو بھی بے خبری سے سوتا تھا
جدید انسان کے گھر پر مگردن کو بھی پہرہ ہے
اسی باعث تو رشتوں میں کوئی گرمی نہیں سجدی
کہ اب انسان کے دل کا ہر اک اجساں مزدہ ہے
ثناء تنویر..... سکھر
مجھے تو آج بادلوں نے بتایا وحشی
وہ لوٹ آنے کے راستے تلاش کرتی تھی
سحر انجم..... کراچی
ہم شمع یقین کے پروانے
شعلوں سے محبت کرتے ہیں
اے زیست ہماری راہ سے ہٹ
ہم موت کی عزت کرتے ہیں
یعنی مرتضیٰ..... سیالکوٹ
ہر بل کی دوستی کا ارادہ ہے آپ سے
اپنا پن ہی کچھ اتنا زیادہ ہے آپ سے
نہ سوچئے گا صرف عمر بھر کے لئے

قیامت تک ساتھ بھانے کا وعدہ ہے آپ سے
حاملک..... خیر پور
اس کی دلیر پہ صدیوں سے کھڑا ہوں فراز
مجھ سے ملنے کے جو لحاظ رکھتا تھا
نور بانو..... کوئٹہ
میں بدلا نہیں سمجھنے کے انداز بدل گئے
بدلا نہیں انسان حالات بدل گئے
پہلے بھی تو ہوا کرتی تھی روز اک ٹکرا
اب ہر روز کی ٹکرا کے انداز بدل گئے
پلو شہ..... پشاور
اپنی یادیں اپنی باتیں لے کر بھول گیا
جانے والا جلدی میں قاتل کے بھول گیا
مڑ مڑ کے دیکھا تھا اس نے جاتے راستے میں
جیسے اس نے کہتا تھا کچھ جو وہ کہتا بھول گیا
نبیلہ ملک..... کراچی
تیری وفا کو ہم نے بھلایا کب ہے
ہر بل جدائی کا دل سے منایا کب ہے
دل لگا کر بھول جانا تیری عادت ہے
ہم نے تیرے سوا کسی اور کو چاہا کب ہے
ثناء حیات..... پشاور
شیشے کی طرح ٹوٹ کر گرے نہیں دیتا
یہ ضبط میرا مجھ کو کھرنے نہیں دیتا
ملا رہا ہے ہر بار نئے تجس میں مجھ کو
اک شخص مجھے خود سے بچھڑنے نہیں دیتا
رمشا ممتاز..... جمگ
میری سانس سے گزرتا ہے تیرا نام آج بھی
تیری یادوں میں ڈھلتی ہے میری شام آج بھی
حاملی..... ملتان
لگے کریں تو کیسے کریں فراز
دو بے وفا کسی گمراہ کو میرا ہے

رخسانہ نور..... فیصل آباد
لوگ کہتے ہیں میں بے وفا ہو گیا ہوں
زیادہ تو نہیں یاروں، مگر ذرا سا ہو گیا ہوں
اپنی چھوڑے کہاں کی اچھائی اور کہاں کی بُرائی
انہیں ملا کوئی اچھا تو میں بُرا ہو گیا ہوں
راحت علی..... لیہ
اپنی ناکامی کا ایک سبب یہ بھی ہے فراز
جو چیز مانگتے ہیں سب سے جدا مانگتے ہیں
رابوہ منیر..... سرگودھا
ہجر کی پیاس میں قطرہ بھی بہت ہوتا ہے
دید کے واسطے لمحہ بھی بہت ہوتا ہے
جن کے ملنے کی نہیں دور تک کچھ امید
ان کے کھوجانے کا خدشہ بھی بہت ہوتا ہے
عائشہ حق..... ملتان
وہ اس انداز کی مجھ سے محبت چاہتا ہے
میرے ہر خواب پہ اپنی حکومت چاہتا ہے
وہ کہتا ہے کہ میں اس کی ضرورت بن چکا ہوں
تو گویا وہ مجھے حسب ضرورت چاہتا ہے
اسرٹی سید..... قصور
اب خیند سے کچھ ہم سے صلح کر لے
دوہر چلا گیا جسکے لئے ہم جاگا کرتے تھے
سیرت منٹل..... لاہور
قاتلوں نے دل کی قربت کو بڑھا دیا ہے
آج اس کی یاد نے بے سبب رُلا دیا ہے
اس کو شکوہ ہے کہ مجھے اسکی یاد نہیں آج
ہم نے جسکی یاد میں خود کو بھلا دیا ہے
ثناء ملک..... کراچی
یادیں تیرے خلوص کی ڈستی ہیں آج بھی
ملنے کی آرزو میں ترستی ہیں آج بھی
آنکھیں ہزار ضبط کی کوشش کے باوجود
رُک رُک کے بار بار بدستی ہیں آج بھی
حیاتی..... کراچی
جانے اس شخص کو کیا یہ ہنر آتا ہے
رات ہوتی ہے تو آنکھوں میں اتر آتا ہے

میں اس کے خیال سے جاؤں تو کہاں جاؤں
وہ میری سوچ کے ہر رستے پر نظر آتا ہے
مریم علی..... فیصل آباد
رات کی خاموشی راس نہیں آتی
میری پرچھائی بھی اب میرے پاس نہیں آتی
کچھ آتی ہے تو بس تمہاری یاد!!!
جو آ کر ایک بل بھی مجھ سے دور نہیں جاتی
زرین شاہ..... پشاور
سر جھکاؤ تو پھر دیوتا بن جائے گا
اتامت چاہو اسے وہ بے وفا ہو جائے گا
روٹھ جانا تو محبت کی علامت ہے
کیا خبر تھی مجھ سے اتنا خفا ہو جائے گا
رباب کریم..... سیالکوٹ
کون تو لے گا اب ہیروں میں تمہارے آنسو
وہ جو اک ورد کا تاجر تھا دکان چھوڑ گیا
رمشہ سعید..... سرگودھا
اُسے پانے کی ہمت نہیں مگر کھونے کا حوصلہ بھی نہیں
عجب شخص ہے میرے مسئلے پر سوچتا بھی نہیں
کیسے سناؤں اُسے ہجر کے دنوں کی داستان
افسوس اس سے رہا اب رابطہ بھی نہیں
عروج مقصود..... خانوال
نظر سے نظر ملاؤ کے شام کٹ جائے
کوئی غزل ہی سناؤ کے شام کٹ جائے
یہ دوز رہتا تمہارا تو اک عذاب سنا ہے
ہمارے پاس تو آؤ کہ شام کٹ جائے
حمیرا اعجاز..... کمالیہ
میرے ہاتھوں میں کبھی حالات کی زنجیر نہ ہو
میرے خوابوں کی بھینک کہیں تعبیر نہ ہو
ہے قربتوں کا یہ موسم مگر اعتبار نہیں
تجھ سے مل کر ہی چھڑنا میری تقدیر نہ ہو
زینب علی..... وہاڑی
خوشی کی یہ سحر آنکھوں میں نمی لئے
ہزار غموں سے بھی یہ روشنی مدھم نہ ہوگی
☆☆☆

نورین ملک

اس ماہ میں

اس ماہ کے اقتباس

تکلیف کلام

تکلیف کلام بھی عجیب چیز ہے اور عجیب عجیب شکلیں اختیار کرتا ہے مثلاً بعض لوگوں کی گفتگو میں ان کی بیوی کے بھائی کا ذکر بڑی فرخندہ حالی سے ہوتا ہے ایک مرتبہ ایک صاحب جنہوں نے میرے علم کے مطابق ابھی ازدواجی زندگی کی ابتداء بھی نہیں کی تھی اپنے جوش گفتار میں ایک شخص کو اپنا سالانا دیا ہے میں نے ان کی یہ الفاظ سن کر نہایت سنجیدگی سے انہیں مبارک باد دی انہوں نے حیرت سے پوچھا ”کس چیز کی مبارک باد؟“ میں نے عرض کیا ”کہ مجھے معلوم تھا کہ آپ نے اس شخص کی ہمیشہ محترمہ کو اپنے عقد میں لے لیا ہے اگرچہ اس مبارک تقریب میں خاکسار کو یاد نہیں فرمایا مگر بھلا یہ خوشخبری سن کر آپ کو مبارکباد نہ دیتا۔“ میری یہ بات سن کر نہ معلوم کیوں وہ ذرا چپ سے ہو گئے شاید میں نے جو خیال ان کے دل میں ڈالا تھا اس کو حقیقت بنانے کے امکانات پر غور کر رہے ہوں گے۔

مشاق احمد یوسفی کی تحریر سے اقتباس

صباحر۔ ہارون آباد

کامیابی کا راز

”گداگری ختم کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ

بھیک دینے والوں کو ختم کر دیا جائے ایسے ہی اگر پولیس توجہ نہ دے تو چوری چکاری بھی ختم ہو سکتی ہے۔ یوں اگر آپ بڑھاپا ختم کرنا چاہتے ہیں تو اس کا یہی طریقہ ہے کہ سب کو بوڑھا کر دیا جائے یوں بھی ہمارے ہاں کون ہے جو بوڑھا ہونا نہ چاہتا ہو ہمارے ہاں تو سب سے بڑی دعا ہی یہ ہے کہ اللہ تمہاری عمر دراز کرے۔ ہزاروں سال جیو جو سیدھی سادھی بڑھاپے کی تمنا ہے ویسے اگر آپ پھر بھی بوڑھا ہونا نہیں چاہتے تو ایک کام کریں آپ کبھی بوڑھے نہیں ہوں گے اور وہ یہ ہے کہ بھی آئینہ نہ دیکھیں۔

ڈاکٹر یونس کی ”شیطانیاں“ سے اقتباس
انتخاب۔ عانیہ۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ

اس ماہ کا فلسفہ

اگر ہمیں دنیا کے اور دنیا کے ہر شے کے فانی ہونے کا یقین ہو جائے تو شاید کبھی بھی کسی شے اور اپنی عزیز ترین ہستی کو ہمیشہ کے لئے کھودینے کا دکھ ہماری رگوں میں درد اور پچھتاوا بن کر نہ اترے کیونکہ اگر ہمیں اتنی سی بات سمجھ میں آجائے کہ لازوال تو صرف خدا کی ذات ہے۔ باقی تو دنیا کی ہر شے ہر ذات فانی ہے اگر اس چھوٹے سے فلسفہ کو ہم سمجھ لیں تو کبھی بھی غموں اور پچھتاوے کے پتھر رہ رہ کر ہمارے دلوں کو مسمار نہ کریں۔

صدف۔ فیصل آباد

اس ماہ کی معلومات

- ☆ مٹی کو خدا نے ہفتہ کے دن پیدا کیا۔
- ☆ پہاڑ کو اتوار کے دن۔
- ☆ درختوں کو پیر کے دن۔
- ☆ برائیوں کو منگل کے دن۔
- ☆ نور کو بدھ کے دن۔
- ☆ جانوروں کو جمعرات کے دن۔
- ☆ آدم علیہ السلام کو جمعہ کے دن۔

(تفسیر ابن کثیر جلد 1 صفحہ 106)

دھنک ناز۔ کراچی

اس ماہ کی چھوٹی سی بات

کبھی کبھار ہماری زندگی میں آنے والے چند لوگوں کے ساتھ گزارے ہوئے لمحات اتنے قیمتی ہو جاتے ہیں کہ ان کی یاد بھلائی نہیں جاتی وہ لوگ جب قریب ہوتے ہیں تو دل کی دھڑکن بن جاتے ہیں لیکن پھر وہی ملنے والے ہم سے بچھڑ جاتے ہیں اور ہم اداس اور تنہا رہ جاتے ہیں۔

وریشا کنول۔ حیدر آباد

اس ماہ کی مزاحیہ غزل

حسن کی توپ کا گولہ مارا تیرا لکھ نہ رہے
تجھ پر گر جائے قطبی تارا تیرا لکھ نہ رہے
سردی اندر نہر کے بنے ساری رات کھلوتے
تو نہ آئی لایا لارا تیرا لکھ نہ رہے
بھینگی آنکھ کو اور بھی تو نے ترچھا کر کے دیکھا
دل پہ چل گیا کھنڈا آرا تیرا لکھ نہ رہے
بنلنگ کونسل والے تیری ہر شے قرتی کر دیں
چڑھ جائے تجھ پر قرضہ بھارا تیرا لکھ نہ رہے
دل کی چوری کے الزام میں پولیس کا چھاپہ پڑ جائے

پھڑپھڑایا جائے ٹبر سارا تیرا لکھ نہ رہے
ساری غزل سنا کر بھی نہیں ساڑا دل کا مکیا
ساڑا ہے بس اکوای نعرہ تیرا لکھ نہ رہے
انتخاب۔ عانیہ نیازی۔ ربوہ

اس ماہ کے اقوال

☆ کاہلی اور کم ہمتی دوا ایسی خامیاں ہیں جو آدمی کی ہر خوبی پر پانی پھیر دیتی ہیں۔

☆ مستقل مزاج ہونا سختی ہونے سے بھی زیادہ مشکل ہے۔

☆ کسی شے کے مقدر میں نہ ہونے کا یقین ہونے پر ترک تمنا زندگی میں سکون لے آتی ہے۔

☆ اس شے کے حصول کی کوشش کرنا ایک المیہ ہے جو مقدر میں نہیں۔

☆ کامیاب انسان بننے کے لئے ہمیشہ وقت کی دہلیز کو عبور کرنا پڑتا ہے۔

☆ کسی کے اچھے کام پر اس سے حسد نہ کرو بلکہ اس کو داد دینے کا ظرف رکھو۔

☆ برے دوستوں سے بچو کیونکہ وہ تمہارا تعارف بن جاتے ہیں۔

☆ ہماری غلطیاں ہمیں وہ سبق پڑھاتی ہیں جو ہمیں کسی مکتب سے نہیں ملتا۔

☆ آدمی کی قابلیت اس کی زبان کے نیچے پوشیدہ ہے۔

☆ کبھی کسی ایسی چیز کی خواہش نہ کرو جو پوری نہ ہو۔

☆ کسی کا دل مت دکھاؤ ہو سکتا ہے اس کے آنسو تمہارے لئے عذاب بن جائیں۔

سدرہ۔ لاہور

اس ماہ کا مزاحیہ قطعہ

دس روپے بھیک تجھ کو دے کر
یہ بتائیں نے کیا خطا کر دی

نورین ملک

خوشخبری

اولاد عطا فرما بے شک دینی و دنیائی دولت ہے۔
(سورۃ آل عمران آیت 38)

”ہمیں سیدھا راستہ دکھا“

”ہمیں سیدھا راستہ دکھا ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام فرمایا“۔ (سورۃ فاتحہ آیت 6 تا 5)
سیدہ نورین۔ کراچی

نبی کریم ﷺ کا فرمان مبارک ہے

”مبارک باد ہے اس شخص کے لئے جو اپنے عیوب پر نظر کر کے دوسروں کی عیب جوئی سے بچا رہا، مبارک باد ہے اس شخص کے لئے جس نے حلال کمائی خدا کی راہ میں خرچ کی، علماء کی اور عقل مندوں کی ہم نشینی اختیار کی اور غریبوں اور مسکینوں کے ساتھ چلتا رہا، مبارک ہے وہ شخص جو ضرورت سے بچا ہو، مال اللہ کی راہ میں خرچ کرے اور فضول گفتگو سے پرہیز کرے۔“ (صحیح مسلم)

شعبان کی ولادت مبارک

- 1- حضرت بی بی زینبؓ (1 شعبان)
- 2- حضرت امام حسینؓ (3 شعبان)
- 3- حضرت مولا عباسؓ (4 شعبان)
- 4- شہزادہ قاسمؓ (7 شعبان)
- 5- شہزادہ اکبرؓ (11 شعبان)
- 6- امام مہدیؓ (15 شعبان)

ام فروا۔ کراچی

قرآنی دعائیں

”ہم پر رحم فرما“

”اے ہمارے رب! ہم سے بھول چوک جو خطائیں ہو جائیں ان پر گرفت نہ کر! اے میرے رب! ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جو تو نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالے تھے، اے ہمارے رب! جس بوجھ کو اٹھانے کی ہم میں طاقت نہیں وہ ہم پر نہ رکھ ہمارے ساتھ نرمی کر، ہم سے درگزر فرما، ہم پر رحم فرما تو ہمارا مولیٰ ہے کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد فرما“۔

(سورۃ البقرہ آیت 286)

”ہمیں ثابت قدم رکھ“

”اے ہمارے رب! ہماری غلطیوں اور کوتاہیوں سے درگزر فرما، ہمارے کام میں تیرے جدوجہد سے جو کچھ تجاوز ہو گیا ہو اسے معاف فرما، ہمیں ثابت قدم رکھ اور کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد فرما“۔

(سورۃ آل عمران آیت 147)

”ہمیں معاف فرما“

”اے ہمارے رب! ہم ایمان لائے ہمیں معاف کر دے اور ہم پر رحم کر تو سب رحیموں سے رحیم ہے۔“ (سورۃ المومنون آیت 109)

”نیک اولاد عطا فرما“

”اے میرے رب! اپنی قدرت سے مجھے نیک

ایکھا درکشاپ میں میکینک کی نوکری کی تھی۔

1860ء میں سر جوزف وائٹ ورتھ سسٹم برطانیہ میں مشہور ہوا۔ آپ حکومت کے رائل کمیشن کو منتخب دیتے تھے۔ آپ انسٹیٹیوشن آف میکینک انجینرز کے صدر منتخب ہوئے تھے۔

1869ء میں آپ کو سر کے خطاب سے نوازا گیا تھا۔ 1887ء میں آپ کے نام سے اسکالر شپ طالب علموں کو دی جانی شروع ہوئی جو انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔

ریٹائرمنٹ کے بعد اپنا وقت باغبانی اور کھیتی باڑی میں گزارا کرتے تھے۔ 83 سال کی عمر میں 1887ء میں آپ نے موت کو لبیک کہا۔
پروفیسر واجد گینوی۔ کراچی

اس ماہ کے لطیفے

ایک سردار جی کو ہاسپٹل کی نرس سے محبت ہو گئی پر انہیں سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ انہیں یہ کیسے بتائیں، کافی دن وہ یہی سوچتے رہے آخر کار انہوں نے لویئر لکھنے کا سوچا اور ہمت کر کے خط لکھ لیا۔ خط میں لکھا تھا۔

”آئی لو یو سیسٹر!“

..... سیرہ افضل۔ انٹک

تصدیق

جج نے گواہ سے پوچھا۔
”آخر تم اتنے یقین سے کیسے کہہ رہے ہو کہ چوری طرز نے ہی کی ہے؟“
گواہ جو مسلسل جرح سے گھبرا گیا تھا، گھبراہٹ میں بولا۔
”مم..... میں خود اس کے ساتھ تھا، جج صاحب!“
پروین رمضان۔ جلاپور پیر والہ

اور بھی سینکڑوں کنوارے تھے
میری شادی کی ہی دعا کر دی

عمارہ خان۔ پشاور

اس ماہ کی خوبصورت بات

☆ فاصلے بڑھ جائیں تو دلوں کے بندھن کمزور نہیں پڑتے، کبھی کبھی ٹوٹ جاتے ہیں انتظار نہیں مرنے ہے آنکھوں میں منجمد ہو جاتا ہے ہاں! بس آنکھیں مرجاتی ہیں۔

نوشین مدثر۔ لاہور

اس ماہ کا سائنسدان

دنیا کے عظیم سائنسدان سر جوزف وائٹ ورتھ برطانیہ کے علاقے انگلینڈ کے باشندے تھے۔ آپ کے بنائے ہوئے نٹ بولٹ آج بھی دنیا میں مشہور ہیں، آپ چے شائر کے مقام اشاک پورٹ میں 1803ء میں پیدا ہوئے۔ بارہ سال کی عمر میں اپنے باپ کے پرائیویٹ اسکول میں تعلیم حاصل کی تھی۔ اپنے چچا کے ساتھ اسکول کی تعلیم کے بعد کائن مینوچرز کی تیاری میں مددگار ہوئے تھے۔

عظیم سائنسدان سر جوزف وائٹ ورتھ نے 22 سال کی عمر میں خاتون فنی اینکریز سے شادی کی تھی۔ لندن میں آپ مشہور موجد ہنری ماڈسل کے ورکشاپ پر کام کرتے رہے تھے۔ دو موجدوں جوزف کلیمنٹ اور جیک ہولٹ زائل کے پاس ورکشاپ میں آپ کو تجربہ حاصل ہوا تھا، مانچسٹر میں آپ نے فیشن ٹول انڈسٹری جوزف وائٹ ورتھ ٹول میکر فرام لندن کے نام سے قائم کی تھی۔

عظیم سائنسدان سر جوزف وائٹ ورتھ نے اٹھارہ سال کی عمر میں خاندان سے بچھڑ کر مانچسٹر میں

بڑے لوگوں کی بڑی باتیں

☆ جھوٹ بول کر جیت جانے سے بہتر ہے سوچ بول کر ہار جاؤ۔ (حضرت علیؓ)

☆ مومن کے لئے ہر وہ دن عید ہے جس دن وہ گناہ نہ کرے۔ (حضرت علیؓ)

☆ جب تم کسی دوسرے کے عیب ذکر کرنا چاہو تو اپنے عیب یاد کرو۔ (حضرت ابن عباسؓ)

☆ گلے، شکوے سے زبان کو بند رکھو راحت نصیب ہوگی۔ (شیخ سعدیؒ)

☆ اپنی اولاد کو تیر اندازی، گھڑ سواری اور تیراکی کی تعلیم دو اور انہیں تاکید کرو کہ دوسروں کی بے آبروئی نہ کریں۔ (حضرت عمرؓ)

☆ اے لوگوں اللہ کا ذکر کرو اس میں شفا ہے اور عیب جوئی نہ کرو اس میں بیماری ہے۔ (حضرت عمرؓ)

سونیا خان۔ بھکر

فرمان علیؓ

”تم اچھا کرو اور زمانہ تم کو برا سمجھے یہ تمہارے حق میں بہتر ہے بجائے اس کے کہ تم برا کرو اور زمانہ تم کو اچھا سمجھے۔“

ماہ نور۔ کراچی

قبرستان

بچہ ”دادی آپ نے کون کون سے ملک گھومے ہیں؟“

دادی ”بیٹا پاکستان، ہندوستان، تاجکستان۔“

بچہ بھرپور اشتیاق سے پوچھنے لگا ”اب کہاں گھومیں گی؟“

”بیٹا قبرستان“ دادی کے بجائے دادا نے فوراً جواب دیا۔

حناعلی۔ ملتان

سزا

”ٹیچر“ میں تمہاری حرکتوں سے تنگ آ گیا ہوں اب بتاؤ تمہیں کیا سزا دوں۔“

”بچہ“ سزا وہ جو آخری سیٹ پر پچی بیٹھی ہے اس کے ساتھ کلاس سے باہر نکال دیں۔“

رابعہ۔ اسلام آباد

نسیکی

ایک سردار نے ڈوبتے ہوئے بچے کو سمندر سے باہر نکالا مگر کچھ ہی دیر بعد اس نے بچے کو واپس سمندر میں ڈال دیا۔

کسی نے پوچھا یہ کیا کیا؟ تو سردار نے کہا ”جی پرانی کہاوت یاد آگئی تھی نسیکی کر دریا میں ڈال۔“

نسیب مبشر۔ سیالکوٹ

خوش فہمی

”ٹیچر“ بتاؤ خوش فہمی کیا ہوتی ہے؟“

”بچہ“ سر آپ کو مس ارم بلا رہی ہیں۔“

”ٹیچر نے مڑ کر پیچھے دیکھا تو کوئی نہیں تھا، ٹیچر نے حیرت سے کہا ”مگر یہاں تو کوئی بھی نہیں۔“

”بچہ جلدی سے بولا ”سراسر کوئی خوش فہمی کہتے ہیں۔“

حورینہ منزل۔ وہاڑی

وعدہ.....!

وعدہ بھی بڑا عجیب لفظ ہے اس ایک لفظ پر انسان پوری زندگی گزار دیتا ہے وعدے کے بارے میں کوئی کچھ کہتا ہے تو کوئی کچھ۔ کچھ لوگ وعدے کے اتنے کپے ہوتے ہیں کہ وعدہ پورا کرنے کے لئے جان بھی دے دیتے ہیں جبکہ کچھ لوگوں کے لئے وعدہ اک مذاق سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا ایسے لوگ وعدے نبھانے کے لئے نہیں بلکہ توڑنے کے لئے کرتے ہیں۔

پتہ نہیں لوگ وعدے توڑتے کیوں ہیں؟ شاید دوسروں کے جذبات سے کھیل کر وہ تسکین محسوس کرتے ہیں۔

وعدے کا اک نام امید ہے اور کہتے ہیں کہ ”امید پر دنیا قائم ہے“ لوگ سمجھ جانے کے باوجود وعدوں پر اعتبار کرتے نظر آتے ہیں۔ ایسے ہی میرے ساتھ بھی کسی نے وعدہ کیا تھا۔ زندگی بھر ساتھ رہنے کا لیکن! پتہ نہیں اس کی کوئی مجبوری تھی یا وہ بھی محض میرے جذبات سے کھیل رہا تھا پھر بھی میں زندگی بھر اپنے وعدے کی خاطر اس کا انتظار کروں گا۔

”ہم وفا کرتے رہے وہ جفا کرتے رہے۔“

اپنا اپنا فرض تھا دونوں ادا کرتے رہے۔

ایس امتیاز احمد۔ کراچی

خوشبو

☆ صبر میں کوئی مصیبت نہیں اور رونے میں کوئی فائدہ نہیں۔ (ابوبکر صدیقؓ)

☆ مصائب کا مقابلہ صبر سے اور نعمتوں کی حفاظت شکر سے کرو۔ (حضرت علیؓ)

☆ اپنے دشمنوں سے بھی محبت رکھو کیوں کہ اللہ تعالیٰ اپنے سورج کو نیک اور بد دونوں پر چمکاتا ہے۔ (حضرت عیسیٰؑ)

☆ ناراضی کے خیال سے حق بات دوستوں کو نہ بتانا حق دوستی نہیں۔ (مجدد الف ثانیؒ)

☆ دوسروں کا بوجھ اٹھانا عابدوں کی عزت کا متممہ ہے۔ (حضرت عثمان غنیؓ)

☆ عقل مند ہمیشہ غم و فکر میں مبتلا رہتا ہے۔

☆ عالم وہی ہے جس کا اپنے علم پر عمل ہو۔ (حضرت علیؓ)

☆ انسان کے پاس ایک ایسی قوت ہے جو مستقبل میں جھانک سکتی ہے پر اس وقت بے دار

ہوتی ہے جب حواس خمسہ سو رہے ہوں اور دماغ مشاہدات کی مذاہلت سے آزاد ہو۔ (حضرت امام جعفرؑ)

دھنک ناز۔ کراچی

ہم سے پوچھیے

☆ عورت سب سے زیادہ کس چیز سے خوف کھاتی ہے؟

○ حسین ترین عورت سے۔

☆ خواتین کو کم عقل کیوں سمجھا جاتا ہے؟

○ اس لئے کہ وہ مردوں کی تمام حماقتوں سے واقف ہوتی ہیں۔

☆ عورت مرد کے مقابلے میں اپنا خیال بار بار کیوں بدلتی ہے؟

○ مرد خیال کئے بغیر عورت جو بدل لیتا ہے۔

☆ شادی کے موقع پر موسیقی کا انتظام کیوں ہوتا ہے؟

○ دولہا کو یقین دلانے کے لئے کہ آج خوشی کا موقع ہے۔

☆ اپنی بیوی کو طلاق دینے کے بعد آپ کس سے شادی کریں گے؟

○ اپنی بیوی کی بہن سے تاکہ نئی ساس سے نجات مل جائے۔

بسمہ علی۔ سکھر

کچھ لوگ

☆ حسین یادوں کی طرح ہوتے ہیں جنہیں یاد کر کے دل خوش ہو جاتا ہے اور جن کو بھلنا ناممکن ہے۔

☆ گھروں کی طرح ہوتے ہیں وہ چاہے کتنی ہی دور کیوں نہ ہوں دل ان کی روح میں سمٹ جانے

سینک

۰۰

یہی عادت اگر ان کی بدل جائے تو کیا ہوگا
ہمیشہ کی طرح پھر دل کو سمجھا کر چلے ہیں ہم
یہ ان کو دیکھ کر بے تاب ہو جائے تو کیا ہوگا
لبوں پر سانس اٹکی ہے نظر ہے منتظر امتیاز
ہمارے بعد وہ تشریف بھی لائے تو کیا ہوگا
ایس امتیاز احمد

غزل

اجڑے ہوئے لوگ بھی عجیب ہوتے ہیں
ہر شخص کے اپنے اپنے نصیب ہوتے ہیں
کوئی جا کے جہاں میں نہیں ہے آتا
خوف کے سائے کتنے مہیب ہوتے ہیں
خیالوں میں آ کے جو مٹتے نہیں کبھی
وہ کتنے پیارے میرے حبیب ہوتے ہیں
تھک ہار کے سو جاتا ہوں آخر کار
جذبہ زندگی کے کتنے قریب ہوتے ہیں
جب بھی آئے گا گزرے دنوں کا خیال جاوید
زاویے حسن کے بھی پھر کتنے عجیب ہوتے ہیں
محمد اسلم جاوید

زندگی

کبھی کبھی زخم زندگی میں ایسے ملتے ہیں
جن سے ہر لمحہ لہو رستا ہے

”رمضان المبارک“

اسلام کا مبارک مہینہ قریب آ رہا ہے
خوشیوں کا یہ زمانہ پھر آ رہا ہے
دنیا کے مسلمانوں کا یہ اہم زمانہ
چاند دیکھتے ہی مبارک باد یوں کا چلے آتا
لوگ چھتوں پر چاند ہیں دیکھنا چاہتے
شور تو بہت ہے خود بھی دیکھنا چاہتے
باہر وقت سحری صدائیں سنیں گے
کس شوق سے سحری کھانے اٹھیں گے
بار بار نگاہیں گھڑی پر پڑیں گی
سحری کے وقت کو پابند کریں گی
اذان سنتے ہی کھانا ہے ختم کرنا
کس شوق سے وضو کرنا اور نماز پڑھنا
دل سے دعائیں کرنا عبادت ہی ہے
فرخ سلطانی

غزل

ہماری آنکھ میں گرا شک بھر آئے تو کیا ہوگا
گلہ ان کا سمجھ کر وہ بگڑ جائے تو کیا ہوگا
بھری محفل میں یاد رفتہ تنہا کر گئی اے دل!
اگر تنہائیوں میں یہ چلی آئے تو کیا ہوگا
اب عادی ہو گئے ہیں اس قدر ہم بے نیازی کے

تھا۔ بھاری نے جواب دیا ”ورنہ لوگوں نے میرے
ساتھ ہمیشہ ہمدردی اور محبت کا ہی سلوک کیا ہے۔“
رابعہ شیخ۔ رحیم یار خان

قابل دید

ٹیچر نے کلاس روم میں دیکھا کہ پچھلی بینچ پر بیٹھا
ہوا ایک لڑکا کبھی منہ چلا رہا ہے اور کبھی عجیب عجیب
شکلیں بنا رہا ہے۔ ”اے فائر!“ ٹیچر نے اسے پکارا۔
”یہاں سامنے آؤ اور جو کچھ تمہارے منہ میں
ہے مجھے دے دو۔“ ”کاش میں ایسا کر سکتا ٹیچر“
فاخر نے کراہتے ہوئے کہا۔ ”میرے منہ میں تو
چھالے ہیں“

ریحانہ۔ ملتان

آنسو

☆ جہنم کی آگ کو وہی آنسو بجھا سکتے ہیں جو
وقت سحر ایک مومن کی آنکھ سے ٹپکیں۔
☆ جس طرح پھول کا حسن خوشبو دل کا حسن یاد
زندگی کا حسن آس اور انسان کا حسن اخلاق ہے اسی
طرح آنکھوں کا حسن آنسو ہیں۔
☆ کبھی کبھی انسان زیادہ دکھوں کے باوجود ایک
آنسو نہیں بہا سکتا اور کبھی یہ آنسو خوشی کے اظہار کے
لئے آنکھوں سے چھلک پڑتے ہیں۔

☆ آنسو وہ انمول موتی ہیں جن کے آگے ہر چیز
ماند پڑ جاتی ہے یہ پھر دل انسان کو بھی موم بنا سکتے ہیں۔
☆ تمہیں اس دن پر آنسو بہانا چاہیے جو نیکی کے
بغیر گزر گیا۔

صائمہ۔ کراچی

☆☆☆☆☆

☆☆☆

کے لئے بے چین رہتا ہے۔

☆ دعاؤں کی طرح ہوتے ہیں ابھی ہم سجدے
میں سر جھکاتے ہیں کہ وہ اشکوں کی طرح ہماری
آنکھوں سے ٹپک پڑتے ہیں۔

☆ خطوط کی طرح ہوتے ہیں جنہیں بار بار پڑھ
کر بھی دل نہیں بھرتا اور دل چاہتا ہے کہ وہ ہمیشہ
ہمارے آس پاس رہیں۔

☆ اور کچھ لوگ نگاہ کی طرح ہوتے ہیں اگر وہ
ہمارے ساتھ ہوں تو اندھیرے میں بھی راستہ مل
جاتا ہے۔

شمالہ ملک۔ کراچی

کردار

ایک صاحب گائے خریدنے منڈی گئے تو انہوں
نے دیکھا کہ ایک آدمی ایک ہی جیسی دو گائے لئے
کھڑا ہے دونوں گائے میں کوئی فرق نظر نہیں آ رہا تھا
ایک ہی قد کا ٹھ ایک جیسا رنگ اور ایک ہی جیسی صحت
یوں لگتا تھا کہ جیسے دونوں جڑواں ہوں ان صاحب
نے دام پوچھے تو مالک نے کہا ”ایک کے 10 ہزار
روپے اور دوسری کے 20 ہزار روپے“۔ ان صاحب
کو بڑا تعجب ہوا اور انہوں نے قیمت کے اس فرق کی
وجہ پوچھی مالک نے کہا ”صاحب جی! آخر کردار کی
بھی تو کوئی قیمت ہوتی ہے۔“

رکیہ بلال۔ کوئٹہ

مقام شکر

”کیا کبھی کسی نے تمہیں اپنے ہاں کام کا ج یا
کوئی ملازمت وغیرہ کرنے کی پیشکش کی؟“ ایک
صاحب نے ایک پیشہ ور بھکاری سے پوچھا۔
”جی ہاں..... صرف ایک مرتبہ ایسا اتفاق ہوا

مگر سینے کی اجازت نہیں ملتی
اور کبھی حاکم وقت کی حکومت میں
ہمیں کاٹ بھی دیا جاتا ہے
مگر کسی کو بتانے کی اجازت نہیں ملتی
اور کبھی جو زخم میں پنہاں درد طوفان مچاتا ہے
مگر! اُسے باہر آنے کی اجازت نہیں ملتی
پھر بھی اگر جو کوئی
ہمت و جرات کر ہی لیتا ہے
پھر اس کو زندگی بھر زنداں سے باہر آنے کی
اجازت نہیں ملتی

شاید! حاکم وقت کو یہ ڈر ہوتا ہے
کہ ان کے نکلنے ہی ہمیں دھریا جائے گا
مگر وہ یہ کیوں بھول جاتے ہیں
کہ ان سے بڑا بھی ایک حاکم وجود رکھتا ہے
جو ان کے کسی کو قید کر لینے پر بھی
سب خبر رکھتا ہے سب نظر رکھتا ہے

صائمہ ناز

بھلا کیسے

ممکن ہوئی کیسے
تیری میری جدائی.....؟
وہ مدھ بھری باتیں
مہکی ہوئی راتیں
تیری قربتوں میں
گزری ہوئی شا میں
بھلا..... کیسے.....

بھلا..... کیسے.....

وہ سب بھول کر
جدائی آڑے آ گئی
انا کے بیچ اپنی
رسوائی آڑے آ گئی
اور.....
جدائی.....
جیت گئی.....

سمیرا غزل حکمت اللہ صدیقی

کینوس

خدا کرے کہ تو جب بھی
کینوس پر رنگ بکھیرے
رنگوں کا قطرہ قطرہ جی اٹھے
اور میرے عکس میں ڈھل جائے
تو چاہے نہ بھی بنانا میری تصویر
خود بخود میرا چہرہ بن جائے
تو مجھ کو رنگوں سے سجا کر زندہ کر دے
میری تصویر میں جینے کی امنگ پیدا کر دے
میں ذرا ہاتھ بڑھا کر تجھے چھونا چاہوں
تیری رنگوں کی دنیا میں جینا چاہوں
میں تجھے دیکھ کر رعب سے یہ دعا مانگوں
میں تو بس تیرے ہی سنگ رہنا چاہوں
یوں ہی تصویر سے مصوٰر کا رشتہ جڑ جائے
کا مران شمشاد قاسمی

غزل

معاشرے میں بڑا مقام تھا میرا

سب کے لئے حکم پیغام تھا میرا
جب سے تو میری زندگی میں آیا ہے
میری ہوئی بڑی رسوائی ہے
وہ بھی چھوڑ گیا اب مجھ کو
جو ذاتی غلام تھا میرا
اغیار کے ہاتھوں میں کھیل کر تو نے
کچل ہی ڈالا تھا ہر ارماں میرا
اب جو نیا احساس تم میں جاگا ہے
جان لو کہ یہ اعتماد تجھ پر دھاگا ہے

پروفیسر ڈاکٹر واجد گینوی

آوارگی

اے آوارگی
جائیں کہاں
وہ جس کی ہے آرزو
جسے ڈھونڈا ہے ہر سو

ملے گا کہاں
اس کا نشان
آوارگی.....

یہ گلیوں کے پھیرے
بھٹکتے رہنا نگر نگر شام سویرے
یہ وحشتوں کا سلسلہ کبھی رکے گا کہ نہیں
یہ بادِ جنوں ٹھہرے گی کہاں
ملے گا چین کہاں
آوارگی..... اے آوارگی

روحان دانش

غزل

مجھے کچھ یاد آ گیا وہ کچھ بھولتا گیا
احساس کی کئی منزلوں سے میں گزرتا چلا گیا
میرے دل کی اداسیاں بڑھنے لگیں جب
تو جام پہ جام میں پیتا چلا گیا
بدلیں گے کبھی حالات میرے بھی
اسی سوچ کے سہارے میں جیتا چلا گیا
ہو جاؤں گا مضطرب یہ سوچ کر میں
رُکا نہیں تیرے شہر سے گزرتا چلا گیا
میری سادگی نے مجھ کو آگے بڑھنے نہیں دیا
اور میرے سامنے زمانہ بدلتا چلا گیا
بڑھنے لگی جو عام فرقہ واریت مسجد میں
تو مسجد سے نکلا اور میں مندر چلا گیا
عام عزیز

غزل

چل سا جن میرے چل چلیں
چنے پھول سارے چل چلیں
خوشبو رنگ نظارے سارے
آ بھرنے دامن چل چلیں
نغمہ زندگی گنگنائے قدم جمانے
گیت لبوں پر سجائے چل چلیں
دیکھو منتظر ہے ایک جہاں ہمارا
محبت سانس میں اتارے چل چلیں
خوب آنکھوں میں سجائے تھام لو ہاتھ
محبت فاتح عالم سب جانیں چل چلیں

ہم آزاد پنجی زیت بر کرنے
چاند کے پار اتم آ چل چلیں

انہم خان

غزل

کہاں تمہا کہاں سے چلتا تھا
میں دیا تھا مجھے تو چلتا تھا
غم ہی غم زندگی میں تھے لیکن
دور تک ان کا کوئی حل نہ تھا
تھی سب ہی کے لئے حیات اس کی
میری خاطر تو اک بل نہ تھا
میں تھا سورج جہاں خواہش کا
اور بہر حال مجھ کو ڈھلتا تھا
مل گیا جب مجھے کوئی دشمن
میرے ماتھے پر کوئی مل نہ تھا
میری راہیں جدا تھیں اوروں سے
اور اکیلے سفر میں چلتا تھا
مسکراتا غموں میں بھی میرا
دکھ کی چھائی پہ سوگ دلنا تھا
جانے والا چلا گیا لوگو
میرا انجام ہاتھ ملتا تھا
سب نے روکا بہت بہاروں کو
میں وہ گل تھا خزاں میں پلٹا تھا
میرے چھوٹے سہل میں عالم تھا
اور میں دریا دلوں کو کھلتا تھا
میں سحر کا چراغ تھا ساجد
مجھ کو شب تابہ سحر چلتا تھا

محبت مل نہیں سکتی

ہمیشہ محبت مل نہیں سکتی
یہ تم اکثر مجھ سے کہتے تھے
اور میں خدا میں آ جاتی
تم سے خدا ہو جاتی
کہ ایسا کیسے ممکن ہے؟
جب دلوں میں سچائی ہو
تو محبت میں جدائی کیسے ممکن ہے؟
تم نہں کر میری باتوں کو ٹال جاتے تھے
اور آج اک مدت ہوئی تم سے دوں ہوئے
میں نے جانا کہ تم سچ کہتے تھے
ہمیشہ محبت مل نہیں سکتی

نورین ملک

غزل

تمہارے عکس کو آنکھوں میں ہم تصویر کر لیتے
ذرا جو تم ٹھہر جاتے کوئی تدبیر کر لیتے
تمہارا ہاتھ میرے ہاتھ سے یوں چھوٹ جائے گا
لگے مجھ کو خبر ہوتی اسے زنجیر کر لیتے
سہیرے خوب تھے میرے تیری جھل سی آنکھوں میں
ہم ان میں ڈوب جاتے اور پھر تعبیر کر لیتے
چھڑتے وقت چہرے پر جو صدیوں کی اداسی تھی
اگر ہم ہوش میں ہوتے اسے تحریر کر لیتے

ناصر عباس

کچھ یادیں

سید ساجد شفیق اک لکھنؤ نام ہے

روڈ انجسٹ [232] جولائی 2012ء

میری مٹی ہوئی یادوں میں

دھندلا سا اک چہرہ ہے

سوئی ہوئی سی ان آنکھوں میں

بے نام سا چہرہ

جو اکثر آتا ہے یاد باتوں میں

یہ سب کیوں یاد آتا ہے

کھو جاتی ہوں جب خیالوں میں

کچھ سوچ کر آنکھیں بھر آتی ہیں

برسات کی بھگی راتوں میں

حقائق اکثر وہ نہیں ہوتے

نظر آتا ہے جو کچھ خوابوں میں

فرزانہ شوکت

غزل

منا ہے تیرے دل میں میری چاہ سائی ہے
یہ تو جرم محبت ہے اس میں تو بہت رسوائی ہے
لجھ بھر کے لیے جو تیری چاہ میں میں مسکرائی تھی
اس خوشی کی قیمت میں نے آنکھوں سے چکائی ہے
یہ جو میرے اپنے ہیں یہ ہے ان کا اپنا ہیں
میری چٹا کے لیے آگ خود انہوں نے لگائی ہے
میری خوشی کے لیے کیا کیا نہ سہا تو نے اس دوست
تیری تصویر میں نے بھی اپنے من میں سجائی ہے
اب جدا کیسے کریں گے ہمیں یہ زمانے والے
جہاں تیرا نام آیا ہیں میں نے جیں جھکائی ہے

سحر انجم

غزل

اتنا کے زعم تو کم نہیں ہوتے
ذات کے خم ختم نہیں ہوتے
خلش اندر کہیں چلتی ہے!
بچھاوے ہیں کہ کم نہیں ہوتے
زمین کا فرض ادا نہیں کرتے
حق لیکن ختم نہیں ہوتے
اک خلاء دل اور روح کے اندر
قاصلے ہیں کہ کم نہیں ہوتے
خوشیاں بانٹتے ہیں انہوں میں
جان! تقسیم غم نہیں ہوتے
میری دھرتی کی ہے تاریخ گواہ
رہتا ہو تو کم نہیں ہوتے

حیرا علی

غزل

حاصل قلب و جان رکھے ہیں
یاد کے پاسان رکھے ہیں
اپنی دنیا کی دلیری کے لیے
جہز کے ستاربان رکھے ہیں
پاؤں رکھتا زمین پہ ہولے سے
ورد کے آسمان رکھے ہیں
ریگزاروں کی آمد و رفت
دھوپ نے بادبان رکھے ہیں
گنتا چاہو تو آ کے تم گن لو
دل میں روشن نشان رکھے ہیں
زندگی حراتوں کے لیے

روڈ انجسٹ [233] جولائی 2012ء

صالحہ محمود

سندھ

شکریہ۔ اپنا بہت خیال رکھے گا اللہ حافظ۔

انم خان ہری پور ہزارہ
السلام وعلیکم صالحہ آپ! اینڈ نورین آپ! کیسی ہیں
آپ؟ ردا کے تمام اسٹاف کو میرا سلام پلس دعا۔
صالحہ آپ! میں اس خط کے ساتھ آپ کو اپنے ناول کی
ایک اور قسط بھیج رہی ہوں باقی اقساط بھی انشاء اللہ
ساتھ ساتھ ارسال کرتی رہوں گی۔ میں کوشش کر رہی
ہوں کہ جلد ہی مکمل اقساط آپ کو بھیجوں مگر کچھ گھریلو
مصروفیات ہیں ساتھ یونیورسٹی جانا ہوتا ہے کچھ
اسائنمنٹ وغیرہ تیار کرنی ہیں، مڈ ٹرم بھی آنے والے
ہیں سو فی الحال ایک ایک کر کے قسط بھیجوں گی۔ امید
ہے آپ میری تھوڑی مصروفیت کا اندازہ کرتے
ہوئے پیج کر لیں گی۔

باقی سندھیے میں تو میں بہنوں کے تبصرے وغیرہ
پڑھتی ہوں لیکن ظاہری بات ہے سب کے خط بھی تو
شامل نہیں ہوتے، پلیز بتائیے کہ اور آل میری کہانی
کارنپالس کیسا آ رہا ہے۔

صالحہ آپ! اب جولائی میں میرے لاسٹ
سیمسٹر ہیں پلیز میرے لیے دعا کیجیے گا کہ اللہ پاک
اس مرتبہ بھی مجھے کامیاب کرے (آمین)

باقی ردا ہر لحاظ سے پرفیکٹ جا رہا ہے۔ آپ کا
شاز یہ مصطفیٰ، نامہ طارق اور سباس گل کا سلسلہ وار

کرن امیر بہادر کراچی
السلام وعلیکم صالحہ آپ! سلام کے بعد میں معافی
چاہتی ہوں کہ میں نے دسمبر کے شمارے میں لکھا کہ میں
ایک کہانی بھیجنا چاہتی ہوں مگر نہ بھیج پائی۔ وجہ کچھ
مسائل تھے مگر اب اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ دل مطمئن ہے
اور آپ! اب کے بار ایک ناول بھیج رہی ہوں پلیز! ضرور
شائع کیجیے گا اور میرا حوصلہ بڑھائیے گا اور آپ! ناول
میں کوئی غلطی ہو تو معاف کر دیجیے گا کیونکہ پہلا ناول
ہے نا اس لئے اور ردا ڈائجسٹ اور تمام رائٹرز کی میں کیا
تعریف کروں وہ تو اپنی تعریف آپ ہیں اور آپ! ردا
کے توسط سے میں تمام قارئین سے التجا کرتی ہوں کہ
پلیز آپ سب میری امی اور میرے لئے دعا کیجیے کہ
اللہ تعالیٰ ہمیں حج بیت اللہ اور روضہ مبارک کی زیارت
کرنا نصیب فرمائے جلدی (آمین) آپ! یہ میری
بہت بڑی خواہش ہے۔ آپ! آپ بھی مجھے اپنی دعاؤں
میں یاد رکھے گا (شکریہ) اور آپ! ردا کے لئے میری
خاص دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ردا ڈائجسٹ کو دن دو گنی رات
چو گنی ترقی دے (آمین) ویسے آپ! میں چاہتی ہوں کہ
آپ اپنا مکمل انٹرویو ردا میں شائع کریں تاکہ ہم جیسے
لوگ بھی آپ کے بارے میں جان سکیں اور آپ! میرا
ناول ضرور شائع کیجیے گا اور آپ! میں اپنا بھی انٹرویو بھیجنا
چاہتی ہوں اگر آپ کی اجازت ہو تو پلیز ضرور بتائیے گا

دکھا کے خواب حسین چاہتوں کے رنگ لیے۔
میری حیات کو تم وہ شراب مت دینا
لگا کے پھول سجھا کر خواہشوں کی دنیا
میری نگاہوں کو تم وہ خواب مت دینا
وہ جس کی دید نگاہوں کو شرمسار کرے
مجھے خدا کے لیے وہ شباب مت دینا
غزل کی آنکھوں میں بستی ہے اجنبی دنیا
جو اس کو خوار وہ شراب مت دینا
صلی غزل

نظم
کوئی دیوار رہنے دو
فقط اظہار رہنے دو
سفر میں ساتھ چل کر بھی
ہمیں اس پار رہنے دو
نہ آنکھوں میں ساؤ تم
نہ ہم کو خاک ہونے دو
ہمیں اشعار میں لکھو
مگر نہ غمگناؤ تم
کتابوں میں کہیں رکھ کر
ہمیں پھر بھول جاؤ تم
سنو تم سے یہ کہنا ہے
سفر میں دھول ہونے تک
کوئی بھی بھول ہونے تک
مجھے تم مانگ لینا بس
دعا مقبول ہونے تک!

صابر اصغر علی

☆☆☆

اُپر آنے آستان رکھے ہیں
حوصلے کس قدر کنول کے ہیں
پانیوں میں مکان رکھے ہیں
ایم زیڈ کنول

miss you

چھوٹا سا اک جملہ ہے
کتنا پیارا لگتا ہے
دل میں خوشیوں کے نجانے
کتنے پھول کھلاتا ہے
کچھ دنوں کی دوری کے بعد
جب دل سے چاہئے
شوقی سے
دھیرے سے
یہ کہتا ہے
آئی مس یو
تب یہ کہنے والا
کتنا پیارا
کتنا اچھا لگتا ہے

نگہت اکرم

غزل

شکستہ دل کو نئے اضطراب مت دینا
جو سہ نہ پائیں ہمیں وہ عذاب مت دینا
ہوں جن کے دل بھی سیاہ اور رنگ پھیکے ہوں
ہمیں خدا کے لیے وہ گلاب مت دینا

ناول بہت زبردست ہے اور بڑی عمدگی سے بھی آگے بڑھ رہے ہیں۔ نئی رائٹر نہیں بھی ماشاء اللہ بہتر سے بہترین لکھ رہی ہیں۔ اچھا صالحہ آپ! اب اجازت چاہوں گی اللہ آپ کو صحت دے سلامت رکھے (آمین) دعاؤں کی طالب۔

سیدہ فرزانہ حبیب فرزین ————— کراچی
بیاری جان سے عزیز قابل محترم صالحہ آپ! السلام وعلیکم! میں ردا ڈائجسٹ پچھلے دو سال سے پڑھ رہی ہوں اس میں ہر ورق سے لے کر آپ کی صحت تک ہر segment بہت خوبصورت اور perfect ہے اور ساری writers بہت محنت اور لگن سے ہمارے لئے اتنی خوبصورت کہانیاں لکھتی ہیں جن سے ہم بہت کچھ سیکھتے ہیں۔ آپ کا اپنا تہ بھر انداز تہ رائٹرز کی حوصلہ افزائی سے مجھے تاجیز کو بھی قلم اٹھانے کا حوصلہ دیا۔ امید ہے میرے اس خط کو سندیر میں ضرور شامل کریں گی۔ اپنی ایک تحریر بھیج رہی ہوں امید ہے اس کی خامیوں کو دور کر کے ”ردا“ میں ضرور شرف قبولیت بخشیں گی اور مجھے جیسی منتقل کتب کو ردا کے سائے میں جگہ دیں گی۔ اللہ آپ کو صحت و کامیابی سے نوازے آپ کے لئے پوری ردا کی ٹیم کے لئے ڈھیر ساری دعائیں اور آپ سے التجا ہے کہ کوشش کیجئے گا کہ زندگی میں وہ شخص آپ کو ہمیشہ مسکراتا ہوا ملے! آپ جسے روز آئینے میں دیکھتی ہیں! —————

نایاب حسین ————— واہ کینٹ السلام وعلیکم! امید ہے آپ خیریت سے ہوں گی۔ اس بار میں اپنی تحریر ”فیصلہ دل کا“ عید کے حوالے سے بھیج رہی ہوں۔ امید ہے عید نمبر پر ضرور جگہ ملے گی۔ شائستہ زاہد کو شادی کی بہت بہت

مبارکباد۔ آپ جلیز اگر لٹریٹ ملا کرے تو پھر صرف تحریر کی وصولی کا سندیے میں ضرور متادیا کریں۔

اس کے علاوہ یہ کہوں گی کہ اللہ پاکستان کو سلامت رکھے اور آج کل ہم جن خشکات سے گزر رہے ہیں تو اللہ تعالیٰ جلد از جلد پاکستان کو ان خشکات سے نکالے اور ہمیں ہمارے اعمال درست کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آخر میں ردا کے لئے دعا کہ ردا دن دگنی رات چوگنی ترقی کرے (آمین)

فرانہ عمر دراز ————— کراچی السلام وعلیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ! صالحہ آپ! ردا اسٹاف اینڈ کارٹین! اللہ تعالیٰ سے آپ سب اور اپنے پیارے ملک کے لیے خیر و عافیت کی دعا مانگتی ہوں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اور ہمارے ملک کو اپنے حفظ و امان میں رکھے آمین۔ ملک کے آج کل جیسے حالات چل رہے ہیں ہر کوئی پریشان ہے گھر سے نکلتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں اللہ تعالیٰ ہمارے فوجی جوانوں کو اتنی طاقت عطا فرمائے کہ وہ اپنے ملک کو امن کا گہوارہ بنا سکیں آمین۔ ردا ہر بار کی طرح اس بار بھی بہت خوبصورت لگا اس چلیلائی گرمی میں ردا کا دیدار کسی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے سے کم نہیں لگا ورنہ آج کل تو لوڈ شیڈنگ نے سب کا جینا دو بھر کر دیا ہے۔ خیر اب بات ہو جائے ردا کی تو میں سب سے پہلے بات کروں گی ”رگ جاں سے جو قریب تھے“ کی۔ اس میں مجھے رومی بہت پیاری لگتی ہے اس سے ہمدردی محسوس ہوتی ہے لگتا ہے وہ ہمارے آس پاس ہی رہتی ہے رومی کی اشمل کے ساتھ شادی ہونا اچھا نہیں لگا اگر ارسلان سے ہوتی تو اچھا تھا لیکن اگر سب ہماری سوچ کے مطابق ہونے

لگے تو کہانی آگے جانے کے بجائے جلد ہی ختم ہو جائے اشمل کا رویہ بھی رومی کے ساتھ بہت برا ہو گیا ہے جلد دیکھتے ہیں آگے کیا کیا ہوتا ہے۔

”کبھی عشق ہو تو پتہ چلے“ ناول بھی زبردست چل رہا ہے۔ حرمانے تو شیران کو سدھارنے کی ٹھان لی ہے سچ بہت حرہ آتا ہے سب کے سامنے پٹر پٹر بولنے والا شیران حرما کے سامنے چپ کا روزہ رکھتا ہے تو اب دیکھو حرما کا شیا کو ایڈیشن دلوانے کے فیصلے پر شیران کا کیا رد عمل ہوتا ہے۔ دوسری طرف حرمان اور اربہ شماء ان دونوں کے بیچ دیکھتے ہیں تیمور اپنی جگہ بنا پائے گا یا نہیں یا پھر حرمان ان دونوں کے درمیان سے ہٹ جائے گا یا تیسرا شخص یعنی روحیل سکندر اپنی بیٹی کو اس کی خوشیاں یعنی حرمان سے اس کی شادی کر دیں گے یا پھر کہانی کوئی نیا ہی موڑ لے گی چلو یہ تو نیکسٹ منٹ پتہ چل ہی جائے گا۔

”اعتبار عشق“ واقعی اسے ہی سچی محبت کہتے ہیں کہ ایک کو تکلیف ہو تو دوسرے کو دور رہتے ہوئے بھی پتہ چل جاتا ہے جیسے عینی کو پتہ چل گیا۔ واقعی آج کل عینی اور نفیس جیسے کردار ملنا مشکل ہیں۔ اب تو کنول بھی ٹھیک ہو رہی ہیں بس سب اس جی اب تو عینی کو واپس لے آئیے اس کے بغیر حرہ نہیں آ رہا۔

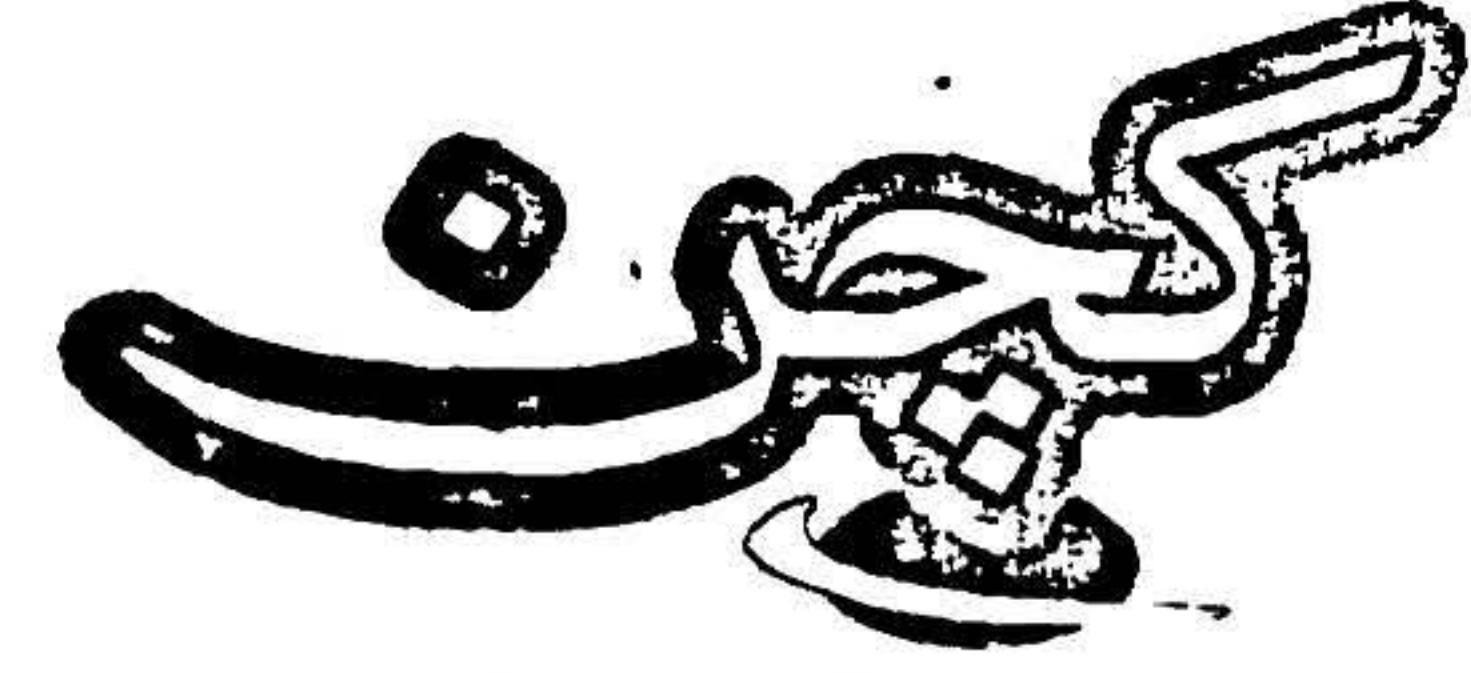
”سائنس“ سڑک اور سکوت“ واہ جی شیث تو لگتا ہے سدھارنے والا نہیں ہر وقت طنز کرنا اس کی عادت بن چکی ہے پر لگتا ہے عاشق کی دوبارہ استری اور سارہ کا اس کے ساتھ ہونا اسے برداشت نہیں ہو رہا ہے۔ سدھارہ کا سارہ کے ساتھ جو رویہ ہوا اور اس پر شیث کا رد عمل اس سے لگتا ہے دونوں کے ملن میں اب دیر نہیں لگے گی۔ زہنب اور عاطف کی بھی انشاء اللہ اگلی قسط

میں شادی کی ہے۔ کیوں نائلہ جی کیا میں صحیح بول رہی ہوں یا نہیں! ”اس دل میں بے ہوش“ بھی ٹھیک چل رہا ہے معاف کیجئے گا انم جی پر کچھ ماہ سے حرہ نہیں آ رہا دیکھ ہی دیکھ نظر آ رہا ہے ہر کوئی پریشان ہے بس آپ جلدی سے اس میں کوئی انجوائے منٹ مذاق شامل کیجئے تاکہ پہلے کی طرح حرہ آ سکے۔

اس کے علاوہ مکمل ناول ناولٹ اور افسانے سب ہر بار کی طرح پرفیکٹ تھے سب اچھا لکھ رہی ہیں اس لیے ایک کی تعریف کرنا زیادتی ہوگی۔ اس کے علاوہ مستقل سلسلے ہمیشہ کی طرح اس بار بھی بیٹ آف دی بیٹ تھے۔ اب اجازت چاہوں گی۔ میری دعا ہے کہ ردا یونٹی اپنی کامیابیوں کا سفر جاری رکھے آمین۔

وابجہ خان ————— کراچی بیاری صالحہ آپ! السلام وعلیکم! امید ہے کہ آپ بالکل خیریت سے ہوں گی ردا ڈائجسٹ میرا فیورٹ رسالہ ہے اور میں 6th کلاس سے ردا کا مطالعہ کرتی آ رہی ہوں۔ ”تم جول گئے ہم کو“ میری پہلی تحریر تھی بنانے کہاں سے مجھے بھی لکھنے کا شوق ہو گیا اور میں نے بھی قلم اٹھانے کی جسارت کر لی اور آپ کا بھی بہت شکریہ کہ آپ نے میری تحریر کو اپنے ڈائجسٹ میں جگہ دی اس کے علاوہ شازیہ مصطفیٰ اور نائلہ طارق کے سلسلے وار ناول میرے فیورٹ ناولز ہیں اور شازیہ مصطفیٰ کے بھی سلسلے وار ناولز میرے فیورٹ ہیں۔ اس کے علاوہ ردا کے بھی مستقل سلسلے زبردست ہیں۔ اب اجازت چاہوں گی دعاؤں میں یاد رکھئے گا۔

ثریا اقبال



ویجی ٹیبل ود چیز

اجزاء۔	1/2 کلو
آلو	2 کھانے کے چمچ
املی کا گودا	ایک کپ (کیوب کاٹ لیں)
شملہ مرچ	ایک کپ (کیوب کاٹ لیں)
بند گوبھی	ایک کپ (کیوب کاٹ لیں)
ٹماٹر	ایک کپ (کیوب کاٹ لیں)
گاجر	ایک کپ (کیوب کاٹ لیں)
بے بی کارن	ایک کپ (چھوٹے ٹکڑے کر لیں)
کالچ چیز	ایک کپ
ثابت زیرہ	ایک چائے کا چمچ
تیز پات	2, 3 عدد
دہی	4 کھانے کے چمچ
ادرک لہسن کا پیسٹ	ایک کھانے کا چمچ
میٹھی دانہ	ایک چائے کا چمچ
کلوچی	ایک چائے کا چمچ
ہلدی	1/2 چائے کا چمچ
لال مرچ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب۔ تیل گرم کریں، پھر اس میں زیرہ، کلوچی، ثابت زیرہ، میٹھی دانہ اور تیز پات ڈال کر

اجزاء۔

کڑکڑائیں اس کے بعد ادرک لہسن ڈال کر فرائی کریں۔ اب ویجی ٹیبل اور دہی شامل کریں پھر نمک، لال مرچ پاؤڈر اور ہلدی ڈال کر اچھی طرح مکس کریں، دھیمی آنچ پر پکائیں۔ اس کے بعد املی کا گودا شامل کریں اچھی طرح بھون لیں، اب کالچ چیز شامل کر کے اچھی طرح مکس کریں، گرم گرم پیش کریں۔

فرائیڈش

اجزاء۔	ایک کلو
فش فلیٹ	1/2 کپ
میدہ	1/4 چائے کا چمچ
پیپر کا پاؤڈر	حسب ذائقہ
کالی مرچ	حسب ضرورت
تیل	حسب ذائقہ
نمک	حسب ذائقہ

ترکیب۔ میدہ میں نمک، کالی مرچ اور پیپر کا ڈال کر پانی کی مدد سے مناسب گاڑھا پیسٹ بنالیں، تیل گرم کریں اور فش کے قتلوں کو میدہ کے مکسچر میں ڈپ کر کے فرائی کریں۔

چکن کڑاہی

اجزاء۔

چکن	1/2 کلو
ٹماٹر	3 سے 4 عدد (چوڑے)
پیاز	ایک عدد (چوڑے)
ہری مرچیں	4 عدد
کٹی کالی مرچ	1/4 چائے کا چمچ
ادرک پیسٹ	1/2 چائے کا چمچ
لہسن پیسٹ	ایک چائے کا چمچ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب۔ ٹماٹر کا چھلکا اتار لیں، ایک کڑاہی میں چکن ادرک لہسن اور نمک ڈال کر ڈھک دیں اور ہلکی آنچ پر اس وقت تک پکائیں جب تک کہ چکن کا پانی خشک ہو جائے اور چکن آدھی گل جائے، اب اس میں تیل، ٹماٹر، ہری مرچیں اور پیاز شامل کر کے دوبارہ ڈھکن ڈھک کر ہلکی آنچ پر پکائیں، جب چکن گل جائے تو بھون کر کالی مرچ ڈال کر سرو کریں، ابلے ہوئے چاولوں کے ساتھ سرو کریں۔

دال دہی

اجزاء۔	دال (ارہر)
دہی	ایک کپ
لیموں	ایک کپ
ادرک لہسن پیسٹ	ایک عدد
ہرا دھنیا	1/2 گڈی
ہری مرچ	3 عدد

ثابت زیرہ	1/2 چائے کا چمچ
ہلدی	(بھون کر پیس لیں)
بگھارنے کے لئے۔	1/2 چائے کا چمچ
ثابت زیرہ	ایک چائے کا چمچ
پیاز	ایک عدد (چھوٹی)
لہسن	3 جوے
ہری مرچ	2 عدد
ثابت لال مرچ	5, 6 عدد
تیل، گھی	حسب ضرورت
نمک	حسب ذائقہ

ترکیب۔ دال کو دھو کر دو گھنٹے بھگو دیں، پھر دو کپ پانی ڈال کر پکنے کے لئے رکھ دیں، ابال آنے پر آنچ ہلکی کر دیں اور ایک چمچ تیل بھی ڈال دیں جب دال تقریباً گل جائے اور پانی قدرے خشک ہو تو اتار کر ٹھنڈا کر لیں۔ بلینڈر میں دہی، دال، ہرا دھنیا، ہری مرچ، ادرک، لہسن، سفید زیرہ (پسا ہوا)، ہلدی اور ایک لیموں کا رس شامل کر لیں اور بلینڈ کر لیں، پھر آدھا کپ پانی ڈال کر پکنے دیں دال ہلکی گاڑھی ہو جائے تو اتار لیں۔ گھی گرم کریں اور بگھار کی تمام اشیاء ڈال کر لائٹ براؤن کر لیں اور دال بگھار لیں، ہرا دھنیا سے گارنش کریں اور بگھارے ہوئے چاول، اچار اور پاؤڈر کے ساتھ سرو کریں۔

جیا کلیٹ موس

اجزاء۔	ڈارک چاکلیٹ
125 گرام (چوپ کر لیں)	

شہلا مشائق



دھولیں۔

☆ بالائی میں چند قطرے لیموں کا رس ملا کر چہرے پر لگائیں ہر روز گاجر کا جوس پیئیں۔
☆ خوراک میں پھلوں کا استعمال زیادہ کرنے سے بھی انسان کے چہرے پر رونق آ جاتی ہے۔
☆ پانی زیادہ پینے سے بھی چہرہ شاداب رہتا ہے۔
☆ بسن میں دودھ یا بالائی ملا کر اسے آہستہ آہستہ کچھ دیر چہرے پر رگڑیں چند منٹ بعد منہ دھولیں صابن کا استعمال نہ کریں چہرہ ملائم اور خوبصورت ہو جائے گا۔

☆ لیموں کا رس آدھی چھٹانک سفید گلسر لین ایک چھٹانک گلاب کا عرق آدھا چھٹانک ہائیڈروجن پر آکسائیڈ اور بورک پاؤڈر آدھا آدھا ماشہ ان سب اشیاء کو یک جان کر کے کسی صاف شیشی میں محفوظ کر لیں اور رات کو سوتے وقت منہ دھو کر خشک کر کے چہرے پر لگائیں اور صبح منہ دھولیں یہ رنگت نکھرنے کے علاوہ منہ کی خشکی بھی دور کر دے گا۔

☆ انڈے کی سفیدی ایک چمچ لیموں کا رس ایک چمچ بادام روغن چند قطرے ان سب کو خوب اچھی طرح ملا لیں اور اسے چہرے پر ملیں خشک ہونے پر نیم گرم پانی سے منہ دھولیں رات کو منقی کے چند دانے لیموں کے رس میں بھگو دیں اور صبح نہار

رنگت نکھاریے

☆ نمک ملے پانی سے منہ دھونے سے رنگ نکھر آتا ہے۔ بادام کی گریاں بغیر چھلے کسی مٹی کے کھردرے برتن پر رگڑیں اور ان میں تھوڑی سی بالائی ملا کر چہرے پر ملیں ایک گھنٹہ بعد کسی اچھے صابن سے منہ دھولیں بادام روغن کو پانی میں پھینٹ کر چہرے پر لپک کرنے سے رنگ نکھرتا ہے۔

☆ زیتون کے خالص تیل میں چند قطرے لیموں کا رس ملا کر چہرے پر مساج کریں۔ شہد نیم گرم پانی میں ملا کر روزانہ پیئیں۔

☆ انڈے کی سفیدی میں چنے کی دال باریک پیس کر کریم بنالیں اور چہرے پر ملیں دس منٹ بعد چہرہ دھولیں۔

☆ شکر کے شربت میں لیموں کا رس نچوڑ کر پینے سے رنگ نکھرتا ہے۔

☆ رات کو سونے سے پہلے دودھ میں زیتون کا تیل ڈال کر پینے سے رنگ نکھرتا ہے۔

☆ لیموں کے عرق میں ملانی مٹی پیس کر چہرے پر لپک کریں۔

☆ گلسر لین میں آدھا لیموں کا رس نچوڑ کر چہرے پر ملیں آدھے گھنٹے بعد بسن سے منہ

مکچر کو ملا کر اچھی طرح کس کریں اب ایک ایئر ٹائٹ بکس میں ڈال کر فریزر میں رکھ دیں کرٹل بننے لگیں تو ایک بار پھر پھینٹ لیں اور دوبارہ جتنے رکھ دیں۔ ویفرز بادام اور پستے کے ساتھ پیش کریں۔

آلو کا حلوہ

اجزاء۔
آلو 1/2 کلو
دودھ 1/2 کلو
دودھ 1/4 کپ
چینی حسب ذائقہ
سبز الائچی 4 عدد
زعفران ایک چٹکی
عرق گلاب ایک کھانے کا چمچ

بادام پستہ، چاندی کے ورق حسب پسند
تیل گھی حسب ضرورت
ترکیب۔ آلوؤں کو بال کر چھیل لیں اور ہاتھ سے اچھی طرح مسل لیں زعفران کو عرق گلاب میں بھگو دیں ایک برتن میں گھی گرم کریں اور الائچی ڈال کر کڑکڑائیں۔ اب آلو کا بھرتہ اور دودھ اور چینی ڈال کر اچھی طرح بھونیں رنگت سنہری ہونے لگے دودھ خشک ہو جائے اور تیل علیحدہ ہو جائے تو زعفران ڈال کر اچھی طرح کس کریں اب ڈش میں نکال کر پستہ بادام چھڑکیں اور چاندی کے ورق سے گارنش کریں۔

☆☆☆☆☆

☆☆☆

فریش کریم
چینی
انڈے
ایک کپ
2 کھانے کے چمچ
4 عدد

(زردی اور سفیدی علیحدہ کر لیں)
ترکیب۔ سب سے پہلے چاکلیٹ کو ڈبل بواکر میں پگھلا لیں پھر انڈے کی زردیاں شامل کر کے اچھی طرح پھینٹ لیں۔ کریم کو پھینٹ کر اس میں چینی اور چاکلیٹ مکچر شامل کر لیں انڈے کی سفیدیاں علیحدہ خوب پھینٹ کر آمیزے میں شامل کر کے اچھی طرح کس کریں فریزر میں رکھ کر جمالیں اور فریش کریم کے ساتھ پیش کریں۔

اسٹرابیری آئس کریم

اجزاء۔
ایک ٹن (وزن 16 اونس)
پاؤڈر ملک 2 کپ (پانی میں گھول کر
گازہا پیٹ بنالیں)
اسٹرابیری سسین 1/2 چائے کا چمچ
چینی 3 کھانے کے چمچ
یا حسب ذائقہ

کنڈسڈ ملک 1/2 کپ
فریش کریم ایک کپ
ترکیب۔ سب سے پہلے کنڈسڈ ملک فریش کریم دودھ اور چینی کو ملا کر اچھی طرح پھینٹ لیں پھر آدھے گھنٹے کے لئے فریج میں رکھ دیں اسٹرابیری اور اسٹرابیری سسین کو بلنڈر میں ڈال کر عمدہ پیسٹ بنالیں اب اسٹرابیری اور دودھ کے

منہ کھالیں۔ انار کا جوس رنگ نکھارتا ہے۔
 ☆ چہرے پر لگائیں اور صبح منہ دھولیں۔
 ☆ پیتے کا چھلکا جلد پر رگڑ کر لگانے سے جلد کا
 رنگ نکھر جاتا ہے اور چمک پیدا ہو جاتی ہے۔
 ☆ دودھ پینے سے جلد ملائم اور سفید
 ہوتی ہے۔
 ☆ پالک جلد کی رنگت نکھارتی ہے اس کے
 علاوہ گرم پانی جسم کی رنگت قائم رکھنے میں ایک
 زبردست معاون ہے۔
 ☆ آم رنگ نکھارتا ہے اور بدن کو فربہ
 کرتا ہے۔

☆ دو بڑے چمچے دودھ میں ایک چھوٹا چمچ نمک
 ڈال کر حل کریں اور رات کو سوتے وقت روئی کی مدد
 سے چہرے پر لگائیں۔ صبح اٹھ کر منہ دھولیں۔
 ☆ لیموں کا ایک ٹکڑا دودھ میں بھگو دیں ایک
 گھنٹہ بعد اسے چھان لیں اور چہرے پر لگائیں
 شہتوت کے درخت کے پتے سے کچھ کانٹے لے کر
 دودھ کے ساتھ پتھر پر گھس لیں اس کا لیپ روزانہ
 رات کے وقت چہرے پر لگائیں۔
 ☆ رات کو سونے سے پہلے دودھ روئی کی مدد
 سے چہرے پر لگائیں پانچ منٹ تک دودھ میں
 روئی بھگو بھگو کر چہرہ صاف کریں پھر پندرہ منٹ
 تک اسے یونہی رہنے دیں۔ پندرہ منٹ بعد تازہ
 پانی میں ایک چمچ دودھ ڈال کر چہرہ دھولیں اس سے
 جلد سفید اور ملائم ہو جائے گی۔ روزانہ ایک ٹماٹر کا
 گودا اور انڈے کی سفیدی دونوں اچھی طرح مکس کر
 کے چہرے پر لیپ کریں پندرہ منٹ بعد تازہ پانی
 سے چہرہ دھولیں۔

☆ زیتون کا تیل، بادام روغن، گلسر لین ٹینوں کو
 ہم وزن لے کر رات کو سوتے وقت روزانہ چہرے
 پر مالش کریں اور صبح منہ صابن سے دھولیں۔
 ☆ کھیرے کا رس نکال کر چہرے پر لگا کر اسے
 سوکھنے دیں باقاعدگی سے ایسا کرنے سے چہرے
 کی جلد صاف ہو جاتی ہے۔
 ☆ روغن بادام میں شہد ملا کر چہرے پر لگانے
 سے خشک اور بے رونق جلد تروتازہ ہو جاتی ہے اس
 محلول کو چہرے پر لگا کر 20 منٹ کے بعد چہرہ
 دھولیں۔
 ☆ پسلی ماش کی دال میں تھوڑا سا بادام روغن یا
 زیتون کا تیل اور پانی ملا کر چہرے پر ملنے سے چہرہ
 نکھر آتا ہے۔

☆ آدھا پاؤ دودھ میں دو عدد لیموں کا رس نجوڑ
 لیں جب دودھ اچھی طرح پھٹ جائے تو اس کو
 چھان کر پانی علیحدہ نکال کر ایک بوتل میں ڈالیں
 اس پانی کی مقدار کے برابر اس میں عرق گلاب
 شامل کر لیں اس لوشن کو رات سونے سے پہلے
 ☆ کچا دودھ لے کر اس میں تھوڑا سا بٹیس
 اور ایک چٹکی بلدی شامل کر لیں یہ لیپ پندرہ
 منٹ صبح اور پندرہ منٹ کے لئے شام کو چہرے پر
 لگائیں۔
 ☆☆☆☆☆